

ماہنامہ
دکھن

فروری 2019

<https://www.urdutubes.com/>



دکھن
کتاب

اندرونی صفحات پر
ماہانہ فرمائیں

محمد
نعت

صبح جانی 9
راج کاشت جھجھوہ 9



- گل رعنا کے ملاقات 10 شاپین زبیر
میری بھی سنتے 14 کنوہ پاشمی
آواز کی دنیا 18 ہدایت سائر
مقابلہ ہے آئینہ 22 صفیہ ناز



- ہوائیں رخ بدل گئیں 24 نگہت عبداللہ
شبِ نیم کی سحر 106 پنج چوہدری

ذرا سا لٹریچر کی گنجشکی
پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com



- ساگر کی رے 66 ام طیف قور
عشق آتش 136 نذر حسین



- شاگرد گیارہ 106 ایلک رضا
آبا کی صفیہ گل 46 منشا محسن علی



- جہاں آدراں ہم 231 فرحت جبین
کینڈل لائٹ ڈرٹ 221 لیجانہ اعجاز
غریب ایڈمن 191 سیانہ نام
کہانی گھر کی 95 حنا اصغر
محبت ایک کوئی ہے 215 ماوراء طالع
روشن راستے منزل کے 63 مریم شہزاد
پارکس 225 فرح انیس
آدھوری کہانی
دل کی خاطر

<https://www.urdutubes.com/>



- ادارہ 3
ادارہ 6
ادارہ 8
ادارہ 10
اقراء ممتاز 11
خالہ جیلانی 13
اشکافہ سلیمان 17
روسیہ تریف 16
ادارہ 18

بیوٹی بکس
فیشن اور اسٹائل
اس ماہ کا چھل
صحت
کچن اور آپ
کرن کا دسترخوان
بچے کی سیر
مُسکراتی کہیں
کچھ مونی چنے ہیں



وٹس ایپ نمبر
تنویر
URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com
URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

- 234 کرن کرن جوسو
237 یادوں کے دریچے سے بشری محمود
239 ناع میکر نام مدیرہ کرن

فروری 2019
جلد 41 نمبر 11
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ ۲۰۱۹ء
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین، واچسٹ اور ادارہ خواتین واچسٹ کے تحت شائع ہونے والے مہینہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی تقابیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں آئے دن ایسے واقعات دیکھتے رہتے ہیں جن پر ہماری بے بسی کے منظر پیش نظر ہوتے ہیں۔ دن و رات ہمارے ہر لمحہ وہ دھن کے سروخاؤں میں بکے جاتے ہیں۔ تازہ واقعات ایک گھر بکھریلو ملازم کی تشدد کے باعث موت سے پہلے اس پر ضرور غور کیا کر رہے ہیں اداہل اقتدار سب معمول طے دے رہے۔ آخر میں ہونا کیا ہے۔ عرب لوگ دعویت کر رہے ہیں، ہوجاؤں گے یا انہیں کچھ دے دلا کر ناموش کر دیا جائے گا۔ کسی تہذیب و تمدن کا توڑنا ہندوؤں کے ادھی بہت سے طریقے ہیں۔ ایک ذلے کی اتنی بڑی سزا، تشدد کر کے جان ہی لے لی گئی۔ عورت بہت نرم دل ہوتی ہے۔ جس کی ذرا سی باتیں ہمیشہ مائیں ہیں کہ ایک کڑور، بے بس بچی بڑھلے انہیں دم بھی نہیں آیا۔ ایک لمحے کے لیے غصہ نہ اٹھایا۔ اپنی اولادوں کا خیال میں دنیا کا کوئی ان کے ساتھ ایسا کرے گا تو کیا ہوگا۔ انہیں انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔ انہیں کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ اس سے پہلے ایک پیشہ کی ایبہ لے ایک بچی کی جان لے لی تھی۔ لیکن اس ظالم عورت کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔ جب تک ان ظالموں کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی یہ سلسلہ اس طرح چلتا رہے گا۔ یہ بچیوں پر غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں دو وقت کی دھنی مینا کرنا محال ہے۔ والدین صرف بیٹے پر ہمدردی کے لیے انہیں ان گھروں میں بھجوا دیتے ہیں۔ جہاں دو وقت کی دھنی کے عوض یہ ظالم سہاگتے ہیں۔ ایک تجویز ان بچوں کی رہنمائی کی ہے۔ یہ خامسا مشکل کام ہے لیکن ناممکن نہیں ہے حکومت وقت اگر ترقی یافتہ تھیں تو ان بچوں کے لیے زندگی آسان ہو سکتی ہے۔ انہیں وہیں کہ اس فلم کا خاکہ تحریر کر دیا گیا ہے۔ اپنے اندر وہ نہیں ادا کیا کوئی واقعہ دیکھیں تو اس کے لیے ادا کاغذیں۔ یہ ہمارا دینی اخلاقی فریضہ ہے۔

ساراگرہ نمبر،

مارچ کا شمارہ ساراگرہ نمبر ہوگا۔ ساراگرہ کی نمائندگی سے فارسی سے مروی بھی اس شمارے میں شامل اخراجات ہوگا۔ مروی کے سوالات یہ ہیں۔
 ① آپ اپنی ساراگرہ کا دل کے گھر پر کیا لکھتے ہیں؟
 ② ساراگرہ پر کوئی قضا ہے جو اچانک ہوتی ہو؟
 ③ ساراگرہ کی رو میں کیا یاد ہے؟
 ④ کوئی ایسی چیز ہے جس کی ساراگرہ دل کے گھر پر یاد آتی ہے؟
 ⑤ ساراگرہ میں کون کون سے شاعر ہوتے ہیں؟
 ⑥ ساراگرہ کے سلسلہ کار کا کتاب "میں کوئی ایسا موضوع جو آپ پڑھنا چاہتی ہوں؟"

اس شمارے میں،

① اداکارہ مکمل دھن سے شاہین رشیدی کی ملاقات ، اداکارہ کنزہ باغی "کہتی ہیں میری جی سیتھ" ،
 ② آواز کی ڈیوٹے محمد ہدایت ساراگرہ اس ماہ ماہان ہیں ، اس ماہ "صغیرہ تازہ کے مقابل ہے کاغذ" ،
 ③ "پولش ڈرل بل گیس" شجاعت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول ، "نما چھ ہری کا سلسلہ وار ناول" "طیغ نامی" ،
 ④ "مارگرٹا سے" امینہ کا مکمل ناول ، "نما حسین کا مکمل ناول" "عشق نامی" ،
 ⑤ "شام رنگ سیاہ" اکیل رضا کا ناول ، "منشا محسن علی کا ناول" "اباکی صغیرہ کل" ،
 ⑥ سیاحت مامم، طیبہ عارفہ، دانیہ آفرین، دیکھا اجماز، ماوراء طہ، مریم شہزاد، حنا اصغر فرخانی اور
 فخرت جبین کے افسانے اور مستقل سلسلے ،
 کون کتاب ،
 مزے دار لیسر اور چمپ مغالین کے ساتھ۔

حسرت باری تعالیٰ

کر رہے ہیں تیسری شتا خوانی

<https://www.urdu tubes.com/>

تو ہے آئینہ ازل یا رب

اور میں ہوں ابد کی حیرانی

تیرے جلوؤں کے دم سے یوں نہلا

تیرے سورج کی سب درخشا

گو چاہے شتا کے نغموں سے

گنبد خیاں ہے میسر نورانی

پیار ہوتی نہیں مرے مولا

درد کی سرمدیں ہیں طولانی

تجھ سے بخشش کا ہے تمنائی

تیرا بندہ صبیح رحمانی

صبح رحمانی

رسول مقبولؐ

مانتے ہیں جو عظمت رسولؐ

رکھتے ہیں وہ اُلت رسولؐ

نہیں کوئی عاصی جہاں میں

نہ ہو جسے حاجت رسولؐ

جسے چاہیں وہ بٹلا لیں!

مل جلے اسے جنت رسولؐ

رب کائنات کی چاہت محمدؐ

جانو تو سہی ندرت رسولؐ

جنم جو قیامت تک اسی طرح

ہوتی رہے گی مدحت رسولؐ

راجہ کاشف جنم جو

گل رخسار سے مہلاقات شائین رشید



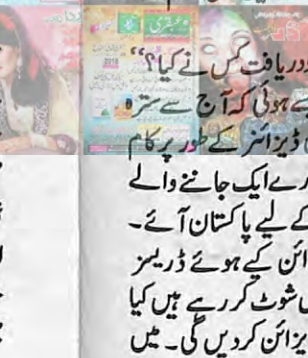
نے کہا کہ کیوں نہیں، انہوں نے کہا کہ تقریباً سو ڈرامے ہمیں چاہئیں۔ اتنا بڑا آرڈر انکار کیسے کر سکتی تھی۔ اس زمانے میں نئے نئے موبائل فون آئے تھے جو سائز میں کافی بڑے تھے تو اس کا کمرشل شوٹ کرنا تھا تو اس کے لیے میں نے کپڑے بنائے تقریباً سو ڈراموں کے قریب..... تو اس طرح میں شوہز میں ”ایئر“ ہوئی..... پھر مزید آفرز آئیں تو میں نے شوہز کے لیے ”ڈراموں“ شروع کیا، مختلف کمرشلز اور پروگراموں کے لیے.....

<https://www.urdu tubes.com/>

پھر اسی طرح آگے بڑھتے بڑھتے میں پروڈکشن میں آگئی اور کافی عرصے میں نے پروڈکشن میں کام کیا اور میں ایک شوکر رہی تھی ”سیر کرار“ کے نام سے تو مجھے ”آج“ ٹی وی سے جاب کی آفر آگئی تو میں واسطی نے مجھے کہا کہ آپ ڈرامہ سائیڈ پر آجائیں..... تو میں نے یہ حیثیت پروڈیوسر کے کافی عرصہ ڈرامے کیے..... ایک دن ہم ڈرامے کی ریسرچ کر رہے تھے تو کچھ آرٹسٹ نہیں آئے تھے اور میں ان کا اسکرپٹ پڑھ رہی تھی..... تو وہاں ہمارے مصروف رائلٹی امرتجی موجود تھے، جب ریسرچ ختم ہوئی تو کچھ امرتجی صاحب نے کہا کہ تم ایکٹنگ کیوں نہیں سکتی ہو..... تو میں نے کہا کہ ارے نہیں..... میں کہاں اور اداکاری کہاں اور میں اپنے دیگر کاموں میں مصروف رہی.....

☆ ”پھر.....؟“

☆ ”پھر یہ کہ تقریباً دو سال یہ بات چلتی رہی کہ آپ اداکاری کی سائیڈ پر بھی آجائیں اور میں دو سال ٹال مٹول کرتی رہی..... پھر سوچا کہ اتنا کہہ رہے ہیں تو کچھ کر رہی لوں..... تو ایک ڈرامہ شوٹ ہو رہا تھا ”شائستہ شائستہ“ اور وہ ٹی وی ون سے آن ایئر آنا تھا..... میں نے سوچا کہ سب اتنا اصرار کر رہے ہیں تو اداکاری میں بھی قسمت آزمائی ہوگی..... پھر یہ بھی خیال تھا کہ پتا نہیں لوگ دیکھتے بھی ہیں یا نہیں..... میں نے اداکاری کی شروعات کر دی.....



”ماں“ کا رول کرنے والی بہت سی فنکارائیں صرف روایتی ماں کا ہی رول کرتی ہیں، مگر کچھ ہی فنکارائیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف روایتی ماں کا رول نہیں کرتیں بلکہ ہر طرح کی ماں کا رول اور ہر طرح کے دیگر رول کرتی ہیں۔ انہی میں ہماری اور آپ کی پسندیدہ ترین فنکارہ ”گل رعنا“ ہیں۔ ان کے ہر رول میں بہت ورائٹی ہوتی ہے۔ مزاحیہ، سنجیدہ اور ٹگٹیو، ہر رول میں نئی طرح فٹ ہوتی ہیں۔ اور یہ آج ہماری مہمان ہیں۔

☆ ”کیسی ہیں آپ؟“

☆ ”اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنائیں کیسی ہیں؟ کب ملاقات کر رہی ہیں۔“

☆ ”ان شاء اللہ، جلدی بہت پیاری پرفارمر ہیں آپ ہر کردار میں ڈھل جاتی ہیں۔ مین ہوں آپ کی؟“

☆ ”بہت شکریہ..... آپ سب کی محبت ہی تو

☆ ”ہوں بھر کیا رزلٹ آیا؟“

☆ ”اس ڈرامے کی پروڈکشن بھی میں ہی کر رہی تھی اور ایکٹنگ بھی میں ہی کر رہی تھی اور میں نے سب سے کہہ بھی دیا تھا کہ مجھے اداکاری نہیں آتی۔ مجھ سے کچھ توقع مت رکھیے گا..... تو مجھے کہا گیا کہ جیسا آپ بولتی ہیں بس ویسا ہی بول دیں..... اس ڈرامے میں اداکاری کرنے کے بعد سوچ لیا تھا کہ اب کوئی نہیں کہے گا کہ اداکاری کرو..... مگر جو خدا چاہتا ہے اس کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا..... رزلٹ تو بالکل توقع کے برعکس آیا..... ایک ڈرامے کے بعد تو چل سوچل..... آفرز ہی آفرز..... اور آج دیکھیں تو کچھ اور کاموں کے لیے ٹائم ہی نہیں..... اتنی مصروفیات ہو گئی ہیں ڈراموں میں۔“

☆ ”اللہ جب مہربان ہونے پہ آتا ہے تو وہ ذرائع پیدا کر دیتا ہے جس کے بارے میں کوئی سوچتا بھی نہیں ہے؟“

☆ ”بالکل صحیح کہہ رہی ہیں اور لوگ پوچھتے ہیں

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

فروری
2019

کے شمارے کی
ایک جھلک

سلطان محمد فاتح

ملت اسلامیہ کے لازوال کردار "سلطان محمد فاتح" کے
کارہائے نمایاں کی سبق آموز داستان
محترمہ شاہدہ لطیف کی سلسلہ وار کہانی
تاریخ کے جہرہ کے،

خونی ہاتھ

سیاست ایک جھگ کے دستور کا نام ہے جس میں ہر چیز
بہ وقت ضرورت جازز ہوتی ہے
ایم الیاس کی سیاسی داؤد کی منہ بولی تصویر،

حرمانۃ الفت

انسان جو بوتا ہے اسے ویسی ہی فصل کاٹنی پڑتی ہے
جاوید رابی کا صحت آموز اعجاز،

تقدیر کا ستم

دام میں پھانسنے والوں کی بے دم سازشوں کا قصہ
سلمان راحت کا دلکش اعجاز بیان،

ضمیر کی جنگ

ایک عورت کی سنگ دلی اور خود غرضی کا دلخراش واقعہ
سیدہ عطیہ زاہرہ کے قلم سے،

اس کے علاوہ دیس دیس کی رومینس، سہنس اور تجسس سے
بھرپور 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

فروری 2019 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

ملی..... مگر کام کرتی رہوں گی، کوشش کرتی رہوں گی تو
اللہ کا میاں بھی دے گا۔"

☆ "بی بی بی بی..... مگر آپ کی پارٹی نے کچھ
نہیں کیا کراچی کے لیے؟"

☆ "ارے ایسا تو نہیں کہیں..... کم سے کم
آپ تو انصاف کی باتیں کر اب دیکھیں کہ کراچی کے
حالات اب کس قدر بہتر ہیں۔ دہشت گردی کا تقریباً
خاتمہ ہو چکا ہے (علی رضا عابدی کے قتل سے پہلے یہ
اگر دیکھا جاتا تو ہرگز ممکن نہ تھا) کی رویتیں واپس
آ چکی ہیں"

☆ "حالات اچھے ہیں مگر بہت اچھے نہیں
ہیں؟"

☆ "میں بھی یہ نہیں کہہ رہی کہ "بہت ہی اچھے
حالات" ہو گئے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ حالات بہتری
کی طرف ہیں "تو پوزیٹو سوچے تو پوزیٹو ہی ہوگا۔"

☆ "چلیں جی..... اللہ تعالیٰ ہمارے ملک
کو بہت ترقی دے اور امن و سکون کا گوارہ بنائے۔
یہ ملک ہے تو ہم ہیں آپ کی مصروفیات کی وجہ سے
زیادہ بات نہ ہو سکی، ان شاء اللہ پھر بات کریں

☆ "ان شاء اللہ ضرور..... اور روبرو بات ہو
گی..... اور ایک بات میں اور بھی کہنا چاہوں گی کہ
پاکستان سے محبت کا یہ عالم ہے کہ میں سینما میں فلم
دیکھنے جاتی ہوں اور جب ہمارا قومی ترانہ چلتا ہے تو
میں غرطہ جذبات سے آج بھی رو رہی ہوتی ہوں.....

پاکستان نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ نام دیا ہے؟
عزت دی ہے، شہرت دی ہے، ہماری محنت کا صلہ اللہ
کے بعد پاکستان نے دیا ہے اب وقت ہے کہ ہم
اپنے ملک کے لیے کچھ کر سکیں۔ اور مجھے یہ شعر بہت
پسند ہے کہ....."

میرے محبوب وطن تجھ پہ اگر جان ہو نثار
میں یہ سمجھوں گا کہ ٹھکانے لگا سرمایہ تن
"مگد....."

☆ ☆

☆ ☆

☆ ☆

☆ ☆

نے ہر طرح کے رول کیے..... اس کے بارے میں
بھی بتائیے؟"

☆ "شکر ہے کہ ہمارا ڈرامہ ہیرو، ہیروئن سے
نکل کر معاشرے کی کہانیوں پر آ گیا ہے اور ڈائریکٹرز
کی بڑی نظر ہوتی ہے..... اور جہاں تک رول کی بات
ہے تو ماں ہوں تو ماں کے ہی رول زیادہ ملے جبکہ
میں نے پوزیٹو اور گھٹو دونوں رول کیے ہیں مگر ہر
طرح کے رول کیے ہیں..... جبکہ میں دیکھی ہوں کہ
یہاں جو جس رول میں پاپولر ہوتا ہے اسے اسی میں زیادہ
بک کیا جاتا ہے اور یہ ہمارے یہاں کا بہت بڑا ڈراما بیک
ہے..... لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس طرح کی کوئی
شکایت نہیں ہے۔ مجھے ہر طرح کا رول ملا ہے۔"

☆ "گھٹو، پوزیٹو ماں دونوں طرح کے کردار
کیے آپ نے کامیڈی رول کیسے لگائے؟ میں؟"

☆ "سچ بتاؤں تو مجھے کامیڈی رول کرنے میں
بہت حزا آتا ہے۔ یہ نسبت گھٹو، پوزیٹو اور ہیروئن
کرداروں کے..... کیونکہ کامیڈی رول سب سے
مختلف ہوتے ہیں۔"

☆ "ذاتی طور پر آپ کی کیا خواہش ہوتی ہے کہ
کس طرح کے رول زیادہ کریں؟"

☆ "مجھے بھی ذاتی طور پر خواہش نہیں ہوتی
کہ یہ رول ہو یا وہ رول ہو۔ بس یہ ضرور دل چاہتا ہے
کہ جو بھی رول ہو اس میں کچھ ایکننگ کا مارجن
ہو..... سیدھا سیدھا رول کرنے کو اب دل نہیں
چاہتا۔ شروع شروع میں نہ شوق تھا نہ جنون تھا۔ بس
ایک کام سمجھ کر کیا۔ مگر اب مشکل رول کرنے کو دل
چاہتا ہے۔"

☆ "اور کیا مصروفیات ہیں ڈراموں کے
علاوہ؟"

☆ "میں تو سراپا مصروفیت ہوں۔ آپ کو
بتاؤں کہ میں پیپلز پارٹی کی سرگرم رکن ہوں اور
ایکشن بھی لڑ چکی ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ کامیابی نہیں

☆ "تو اللہ کے اس فیصلے سے خوش ہیں؟"

☆ "بالکل خوش ہوں اور بہت خوش ہوں۔
اللہ جو کرتا ہے بہت بہتر کرتا ہے اور اب تفصیل میں
زیادہ کیا جاؤں۔ اس فیلڈ میں آئی تو احساس ہوا کہ
عزت بھی ہے اور پیسہ بھی ہے جو عزت کے ساتھ مل
رہا ہے..... لوگوں نے بھی میرا کام پسند کیا تو بس پھر
سلسلہ چل نکلا۔ پہلے پہل یہ کام سب کے کہنے پر یا
اصرار کرنا شروع کیا اب اب مجھے خود بھی حزا آتا ہے،
اچھا لگتا ہے اور شوق نے بھی جنم لے لیا۔"

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ



☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ

☆ "آج کل ہونے والے ڈراموں کے
بارے میں کیا کہیں گی اور آپ کا کمال ہے کہ آپ



☆ ”مجھے شہرت ملی؟“
□ ”اپنے پہلے ہی ڈرامہ ”ادھوراٹن“ سے اور پھر ”سگسار“ سے۔“

☆ ”کھانے سے لگاؤ ہے یا کمانے سے؟“
□ ”دونوں سے اور میں میکرونی بہت اچھے بنالیتی ہوں اور دیگر چیزیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ جسے کھانے کا شوق ہوگا اسے کمانے کا بھی ہوگا۔“
☆ ”کیا کمانے سے زیادہ ضروری ہے؟“

□ ”کولڈ ڈرنک۔ یہ نہ ہو تو مزار نہیں آتا۔“
☆ ”میرے بیک میں جو چیزیں لازمی ہوتی ہیں وہ؟“
□ ”وہ ہیں بلکہ بتاؤں کہ میرا بیک بڑا ہوتا ہے جس میں کپڑے بھی رکھتی ہوں اپنے کھانے پینے کا سامان بھی اور میرا میک اپ بھی لازمی ہوتا ہے۔“
☆ ”میں ڈرجالی ہوں؟“

□ ”اندھیرے سے اکیلے نہ اندھیرے میں جاسکتی ہوں نہ کھڑی ہو سکتی ہوں۔ اس لیے رات کی لوڈ شوٹنگ سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

☆ ”کیا کی ناراضی برداشت نہیں؟“
□ ”اپنی ای کی ناراضی۔ یقین کریں جب ای کی بات پر ناراض ہو جائیں تو پھر نہ نیند آتی ہے نہ کچھ کھانے پینے کو دل چاہتا ہے۔“

☆ ”سنانے میں پہل کون کرتا ہے؟“
□ ”میں ہی کرتی ہوں اور اس انداز میں کرتی ہوں جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو۔ کوئی پچھلی بات نہیں دہرائی۔“

☆ ”صبح اٹھنا اچھا لگتا ہے یا برا؟“
□ ”مجھے برا نہیں لگتا۔ بلکہ خوشی خوشی اٹھ جاتی ہوں۔ کیونکہ مجھے شوٹ پر جانا ہوتا ہے۔“

☆ ”میرا پسندیدہ ناشتا؟“

□ ”ویسے تو ای جو بھی ناشتا بنادیں وہ میرا پسندیدہ ناشتا ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ کراچی میں اکیلی رہتی ہوں تو ناشتا کرنے کے لیے میکڈونلڈ چلی

میری بھی سیتے کنزہ ہاشمی

شراون کرشن



☆ ”گھر میں کون سی زبان بولی جاتی ہے؟“
□ ”پنجابی کیونکہ ہم پنجابی ہیں۔ اردو اس لیے کہ گھر میں اردو بولنا سکھایا گیا اور انگریزی بھی کلاس پر ہی ہے تو بولی بھی چاہیے۔“
☆ ”تعلیم؟“
□ ”ابھی جاری ہے۔ ڈگری لوس کی تو بتاؤں گی۔“

☆ ”کیا شوق شوبز تک لے آیا؟“
□ ”کمانے کا شوق، مگر اندازہ ہوا کہ اپنے بس کی بات نہیں۔ مایوس ہو کر بیٹھنے لگی تو ڈرامے کی آفر آگئی تو بس۔ اب ڈرامے ہی کر رہی ہوں۔“

☆ ”میرا نام؟“
□ ”کنزہ ہاشمی۔“
☆ ”تک نیم؟“
□ ”کوئی نہیں اور شکر کہ میرا نام بگڑا بھی نہیں۔“
☆ ”کنزہ ہی کہتے ہیں۔“
☆ ”جنم سال، مہینہ شہر؟“
□ ”1997، 7 مارچ لاہور داتا کی نگری۔“
☆ ”ستارہ؟“
□ ”Pisces“ پائسنز۔
☆ ”بہن بھائی؟“
□ ”اکھوتی ہوں اور بہت لاڈلی ہوں۔“

جاتی ہوں۔“
☆ ”بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے جب؟“
□ ”جب کوئی کام آرگنائزڈ طریقے سے نہ ہو رہا ہے۔“
☆ ”اگر پاور میں آگئی تو؟“
□ ”تو ایک ”اولڈ ہاؤس“ بنانا چاہوں گی اور ایسے لوگوں کو پناہ دوں گی جن کے بچے انہیں گھر سے نکال دیتے ہیں۔“
☆ ”لڑکے کب برے لگتے ہیں؟“
□ ”جب وہ بڑے چھوٹے کا احترام کیے بغیر سب کے سامنے سگریٹ پیٹے ہیں اور بہت بولتے ہیں۔“
☆ ”مجھے ایسے لڑکے پسند ہیں؟“
□ ”جو کم بولتے ہیں اور خاموش طبع ہوتے ہیں۔“



<https://www.urdutubes.com/>

☆ ”مہینوں میں مہینہ اور دنوں میں کون سا دن پسند ہے؟“
 □ ”مارچ بہت پسند ہے کہ میری سالگرہ ہوتی ہے اور دنوں میں جمعہ پسند ہے کہ برکت والا دن ہوتا ہے۔“
 ☆ ”کسی کا اصلی روپ دیکھنا ہوتا؟“
 □ ”اس کے ساتھ سفر کریں۔“
 ☆ ”شادی کے لیے لڑکے میں کیا خوبیاں ہونی ضروری ہیں۔“
 □ ”کھانا ہو دوسروں کا خیال رکھتا ہو ذہانت کا ہونا ضروری ہے اور گڈ لکنک ہو۔“
 ☆ ”ایک کہار جو کرنے کی خواہش ہے؟“
 □ ”میں ”پری“ کا کردار کرنا چاہتی ہوں۔“
 ☆ ”بوریت دور کرتی ہوں؟“
 □ ”کتاب پڑھ کر، گیمز کھیل کر یا پھر ٹی وی فلم دیکھ کر۔“

☆ ”میں تھک جاتی ہوں؟“
 □ ”نہیں..... اللہ کا شکر ہے کہ تھکی نہیں ہوں۔ مجھے کام کرنا، محنت کرنا اور اکیٹو رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔“
 ☆ ”میں بچت کرتی ہوں؟“
 □ ”میں نہیں کرتی، میں تو سب کچھ اپنی والدہ کو دے دیتی ہوں وہ جس طرح چاہیں بچت کریں۔“
 ☆ ”تخفہ دیتی ہوں؟“
 □ ”دو ہی کام کرتی ہوں۔ تخفہ ضرور دیتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں گولڈ کی کوئی چیز دوں، یا پھر کیش دے دیتی ہوں۔“
 ☆ ”چھٹی انجوائے کرتی ہوں؟“
 □ ”بالکل کرتی ہوں۔ چھٹی کا دن شاپنگ کر کے، دوستوں کے ساتھ کھوم پھر کر اور فیملی کے ساتھ ڈنر کر کے۔“
 ☆ ”اپنی کمائی سے قیمتی چیز کیا خریدی؟“
 □ ”میں نے اپنے لیے لپ ٹاپ خریدا ہے اور اپنے لیے اچھا موبائل بھی خریدا ہے۔ جو کچھ اچھا لگتا ہے خریدتی ہوں۔“

☆ ”اپنے پاس رکھ کر سوتی ہوں؟“
 □ ”پانی کی بوتل، چارجر، اپنا موبائل فون اور اپنے بالوں کا کچھر۔“
 ☆ ”لوگوں کی میرے بارے میں رائے؟“
 □ ”کہ میں بہت سمجھ داری کی باتیں کرتی ہوں اور مجھ میں بڑھی بھٹی بوڑھی روح ہے۔“
 ☆ ”کن تقریبات میں جانا پسند نہیں؟“
 □ ”کم سے کم شادی کی تقریبات میں پھر بھی بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ دیگر تقریبات میں پھر بھی چلی جاتی ہوں۔“
 ☆ ”ایک کھانا جس سے انکار ناممکن ہے؟“
 □ ”بریانی، چاہے کسی بھی وقت کھلا دیں، بے شک روزانہ کھلا دیں، بہت خوشی کے ساتھ کھا لوں گی۔“
 ☆ ”تہوار جو اچھا لگتا ہے؟“
 □ ”ہر تہوار کیونکہ اس دن چھٹی ہوتی ہے اور میں سارا وقت سوکر گزارتی ہوں۔“
 ☆ ”یادگار سفر یہ کون؟“
 □ ”جب میں اپنے ایک پروجیکٹ کے لیے ملا بیٹھا گئی اور وہاں ایک پاکستانی فنکار کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا گیا تو وہ لمحہ میرے لیے بڑا یادگار بن گیا۔“
 ☆ ”راہ چلنے کوئی بد تمیزی کرے تو؟“
 □ ”نظر انداز کر دیتی ہوں۔ راستے میں کسی سے الجھنا مجھے پسند نہیں۔“
 ☆ ”گھر میں کس کی ناراضی کا ڈر رہتا ہے؟“
 □ ”ہم گھر میں ہیں ہی کتنے لوگ..... مگر پھر بھی ”مما“ کی ناراضی کا ڈر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ بہت جلدی ناراض ہو جاتی ہیں۔“
 ☆ ”مجھے کی ہے؟“
 □ ”وہی تو الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے مکمل انسان بنایا ہے لیکن بس مجھے لگتا ہے کہ میری ہائٹ کچھ کم ہے۔ مجھے سے کم 5.6 تو ہونا ہی چاہیے تھا۔“

☆ ”مجھے پسند نہیں؟“
 □ ”زیادہ شور شرابا، زیادہ ہلا گلا، میں طبعاً خاموش طبع لڑکی ہوں۔“
 ☆ ”بہت خوش ہوتی ہوں؟“
 □ ”جب اپنی ماما کے پاس ہوتی ہوں۔ جب اپنی فیملی کے درمیان ہوتی ہوں۔“
 ☆ ”میں نے مخلص پایا؟“
 □ ”اپنوں سے زیادہ ”پرانی“ لوگوں کو۔“
 ☆ ”غصہ آتا ہے؟“
 □ ”جب کوئی میری بات نہ مان رہا ہو۔ میری بات نہ سن رہا ہو، میرا کام نہ کر رہا ہوں، تو بس پارہ چڑھ جاتا ہے۔“
 ☆ ”مجھے عادت ہے؟“
 □ ”اپنا ہر کام خود کرنے کی اور میرا کوئی کام وقت پر مکمل نہ ہوا اپنے آپ کو بہت باتیں سناتی ہوں۔“
 ☆ ”کیا کیا چیزیں لے کر گھر سے نکلتی ہوں؟“
 □ ”پرفیم لازمی لیتی ہوں۔ ہیر برش، اپنی چیک بک اور اپنی کھڑی۔“
 ☆ ”بہت مسکراتی ہوں؟“
 □ ”جب لوگ مجھے پہچان کر سرگوشیاں کرتے ہیں مگر میرے قریب نہیں آتے جبکہ مجھے اچھا لگتا ہے جب لوگ مجھے پہچان لیتے ہیں۔“
 ☆ ”مشورہ کس سے لیتی ہوں؟“
 □ ”اپنی ماں کے علاوہ اپنے دل سے نہیں بلکہ دماغ سے مشورہ لیتی ہوں۔“
 ☆ ”بھی چپ کر باتیں نہیں؟“
 □ ”ہنستے ہوئے، جب ”مما“ ”پاپا“ سے شکایتیں لگا رہی ہوتی ہیں تو ضرور سنتی ہوں۔“
 ☆ ”میری نیند؟“
 □ ”بہت ضدی ہے۔ جلدی نہیں آتی، بستر پر کروٹیں بدلتی رہتی ہوں۔ تب کہیں جا کر آتی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سے دو گھنٹے تو لگ ہی جاتے ہیں۔“

محمد ہدایت سائر

شاہین رشید



FM 93 سرکاری ایم ایف ہے، اس لیے یہ دیگر چینلوں سے یعنی دیگر ایف ایم سے مختلف بھی ہے۔ اس چینل پر صرف اور صرف پاکستان کی بات کی جاتی ہے اور پاکستان کی ہی میوزک سنوائی جاتی ہے۔ جس طرح یہ ایف ایم دیگر ایف ایم سے مختلف ہے اس طرح اس ایف ایم کے آ رہے بھی مختلف ہیں اور ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ ہدایت سائر کو ہی دیکھ لیں۔ صرف ریڈیو نہیں، اچھی اور خوش حال لائف گزارنے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ ہدایت سائر شاعر بھی ہیں، اسکرین رائٹر بھی ہیں اور براڈ کاسٹر بھی ہیں..... ملاقات کیجیے۔

”جی۔ ہدایت صاحب کیسے ہیں؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”چلیں جی۔ آواز کرتے ہیں انٹرویو کا۔ تو

پہلے آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟“

”جی جناب! میرا اصلی اور پورا نام محمد ہدایت ہے اور ”سائر“ میرا قلمی نام ہے کیونکہ میں سیاحت بھی کرتا ہوں۔ میرا تعلق آزاد کشمیر کے گاؤں ”بریلوٹ کا کڑا“ سے ہے۔ پیدا اس گاؤں میں ہوا مگر پرورش کراچی میں ہوئی اور اسی شہر میں تعلیم بھی حاصل کی بلکہ جو حاصل کیا وہ اس شہر سے حاصل کیا۔

ہم چھ بہن بھائی ہیں، یعنی چار بھائی اور دو بہن۔ نمبر پانچواں ہے۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ آئل اینڈ گیس کمپنی میں جاب کرتے تھے۔ والدہ الحمد للہ حیات ہیں اور ہاؤس وانف ہیں اور انہوں نے مجھ جیسے بے چینی انسان کو سنبھال کر یہاں تک پہنچایا اور وہ اس سے زیادہ کرتیں بھی کیا۔ میں ماشاء اللہ سے شادی شدہ ہوں اور میرے تین بچے ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی ماشاء اللہ اور میری تاریخ پیدائش پندرہ اگست ہے اور گریجویٹ ہوں، ماسٹرو بیا لوجی میں اور میڈیکل سے متعلق مختلف کورسز بھی کیے ہیں اور ڈپلوما بھی۔“

”آپ کا نام ہدایت سائر ہے۔ اس کا کیا بیک گراؤنڈ ہے؟“

”جیسا کہ میں نے بتایا کہ اصلی نام محمد ہدایت ہے۔ اب بابا نے کیا سوچ کے رکھا مجھے نہیں معلوم لیکن سائر میرا قلمی نام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے بچپن سے ہی سیر و سیاحت کا شوق ہے اور اس شوق کی بنا پر میں نے اپنا تخلص سائر رکھا۔ جتنی سیر کرنے والا۔“

”آپ کے پروفائل میں ٹی وی کے کیریئر کے بارے میں تفصیل درج ہے مگر ریڈیو کا کوئی ذکر نہیں، کیوں؟“

”آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں کہ میرے پروفائل میں ریڈیو کا کوئی تذکرہ نہیں ہے..... تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیلی ویژن میری ضرورت ہے اور ریڈیو میرا عشق۔ تو بھلا عشق کا کیا ذکر کرنا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ٹیلی ویژن تک رسائی کا بنیادی محرک بھی میرا

عشق یعنی ریڈیو ہی ہے۔“

”آج کل کس ٹی وی چینل کے ساتھ کام کر رہے ہیں؟“

”میں آج کل اے آر وائی نیوز کے ساتھ بطور اسکرپٹ رائٹر کام کر رہا ہوں۔“

”ریڈیو کب اور کیسے عشق بنا۔ کیا ریڈیو سن کر؟“

”عجیب بات ہے کہ کراچی میں پلا بڑھا مگر کراچی کی ریڈیو سن کر ہی عشق ہو گیا۔“

”جب بھی گاؤں جانا ہوتا تھا تو وہاں والد (مرحوم) خبریں اور حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے ریڈیو سنا کرتے تھے تو میں ان سے سوال کیا کرتا تھا کہ بابا یہ کون ہیں؟ یہ کون لوگ ہیں جن کو آپ سنتے ہیں، جن کی آوازیں ہم سنتے ہیں تو بابا ایک ہی بات کہتے کہ ”بیٹا یہ بھی ہمارے جیسے ہی لوگ ہیں۔ بس محنت کرتے ہیں اور ریڈیو تک پہنچ جاتے ہیں۔“ بس تب سے ریڈیو لاشعور میں جا کر بیٹھ گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ میں ریڈیو تک پہنچ گیا۔“

”کیسے؟“

”اب تک لمبا اور عجیب واقعہ ہے کہ کیسے پہنچا۔ میں اسے دہرائیں چاہتا۔“

”ہوں..... ریڈیو میں کیا کشش ہے؟“

”ریڈیو میں ایک خاص کشش ہے اور وہ یہ کہ ریڈیو میں انسان اپنے اصل سے نہیں کٹتا۔ مجھے کسی بھی طرح مصنوعی بناؤ سنگھار اور پہناوے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اپنے اصل میں اپنی معلومات سے لاکھوں ساتھیوں تک پہنچ سکتا ہوں اور چلتے پھرتے، کام کرتے، ان کا ساتھ بناہ سکتا ہوں۔ یہ سہولت کسی اور میڈیم میں نہیں ہے۔ ٹی وی اور اخبار کے لیے آپ کو سب کام چھوڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے جبکہ ریڈیو کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ آپ کام کے دوران بھی ریڈیو سن سکتے ہیں۔“

”آپ کے پروگرام کا فارمیٹ کیا ہے؟“

”ویسے دیگر ایف ایم سے بھی میری وابستگی

رہی ہے، جہاں میں ادبی پروگرام کرتا رہا لیکن ریڈیو پاکستان سے میرا تعلق ایسا ہے جیسے ایک بچے کا اپنی ماں کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ میں آج جو کچھ بھی ہوں، اسی کے دم سے ہوں۔ یہاں سے بے پناہ سیکھا میں نے، ریڈیو پاکستان ایف ایم 93 پر میرے پروگرام ادبی شخصیات کے ساتھ ان کے فن اور شخصیت پر مبنی گفتگو کے ہوتے ہیں۔“

”ریڈیو اور ٹی وی..... ان سب میں اپنا آپ منوانے کے لیے کیا کیا، مشکلات درپیش آئیں؟“

”لفظ مشکل میرے خیال میں ہمارے اپنے ذہن کی پیداوار ہے، مشکل کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں ہم وقت اور حالات کے گھیرے میں آ کر کسی بھی چیز کو مشکل سمجھ لیتے ہیں۔ یہی وہ لفظ ہوتا ہے جہاں اپنی مسافت کو ادھورا چھوڑ کر کسی اور سمت نکل جاتے ہیں۔ میں جو بھی سوچتا ہوں، صلے اور جزا کا خوف نکال کر اس کی جانب چل پڑتا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ میں پہنچ جاؤں گا جب آپ کا خوف چھوٹا اور یقین بڑا ہوتا ہے، تو پھر ناکامی کم ہی آپ کے سامنے آتی ہے۔ میرے لیے راستہ انہم ہے، منزل نہیں لہذا میرا کام چلے جانا ہے۔ دوسروں کے راستے ہموار کرتے ہوئے، ماننے اور منوانے کی جستجو نہ ہی نہ ہے۔“

”مڈیا تک کیسے پہنچے، گھر والے راضی تھے ان سب کے لیے؟“

”گھر والے تو مجھے ڈاکٹریا آری آفیسر بنانا چاہتے تھے لیکن میرا بچپن سے ہی جھکاؤ لکھنے پڑھنے کی طرف تھا، میڈیکل کے شعبے سے کچھ مدت وابستہ بھی رہا لیکن بعد ازاں وہ کہتے ہیں ناکہ ”بچپنی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا“ پھر میں نے لکھنے لکھانے کو ہی بطور پیشہ اپنا لیا اور میڈیکل کی نوکری کو خیر باد کہہ دیا۔“

”ایف ایم 93 دوسرے ایف ایم سے کتنا مختلف ہے؟“

”ویسے تو ریڈیو اسٹیشن کوئی سا بھی ہو، سب

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ”آفشل پیج“ کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر آپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

ماہنامہ شعاع
عمران ڈائجسٹ
خواتین ڈائجسٹ
ماہنامہ کرن

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

”ہر وہ چیز شوق سے کھا لیتا ہوں جو مجھے پیٹ کی فکر سے نکال کر کچھ کھانسی کا کام سوچنے کی طرف لے آئے۔“

”لوگ پہچان لیتے ہیں؟“
”جی..... ہنسنے کی بجائے اب لوگوں کو پہچاننے میں مشکل نہیں ہوتی۔ لوگ پہچان لیتے ہیں، مان دیتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔“
”اتنے کام کرتے ہیں، فیملی ڈسٹرب نہیں ہوتی کیا؟“

”فیملی ڈسٹرب وہاں ہوتی ہے، جہاں روزمرہ کاموں اور معاملات کو سمجھنے میں کوتاہی ہو۔ جب گھر والے آپ کو سمجھنے لگتے ہیں تو پھر ایسے معاملات راہ میں حائل نہیں ہوتے۔ البتہ مجھے احساس رہتا ہے کہ میں گھر اور بچوں کو کم وقت دیتا ہوں، لہذا کوشش کرتا ہوں کہ جو وقت بچ جائے وہ زیادہ سے زیادہ ان کے ساتھ گزاروں۔“
”کام میں آسانی کہاں محسوس کرتے ہیں؟“

”جہاں محبتیں، خلوص، نیک نیتی اور معاشرتی بہتری کی سوچ کے ساتھ کام کرنے والے لوگ موجود ہوں، وہاں کام کرنے کا مزا آتا ہے اور اگر آپ ٹی وی اور ریڈیو کی بات کر رہی ہیں تو ریڈیو پر آسانی رہتی ہے کیونکہ مجھے تیار ہونے کی، بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسی بھی حالت میں کرسی پر اتنی پالتی مار کر بھی پروگرام کر لیتا ہوں۔“
”اور آخر میں کچھ کہنا چاہیں گے؟“

”بس یہی کہنا ہے کہ مثبت ہو جائیں، اپنے خواب کو بڑا رکھیں خدشے کو نہیں اور کتابوں سے جو جائیں۔ پڑھیں، پڑھائیں، کتابوں کا تبادلہ کریں اور کتابوں سے دوستی کر لیں اور نعرہ لگائیں ”اول کتاب آخر کتاب الکتاب الکتاب۔“

☆ اس کے ساتھ ہی ہم نے ہدایت صاحب سے اجازت چاہی۔

میں کام ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ ایک ہی نوعیت کا ہوتا ہے۔ فرق صرف معیار کا ہوتا ہے کہ کون سا ریڈیو اسٹیشن کس معیار کا ہوتا ہے۔ تاہم ایم ایف 93 اور دیگر ایم ایف میں میرے نزدیک وہی فرق ہے جو ماں کی گود اور مکمل سہولیات سے آراستہ بیڈروم میں ہوتا ہے۔ بیڈروم جتنا بھی آرام دہ ہو لیکن جو سکون ماں کی گود میں ملتا ہے وہ کسی اور بستر میں نہیں ملتا، نہ مل سکتا ہے..... مجھے یہاں ماں جیسی محبت کا احساس ہوتا ہے۔“

”واؤں اور زبھی کرتے ہیں؟“
”جی..... باقی میں جتنے بھی ٹی وی چینلوں پر کام کیا وہاں اسکرپٹ رائٹنگ، پروگرام کی میزبانی اور دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ واؤں اور زبھی کرتا رہا لیکن اب یہ سلسلہ کچھ مدت سے ختم کر دیا ہے۔ اب تو بس لکھتا ہوں اور ریڈیو کرتا ہوں۔“
”مزاجا کیسے ہیں؟“

”یہ تو وہ لوگ بتا سکتے ہیں جو مجھ سے روزانہ ملتے ہیں یا ملتے رہتے ہیں..... جو لوگ مجھ سے ملتے ہیں یا جن کا مجھ سے واسطہ ہے، وہ بہتر جانتے ہیں کہ میں کس مزاج کا بندہ ہوں۔“

”انسان اپنا تجربہ خود بھی تو کرتا ہے؟“
”بالکل کرتا ہے اور میں اگر اپنے بارے میں بتاؤں تو مجھے ہر وقت مسکراتے رہنا، دوسروں کے دکھوں کا مداوا کرنا، دوسروں کے چہروں پر مسکراہٹیں نکھیرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ خوش مزاجی اچھی لگتی ہے اور خوش مزاج لوگ بھی اچھے لگتے ہیں۔“

”قاریغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟“
”پڑھتا ہوں، مطالعہ کرتا ہوں یا پھر میوزک سنتا ہوں۔ اچھا نام پاس ہو جاتا ہے۔“
”کھانے پینے کے شوقین ہیں؟“

”کھانے پینے کا شوق بس اس حد تک ہے کہ جو ملے بس اتنا مل جائے جو اگلے وقت تک کچھ توانائی دے سکے۔“

”پھر بھی کچھ خاص پسند ہوتا ہے؟“

صفیہ ناز

ادارہ

س: ”اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟“

ج: ”صفیہ ناز“ ابو پیار سے ”صفی“ ”مما“ ”مفو“ اور وہ شادی کے شروع دنوں میں ”جان“ کہتے تھے، اب یقیناً پڑیل ہی کہتے ہوں گے۔ بچے، ممما، بھائی، بہن باہی کے بجائے جو کہتے ہیں۔ دیوروں کے بچے صفیہ چاچی۔“

س: ”آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟“

ج: ”آئینہ کہتا ہے کہ میری صورت بہت پیاری ہے۔ میں اپنے بچوں کی ماں نہیں، بڑی بہن لگتی ہوں۔ میری شادی چودہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ میری شکل فلم اداکارہ سے ملتی ہے، جب وہ نوجوان تھی، اب تو وہ آئی لگتی ہے۔“

س: ”حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟“

ج: ”کہ اللہ نے ان لوگوں پر خاص کرم کیا ہے اور اللہ جو چاہے کرتا ہے۔“

س: ”اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو.....؟“

ج: ”موگ پھلی کے چھلکے، بادام کے چھلکے۔ اگر سردیاں ہوں تو مالے کے چھلکے، شافنی کارڈ، ڈھیر سارے سکے، لپ اسٹک، بال پوائنٹس، بچوں کی تصویریں، کچھ روپے، مٹی اور بہت سی چیزیں مثلاً ٹیل کٹر۔“

س: ”بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟“

ج: ”بالکل بھی نہیں۔ میری بڑی دیورانی جب بھی لڑتی جھگڑتی ہے، تب اس پر پتا نہیں کیسے بھوت چڑھ جاتا ہے۔ سب لڑائی جھگڑے بھول بھال کر اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور قرآنی آیات کا ورد کرتے ہیں۔ کوئی ہاتھ پیر کی ماش کر رہا ہوتا، میں اس کے سر پر کھڑی ہو کر ہمیشہ رہتی رہتی ہوں.....“

”یہ مکر کر رہی ہیں۔ جو خرخر کی آوازیں نکال رہی ہیں، یہ جھوٹ موٹ کی ایکٹنگ کر رہی ہیں جو کہ فلاپ ہوتی ہے۔“

س: ”مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟“

ج: ”وہ مہمان جو خوش اخلاق ہوں اور کبھی لڑے نہ ہوں۔ اپنے سارے دیور اور دیورائیاں بہت برے لگتے ہیں۔“

س: ”کھانے میں کیا پکارتے ہیں؟“

ج: ”ہر وہ چیز جو ریڈی یعنی تیار ملے اور میں آرام سے کھا کے شکر ادا کروں۔ جب بھی پڑوسیوں کے گھر سے کھانا آتا ہے۔ وہ بہت پسند ہوتا ہے۔“

س: ”اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟“

ج: ”سب سے پہلے ان سب کو پھانسی لگا دے پھانسیوں کی، جو ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اور جو عورت کے پڑھنے لکھنے کے خلاف ہوں ان کو جیل بھجواؤں گی، کم از کم تین ماہ قید۔“

س: ”پسندیدہ شاعر؟“

ج: ”احمد فراز، وحشی شاہ اور پروین شاکر کی شاعری پسند ہیں۔“

س: ”مزاج لڑا کا ہیں؟“

ج: ”بہت زیادہ، ہر حد سے زیادہ۔ کیونکہ میں اور کھری بات سے بھی لڑائیاں جنم لیتی ہیں۔ سسرال والے بھی، مٹی پڑھی لکھی جاہل کہتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ میں ناخن پاس ہوں اور کوئی بھی اتنا پڑھا لکھا نہیں ہے۔ میں نے سسرال میں کسی کو نہیں بخشا، ہر ایک سے لڑی ہوں کیونکہ میں آگے نہ بڑھ سکی مگر اچھی بیٹیوں کو پڑھا رہی ہوں۔“

س: ”کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟“

ج: ”کم بولنے والے اور لڑائی جھگڑوں سے دور رہنے والے، اپنے میکے والے کیونکہ وہ لیے دیے رہتے ہیں۔ میں بھی میکے میں ہنس مکھ اور اپنی دوستوں میں زندگی دل مشہور تھی۔“

س: ”اگر کوڈ شیدنگ نہ ہوتی تو.....؟“

ج: ”تو واپڈا والے بددعاؤں کے بجائے دعائیں لیتے اور جو بچے گرمی میں پیدا ہوتے ہیں، وہ

چمھروں کا شکار ہرگز نہ بنتے۔“

س: ”اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟“

ج: ”نجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء۔ پانچ نمازوں کے بعد۔“

س: ”آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟“

ج: ”فضول خرچ..... اور پیسے لگانا پسندیدہ مشغلہ ہے۔“

س: ”کیا انعام شخصیت کا لگتا ہے؟“

ج: ”نہیں بالکل، کیونکہ صفیہ نام کی لڑکیاں شکل سے پیاری ہوتی ہیں اور بہت زیادہ مذاق، تیز اور ہنس مکھ اور علم سارٹ۔ میں نے جہاں بھی کوئی دوسری صفیہ دیکھی وہ ایسی ہی دیکھی۔“

س: ”وہ کون سے کام ہیں جنہیں کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا ہے کی؟“

ج: ”دل چاہتا ہے کہ بازار میں دکان کھول لوں، مگر ہم لوگ پردہ کرتے ہیں حالانکہ ٹیلرنگ کی دکان دل کھولنے کو بیجا ہوتا ہے۔ ہر گھر والے سب ہی تو دنیا ہے، پڑھایا نہیں تو دکان کھولنے کہاں دیں گے۔“

س: ”آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتنا پیچھے لگ جائے تو؟“

ج: ”اے میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے، میرے دیور کا خون خوار کتا میرے پیچھے لگ چکا تھا۔ میں بھاگی، کتا پیچھے دوڑا۔ دیورانی نے سمجھایا تھا کہ جب ہمارا کتا کسی کے پیچھے لگ جائے اور جب وہ قریب آئے تو آواز کی آوازیں کہہ دو..... ”سدر جا“ وہ سمجھ جاتا ہے کہ گھر کا بندہ ہے۔ جب کتا میرے سے دو ٹوٹ دوڑے گا میں چچی ”سدر جا“ وہ رک گیا۔ میرا بے قابو دل قرار پا گیا۔“

س: ”محبت آپ کی نظر میں کیا ہے؟“

ج: ”محبت خدا کا پیدا کیا ہوا خاص پاک جذبہ ہے، مگر آج کل تاپید ہوئی جا رہی ہے۔“

س: ”کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟“

ج: ”اپنے رب کی پھر والدین اور اپنے شوہر کی جو میری ہر قسم کی بدتمیزیاں برداشت کیے ہوئے ہیں۔“

س: ”اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے؟“

ج: ”نہیں۔ کوئی تعریف نہیں کرتا۔ یا ہر ایک سے لڑی ہوں۔ تعریف تو اللہ کی ہے جس نے جہاں بنایا۔ میں تو تعریف پر خوش ہونے والی نہیں۔“

س: ”اگر کوئی دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟“

ج: ”میرے جو دوست تھے شادی کے بعد دنیا کے بھیلوں میں گم ہو گئے۔ اب دشمن زیادہ ہیں، ویسے شادی سے پہلے اگر سبیلی ناراض ہو جاتی تو قلم دکھا کر وہ راضی ہو جاتی تھی۔“

س: ”حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟“

ج: ”جب کوئی بھی خاندان میں فرسٹ آئے، بہن بھائیوں میں یا میرے چھوٹے بچے فرسٹ پوزیشن لیں، دل کرتا ہے ناچوں جوم جوم گئے۔“

س: ”زندگی سے کیا سبق سیکھا؟“

ج: ”یہی کہ اگر کوئی آپ کو مظلوم سمجھ کر ظلم کر رہا ہو تو خود کو مظلوم نہ رہنے دوں بلکہ اپنے حق کے لیے زندگی میں آواز بلند کر دوں۔“

س: ”ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟“

ج: ”جی نہیں۔ مگر کئی ستارے بہت پسند ہیں۔“

س: ”کوئی آخری بات؟“

ج: ”قاری بہن پر دل لگی، محبت و جنت کچھ نہیں، فلموں ڈراموں میں اچھی لگتی ہے، اگر آپ میں کوئی ہنر ہے تو وہ آزمائیں، اپنے گھر والوں کو سپورٹ کریں۔ اپنا حق تلف نہ ہونے دیں اور سب سے زیادہ پڑھائی لکھائی پر توجہ دیں۔ محلے کے بچے بچیوں کو پڑھائیں اور خاص کر فیس بک سے دور دور رہیں۔“

س: ”کوئی ایسی بات جو ذہن میں ہمیشہ رہتی ہے؟“

ج: ”کہ ایک نہ ایک دن مجھے اس دنیا سے جانا ہے۔ کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ وقت سے پہلے نہ چلی جاؤں۔“

س: ”کوئی آخری بات؟“

ج: ”کاش..... میں پڑھ پاتی، ایم اے کر لیتی۔ سرکاری پیپر بن جاتی۔“

سونیا کے مشورے پر تیور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خزیہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے لیکن وہ خزیہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزیہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خزیہ تیور کی محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حمیدہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیور خزیہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

سولہویں قسط

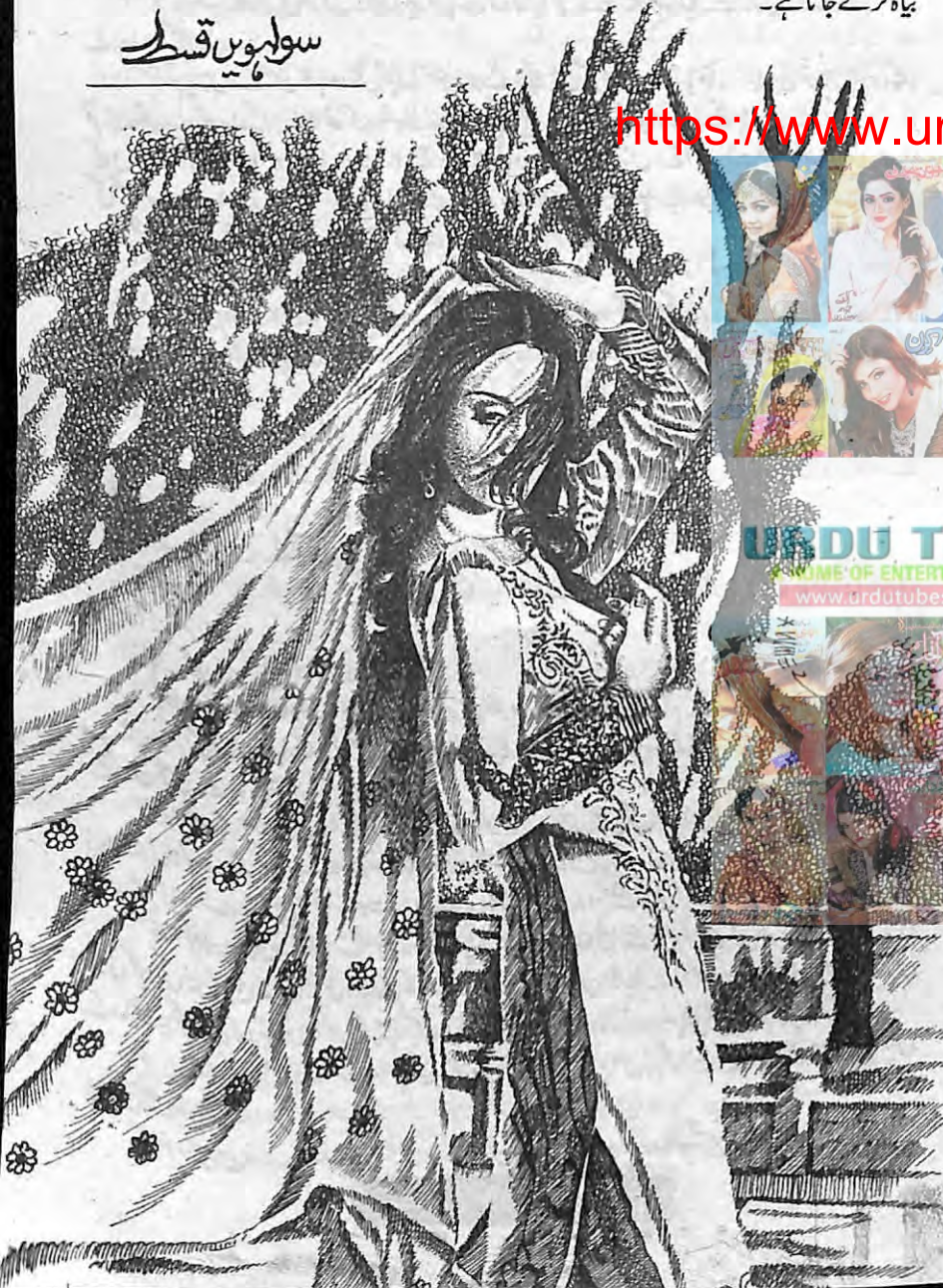
<https://www.urdutubes.com/>

نگہت عبد اللہ

پہلی سچی بدگش

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا تھا باوجود اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔ حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خوتے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز و طرار اور کسی حد تک بد زبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔ حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ، خزیہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔ سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزیہ اپنے باس تیور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزیہ کا خالہ زاد بھیل اس کو جاتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جاب مل جاتی ہے لیکن اس کے پاس جہان صاحب کی بیٹی ربیکا اس کو پسند کرنے لگتی ہے جو قتا قتا حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔ تیور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے اب بھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیور سے اپنی دوست زوئی کا بے بی لینے کا کہتی ہے لیکن تیور اس بات پر دل سے رضامند نہیں ہے۔



اچانک شہرینہ کو احساس ہوا کہ کہیں کچھ غلط ہوا ہے۔ خاموش ہو کر حمزہ کو دیکھا تو وہ نظریں چرا گیا۔ جس پر وہ تیز ہو کر پوچھنے لگی۔

”کیا..... کیا کہا تھا تم نے ابھی؟“

وہ چہرہ دوسری طرف موڑ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔ تو وہ مزید پھر گئی۔

”حمزہ! ادھر دیکھو میری طرف، مجھے دیکھ کر بات کرو۔ کیا کہہ رہے تھے تم ربیکا سے شادی کر رہے ہو۔“ حمزہ نے ہونٹ پیچنے لگے۔

”تو تم پر اس کے حسن کا جادو چل گیا۔“ شہرینہ کے لہجے میں گہرا دکھ سمٹ آیا تھا۔ ”یہی سچ تھا نا حمزہ، پھر تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ وہ تمہارے پاس کی بیٹی ہے زبردستی تمہارے لئے پرورش کی گئی ہے۔ کیوں حمزہ؟ تم نے ایسا کیوں کیا۔ مت سنا تے مجھے جھوٹی داستان کیونکہ میں نے اسی وقت خود کو سمجھا لیا تھا۔ جھوٹ گئی تھی تمہارے راستے سے..... لیکن تم بار بار میرے ٹوٹنے کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھو۔“ وہ بھاگ کر دیوار سے سر ٹکرائے لگی۔ تو حمزہ نے تیر کی سی تیزی سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔

”کیا کر رہی ہو؟ پاگل ہو گئی ہو؟“

”ہاں پاگل ہو گئی ہوں۔“ وہ چیخنے لگی۔ ”تمہارا اصل گھناؤنا چہرہ دیکھ کر پاگل ہو گئی ہوں۔ تم اتنے گندے ہو سکتے ہو۔ میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا۔ جاؤ چلے جاؤ حمزہ۔ چلے جاؤ۔“ وہ ٹوٹ کر رو رہی تھی حمزہ کا دل پھٹنے لگا۔

”شہرینہ میری بات سنو۔“

”نہیں، نہیں مجھے کچھ نہیں سننا۔ اپنی جھوٹی داستانیں کسی اور کو جا کر سناؤ۔“ وہ اسی شدت سے روتے ہوئے بولی تھی۔

”شہرینہ خدا کے لیے تم تو ایسے مت کرو، میری مجبوری۔“

”مجبوری.....!“ شہرینہ کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالے بھاگ کر کمرے میں بند ہونا جانتی تھی لیکن وہ سامنے آن کھڑا ہوا۔

”ہاں مجبوری..... سن لو، پھر فیصلہ کرنا۔“

”فیصلہ تو تم کر چکے ہو اب بس اتنا کرو کہ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تم نے میرا مان میرا یقین توڑ دیا۔ اب میں مگر بھی تمہارا اعتبار نہیں کر سکتی۔ خدا ارادہ جاؤ۔ چلے جاؤ۔ میں دیکھوں گی کہ حسن اور دولت کے نشے میں تم کتنے دن چین سے رہ سکتے ہو۔“

”میرا سکھ چین تم ہو شہرینہ! لیکن میں کیا کروں کہ میرے مقدر میں سکھ چین لکھا ہی نہیں گیا۔“ اس کی بو جھل آواز میں بلا کا درد تھا۔ شہرینہ نے منہ موڑ لیا تو اسے لگا اگر وہ اپنا دل چیر کر دکھا دے تب بھی وہ یقین نہیں کرے گی۔ پھر بھی وہ اسے بتانا چاہتا تھا۔ بہت نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ جھجکنے لگی تو گرفت مضبوط کر لی۔

”خدا کو وہ ہے شہرینہ! میں نے صرف تمہیں چاہا ہے۔ میرے دل کے ہر ہر کونے میں صرف تم بستی ہو۔ کسی اور کی محبت مجھ سے کبھی نہ ہو سکتی تھی۔ یہ دل کا معاملہ ہے ہی ایسا جہاں اڑ جائے۔ پھر کچھ سنتا مانتا ہی نہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ دنیا دل والوں کو جینے نہیں دیتی۔ بس یوں سمجھو ہمارے درمیان بھی ظالم سماج آ گیا ہے۔“ شہرینہ ہنوز منہ موڑے ساکت کھڑی تھی۔ حمزہ کی آخری بات پر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکالنا چاہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

”سنو، بس سن لو۔ بے شک میرا یقین نہ کرنا لیکن میں اس یقین کے ساتھ تمہیں بتا رہا ہوں کہ تم یہ بات

صرف اپنے تک رکھو گی۔ سن رہی ہوں..... وہ لڑکی ربیکا صرف نفسیاتی ہی نہیں انتہائی خطرناک بھی ہے۔ پتا ہے اس نے کیا کیا۔ وہ بیلا کو کڈنیپ کر کے لے گئی تھی۔“ ساکت کھڑی شہرینہ نے ایک دم اسے دیکھا۔

”ہاں شہرینہ، بس وہیں میں ہار گیا۔ بیلا کے بدلے اس کی ڈیمانڈ میں تھا اور میں بک گیا۔ وہ آقا زادی ہے اور میں غلام زادہ اور غلام تو بک ہی جاتے ہیں۔ میں بھی بک گیا۔ اپنی انا، خود داری اپنی ہستی کا غرور سب اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ میں یہی کر سکتا تھا۔ بیلا کے لیے تو میں جان بھی دے سکتا تھا۔“ اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی اور شہرینہ کا سناٹا ٹوٹ کے ٹپٹپ دے رہا تھا۔

”میں اور کچھ نہیں کہوں گا شہرینہ! تم جاؤ مجھے معاف کر دو چاہو جی بھر کے بددعا کریں دو۔ بس ایک احسان کرنا۔ محبت کو جی کا دلگاہ مت بنانا۔“ وہ انا کرنا۔ خدا حافظ۔“ وہ ایک دم پلٹ کر تیز قدموں سے باہر نکلتا چلا۔ شہرینہ کا سناٹا ٹوٹ کے ٹپٹپ دے رہا تھا۔

<https://www.urdu-tube.com/>

☆☆☆

ادھر بیلا چپکے چپکے رو رہی تھی ادھر فاخرہ کو ایک مل چین نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اپنے آپ جاتے کیا کچھ قیاس کے جاری نہیں کہ ہو سکتا ہے حمزہ نے حمیدہ بیگم کے سامنے شادی سے انکار کیا ہو۔ جب ہی اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ حمزہ کو گئے ہوئے بھی تو اتنی دیر ہو گئی تھی۔ کم از کم اسے فون کر کے بتانا تو چاہیے تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے انہوں نے گھبرا کر بیلا کو پکارتا تھا۔

”جی اماں!“ بیلا خاصی پر مژدہ نظر آ رہی تھی۔

”ارے بھائی کو فون کر کے پتا کرو کہاں ہے وہ اور بھائی کہاں ہیں۔ ان کی طبیعت کا پوچھو۔ مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔“ وہ بولے چلی گئیں۔

بیلا نے ان کا موبائل اٹھا کر حمزہ کا نمبر ملا یا۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی لیکن کال ریسپونڈ نہیں ہوئی۔ اس نے دوبارہ بار بار نمبر پر کیا پھر اچانک خیال آنے پر حمزہ کے کمرے میں جا کر دیکھا تو اس کا موبائل وہاں بیٹھا تھا۔

”اماں، بھائی کا فون کبھی پر نہیں رکھا ہے۔“ بیلا نے واپس آ کر فاخرہ کو بتایا تو وہ فوراً بولیں۔

”تو شہرینہ کو فون کر کے پتا کرو۔“

”جی۔“ بیلا نے شہرینہ کا نمبر ملا یا اور پاور آف سن کر مایوسی سے بولی تھی۔

”اس کا فون بند ہے۔“

”یا اللہ! اب کیا کریں۔ کیسے پتا چلے بھائی کی طبیعت کا۔ چلو ہم چلتے ہیں۔“ فاخرہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور بیلا کیونکہ حمزہ کی باتوں سے خائف تھی اس لیے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ خاموشی سے چاؤر اٹھا کر فاخرہ کو دی۔ پھر دروازہ بند کر کے ان کے ساتھ چل پڑی۔

آگے کیٹ شہرینہ نے کھولا تھا اور ان دونوں کو دیکھ کر کسی بھی اظہار سے قاصر رہی تھی۔ بیلا نے ضرور محسوس کیا لیکن فاخرہ کو پریشانی میں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔

”کیسی ہیں بھائی جان؟ اچانک کیا ہوا ہے انہیں؟“ فاخرہ پوچھتے ہوئے آگے چل پڑیں۔

”کیا زیادہ طبیعت خراب ہے تانی جان کی؟“ بیلا نے شہرینہ کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں اب تو بہتر ہیں۔“ شہرینہ جواب دے کر جن میں جاگھسی تو بیلا نے ایک لمحہ رک کر اسے دیکھا پھر فاخرہ کے پیچھے حمیدہ بیگم کے کمرے میں آ گئی۔

حمیدہ بیگم فاخرہ کو دکھ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔
 ”دیکھ رہی ہیں بھابی۔ یہ اچانک کیا ہوا ہے آپ کو؟“ فاخرہ نے ان کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اٹھنے سے روکا اور ان کے قریب بیٹھ گئیں۔
 ”پتا نہیں کیا ہوا۔ ایسا کچھ کھایا بھی نہیں۔ رات بھر موشن ہوتے رہے۔ صبح الٹیاں بھی ہو گئیں تو مانو میرے بدن میں جان ہی نہ رہی وہ تو اللہ نے شرجیل کو بھیج دیا جو فوراً مجھے ہاسپٹل لے گیا۔ دو ورہیں لگیں۔ ابھی تو آرہی ہوں۔ ادھر شہرینہ کا رورور برا حال۔“ حمیدہ بیگم نے نقاہت کے باوجود پوری تفصیل بیان کر ڈالی۔
 ”ہائے اللہ! مجھے پتا ہوتا تو میں صبح ہی آ جانی اور یہ حمزہ کہاں رہ گیا۔ وہ نہیں آیا آپ کے پاس۔“ فاخرہ شرجیل کا سن کر ٹھٹھکی تھیں۔
 ”نہیں میں نے اسے تو نہیں دیکھا۔“ حمیدہ بیگم نے کہا تو فاخرہ جزبہ ہو کر بات بدل گئیں۔
 ”آپ نے کچھ کھایا۔“
 ”نہیں ڈاکٹر نے بس کچھڑی کھانے کو کہا ہے۔“
 ”ہاں ہلکی غذا ہے۔ بیلا جاؤ جلدی سے کچھڑی بنا دو۔“
 ”شہرینہ بتا رہی ہے۔“ حمیدہ بیگم نے کہا بھی لیکن فاخرہ کے اشارے پر بیلا اٹھ کر آ گئی۔
 ”شہرینہ غالباً راستے کے لیے دیسی پھینٹ رہی تھی۔ اس کا ستا چہرہ دیکھ کر بیلا کا دل دکھ سے بھر گیا۔ یا مشکل خود کو بولنے پر آمادہ کر کے کہہ سکی۔
 ”شکر ہے تائی جان کچھ بہتر نظر آرہی ہیں۔“ جواباً شہرینہ نے ہوں ہاں بھی نہیں کی۔
 ”کچھڑی بن گئی کیا؟“ بیلا نے چولہے پر پتیلی دکھ کر پوچھا۔
 ”ہوں۔“ شہرینہ نے اپنی مصروفیت ترک نہیں کی نہ اس کی طرف دیکھا تھا جس سے بیلا الجھ گئی کہ پتا نہیں وہ تائی جان کی وجہ سے پریشان ہے یا بھائی کے نہ آنے سے۔
 ”لاؤ یہ میں بنا دوں۔“ اس نے شہرینہ کے ہاتھ سے برتن لے لیا۔
 ”بس بن گیا۔۔۔۔۔“ شہرینہ کہہ کر پلیٹ میں کچھڑی نکالنے لگی۔ پھر ٹرے میں رکھ کر پڑی تو بیلا بھی راستے لیے ہوئے اس کے پیچھے آ گئی۔
 ”ارے بیلا! ابھی تو میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ حمیدہ بیگم نے شہرینہ کے ہاتھ میں ٹرے دیکھتے ہی کہا۔
 ”تو فاخرہ فوراً بولیں۔“
 ”تھوڑا سا کھالیں بھابی۔ لاؤ بیلا میں کھلا دوں۔“ شہرینہ نے ٹرے ان کے پاس رکھ دی۔ اور فوراً واپس پلٹ گئی تو بیلا نے بھی یہی کیا۔ راستے کا بیلا رکھ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔ اور اس سے پہلے کہ شہرینہ خود کو کسی کام میں مصروف کرتی وہ پوچھنے لگی۔
 ”سنو، تائی جان بتا رہی تھیں انہیں شرجیل بھائی ہاسپٹل لے گئے تھے تو کیا بھائی نہیں آئے؟“
 ”آئے تھے دیر سے۔“ شہرینہ نے بادل نا خواستہ جواب دیا تھا۔
 ”پھر کہاں ملے گئے؟ میرا مطلب ہے واپس گھر تو نہیں آئے۔“ بیلا کا سوچتا انداز تھا۔ شہرینہ یوں بن گئی جیسے سنا ہی نہیں۔ اصل میں وہ ابھی حمزہ کے بارے میں کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ دل میں ایسا درد اترتا تھا کہ اسے لگ رہا تھا وہ پھٹ پڑے گی۔ جبکہ بیلا کے اندر بلا کی آنکھیں اور بے چینی تھی۔ جیسے وہ سارا معاملہ ابھی سلجھا دینا چاہتی ہو۔ شہرینہ کا لیا دیا انداز محسوس کرنے کے باوجود ایک دم اس کے ہاتھ تھام کر پوچھنے لگی۔
 ”سنو، بھائی نے تم سے کچھ کہا ہے؟“

<https://www.urdu-tubes.com/>

”وہ تو پتا نہیں کیا کیا کہتا رہتا ہے۔ تم بتاؤ کوئی خاص بات ہے کیا؟“ شہرینہ نے انہماک سے اس پر رکھ دی۔
 ”نہیں، بس پتا نہیں کیا ہوا ہے بھائی کو۔ اماں سے الجھ رہے تھے۔ اماں کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ بھائی اماں کے سامنے نہیں بولتے تھے۔ اور آج۔“ بیلا اندر سے اتنی خائف تھی کہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔
 ”ارے۔“ شہرینہ نے بڑی مشکل سے خود پر ضبط کیا تھا۔ ”ایسی کیا بات ہوگئی؟ مجھے بتاؤ۔“
 ”کیا بتاؤں مجھے خود نہیں پتا۔ بس مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ بیلا کو اگر فاخرہ نے سختی سے منع نہ کیا ہوتا تو شاید وہ حمزہ کی ایک بات اگل دیتی۔
 ”اگل ہوئے۔“ شہرینہ نے پوچھا۔
 ”شہرینہ سر جھٹک کر اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ تو وہ جلدی جلدی

☆☆☆

شہرینہ خاں سے غصے میں اور جارحانہ انداز سے ریکا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس پر چڑھ دوڑی۔
 ”راہی! کیا تمنا شہرینہ! کیا تم نے، سب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ مٹی بتا رہی ہیں تم کورٹ میرج کرنے جا رہی ہو۔“ ریکا جونا بھی میں اسے دیکھنے لگی تھی آخری بات سمجھ کر دھیرج سے پوچھنے لگی۔
 ”تم کیا جانتی ہو۔۔۔۔۔؟“ شہرینہ اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
 ”مطلب اگر تم چاہتی ہو میری شادی اسی طرح ہو جیسے تمہاری ہوئی تھی خوب دھوم دھام سے، شان سے تو مٹی ڈیڈی سے بات کرو کہ وہ کیا ہی اہتمام کریں۔“ ریکا کیونکہ ہر صورت حال کے لیے تیار تھی اس لیے آرام سے بات کر رہی تھی۔ اس کے باوجود شہرینہ نے طنز کا تیر چھوڑا تھا۔
 ”میری تو بات یہی شان سے آئی تھی۔“
 ”ہاں، بیلا! سارا فرق ہوگا تمہاری شادی اور میری شادی میں۔“ ریکا نے اس کے طنز کو کوئی اہمیت نہیں دی جس پر شہرینہ تھلا گئی۔
 ”بیلا! یہ تو سارا فرق ہے۔“
 ”سنو، تم اپنی انرجی ویسٹ کرو۔ جب مجھے فرق نہیں پڑتا تو اور کسی کو بھی نہیں پڑنا چاہیے۔“
 ”ماں میں نے ڈیڈی کو اپنا فیصلہ سنا دیا ہے اور میرا فیصلہ اٹل ہے اور تم سن لو میں کورٹ میرج اس صورت میں کروں گی اگر جواب دہرے۔“
 ”مائی فٹ۔۔۔۔۔“ شہرینہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے جس طرح آئی تھی اسی طرح پیر پختی ہوئی اس کے کمرے سے نکل آئی۔ وہ حمزہ نہیں ٹھہر سکتی تھی کیونکہ ریکا کے انداز پر وہ پہلے مرحلے پر ہی ٹھٹھک گئی تھی۔ یعنی اس کے اندر رتی برابر یہ احساس نہیں تھا کہ اس کے اس اقدام سے اس کے خاندان کی کتنی جگ ہنسائی ہوگی۔
 ”وہ پاگل ہوئی ہے مٹی۔ بالکل پاگل ہوگئی ہے۔“ وہ حمزہ کے قریب دھم سے بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”پھر اب بتاؤ کیا کریں؟ تمہارے ڈیڈی کہہ رہے ہیں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسے حمزہ کے ساتھ رخصت کر دیں۔“ حمزہ اب بے بس نظر آرہی تھیں۔
 ”ظاہر ہے مٹی اب اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہی کرنا پڑے گا ورنہ اس کی کورٹ میرج سے تو ہم کسی کو فیس نہیں کر سکیں گے۔“ شہرینہ نے بھی جیسے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

”فیس تو ایسے بھی نہیں کر سکیں گے جب بارات کے نام پر حمزہ دوا دی لے کر آجائے گا۔ مائی گاڈ۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ثمرہ کا بی بی ہائی ہونے لگا۔
 ”ریلیکس می.....! آپ پلیز ریلیکس نہ لیں۔“
 ”کیسے ٹینشن نہ لوں۔ سو سائی میں ہمارا ایک نام ہے، مقام ہے اور اس لڑکی کو ذرا احساس نہیں۔ پتا نہیں کیا دیکھ لیا ہے اس دو ٹکے کے لڑکے میں کہ اس کے علاوہ کچھ سنائی نہیں جاتی۔“ ثمرہ پھٹ پڑی تھیں۔
 ”خود ہی سمجھتے گی۔“ شہینا نے سر جھٹکا پھر کہنے لگی۔ ”مئی اب ان باتوں کو چھوڑیں اور یہ سوچیں ہمیں کیا کرنا ہے۔؟“

”کیا کرنا ہے۔؟“ ثمرہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ تو کچھ دیر سوچنے کے بعد شہینا نے کہا۔
 ”ایسا ہی مئی ہمیں اپنی عزت تو بچانی ہی ہے۔ تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں پہلے خود کو کنٹرول کرنا ہے۔ تب ہی ہم لوگوں کو یس کر سکیں گے۔“
 ”بہت مشکل ہے۔“

”میری پوری بات سنیں مئی!“ شہینا زور دے کر بولی تو ثمرہ نے ہونٹ بھیجنے لے۔
 ”ہاں تو میں یہ کہہ رہی ہوں کہ جب ڈیڈی نے انگری کر لیا ہے تو پھر ان سے کہیں کہ سارا انتظام بھی وہ خود کریں۔ میرا مطلب ہے بارات وغیرہ کا۔ یہ کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔ کچھ سہیل کو وہ یہ کہہ کر حمزہ کے ساتھ آنے کا کہہ سکتے ہیں کہ کیونکہ اس کی فیملی امریکا میں ہوتی ہے اور کی وجہ سے نہیں آ سکی اس لیے وہ اس کا ساتھ دیں۔ یوں کم از کم ہم تماشا بننے سے بچ سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے ناں۔؟“ آخر میں اس نے تائید چاہی تو ثمرہ جو پرسوج انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلانے لگیں۔
 ”اب یہ بتائیں شادی کب ہے؟“ شہینا نے پوچھا تو ثمرہ ایک دم اچھل پڑیں۔
 ”کچھ پتا نہیں ہے۔ یعنی ہماری بیٹی کی شادی اور ہمیں ہی پتا نہیں ہے۔ حمزہ آئے گا تمہارے ڈیڈی سے بات کرنے اور وہی طے کر کے جائے گا۔ ہا۔۔۔“
 ”مئی، مئی پلیز۔“

”بس مجھے معاف کرو۔ جس طرح حمزہ کے گھر والے شادی میں شریک نہیں ہوں گے اسی طرح میں بھی شریک نہیں ہوں گی۔ میں جاری ہوں امریکا۔ پیچھے تم لوگ جو مرضی کرو۔“ ثمرہ پھر آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔
 بولے چلی گئیں۔ شہینا نے سر ہچکڑایا۔

☆☆☆

اسے خود پتا نہیں تھا کہ وہ سارا دن کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ رات ہو گئی تب اس نے گھر کی راہ لی۔ بیلا اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ گیٹ اسی نے کھولا اور اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آ کر پوچھنے لگی۔
 ”کھانا لاؤں بھائی؟“

”اماں کیا کر رہی ہیں۔؟“ اس نے کھانے کا جیسے سنائی نہیں تھا۔
 ”اماں تو کب کی سو گئیں۔“ بیلا نے بتایا تو وہ ٹھٹکا۔
 ”کب کی؟ طبیعت ٹھیک ہے ان کی؟“
 ”جی، وہ اصل میں ہم تائی جان کو دیکھنے گئے تھے۔ اور اماں تو ایسے ہی کہیں جاتی ہیں تو تھک جاتی ہیں۔“
 بیلا مری آواز میں بولی رہی تھی۔
 ”ہم، کیسی طبیعت تھی تائی جان کی؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”بہتر تھی، شہینہ بہت پریشان تھی اور شاید روتی بھی رہی تھی۔“ بیلا نے قصداً شہینہ کا ذکر چھیڑا تھا اور وہ اسی سے تو بھاگ رہا تھا۔ نروٹھے پن سے بولا۔
 ”ظاہر ہے وہ پریشان نہیں ہوگی تو کون ہوگا؟ اس کا ماں کے علاوہ اور ہے ہی کون؟“
 ”کیوں نہیں بھائی۔ ہم سب ہیں ناں۔ کیا آپ ایسے وقت میں اسے اکیلا چھوڑ دیں گے۔“ بیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا تو وہ سختی سے بولا تھا۔
 ”یہ سب تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ چلو جاؤ سوؤ جا کر۔“
 ”کھانا۔۔۔؟“

”بھوک نہیں ہے۔“ بیلا نے کہا۔ ”وہ کہہ کر دواش روم میں بند ہو گیا۔ اور تقریباً دس منٹ بعد نکلا تو اسی وقت بیلا جانے لے گی۔ وہ اس کے ہاتھ سے کپ لے کر ریک کے پاس جا کھڑا ہوا گویا اب اسے کچھ کہنا نہ تھا۔ بیلا چلی گئی تب بیڈ پر بیٹھے ہی اس کی نظر اپنے سیل فون پر پڑی۔ تو وہ قدرے متعجب ہوا کہ سارا دن اسے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کیسے محسوس ہوتی اسے تو خود اپنا پتا نہیں تھا۔ وہ اگر سوچتا تب بھی اسے یاد نہ آتا کہ وہ کہاں کہاں بیٹھا اور کہیں بیٹھا بھی تھا یا صرف بھاگتا رہا تھا۔ بہر حال اب سیل فون سامنے نظر آیا تو فطری بحس جاگ اٹھا کہ وہ تو بے خبر تھا ہی کیا اور لوگ بھی اس سے بے خبر رہے تھے۔“

اس نے جانے کا کہہ کر سیل فون اٹھا کر چیک کیا تو صرف اماں کے نمبر سے بے شمار کالز تھیں۔ وہ بے چین ہو گیا اور کسی طرح خود کو نہیں روک سکا۔ اسی وقت اٹھ کر ان کے کمرے میں آ گیا۔ گوکہ بیلا بتا چکی تھی اماں سوچتی ہیں۔ بس انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ان کے بلیک کے قریب کھڑا ہو گیا اندھیرے میں اماں کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی وہ ٹھٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ بیلا غالباً مکمل سر تک اوڑھے ہوئی تھی ورنہ دروازہ کھلنے پر ضرور متوجہ ہوتی۔
 ”اماں۔۔۔ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنش کی تھی پھر بھی اماں نیند میں چوکی تھیں۔“
 ”ہاں کون حمزہ آیا کہ نہیں؟“

”جی اماں آگئے ہیں۔“ بیلا مکمل میں سے بولی تھی۔ اور وہ رکائیں لٹے پیروں چلتا کمرے سے نکل آیا۔
 ”فروری کی ٹھنڈی رات تھی۔ وہ کتنی دیر برآمدے میں کھڑا رہا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے دنیا ویران ہو گئی ہو۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ جانے رات زیادہ بیت گئی تھی یا لوگ جلدی سو گئے تھے۔ اسے وقت کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ اچانک صبح ٹون کی آواز سے وہ بری طرح چونکا اور اپنے سیل فون کی طرف دھیان جاتے ہی وہ تیزی سے کمرے میں آیا اور سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ شہینہ کا منیج تھا۔

”میں مر جاؤں گی حمزہ؟“
 اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر سیل آف کر کے لیٹ گیا اور نیند تو سولی پہ بھی آ جاتی ہے وہ بھی پل صراط کے نیچے سر میں سو گیا تھا۔
 صبح وہ بخار میں جل رہا تھا اس کے باوجود خود سے اٹھ گیا اور آفس جانے کے لیے تیار ہو کر کمرے سے نکل کر آبا تو فافارہ برآمدے میں تخت پر ناشتا رکھ رہی تھیں۔ اس نے سلام کیا تو اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دے کر واپس پلٹ گئیں۔ ان کی ناراضی بجا تھی لیکن وہ ابھی انہیں منان نہیں سکتا تھا۔ اس لیے خود بھی ناراض ہو کر بنا ناشتا کیے گھر سے نکل آیا۔
 تیز بخار کے باعث بایک چلائی مشکل ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں پانی جمع ہونے کے باعث راستہ دھندلا

﴿ ۳۴ ﴾ فروری ۲۰۱۹

پر کھا پھر چاروا تارتے ہوئے انجان بن کر پوچھنے لگیں۔

”کوئی آیا تھا کیا؟ دروازہ کھلا ہوا تھا؟“

”جی۔ شہرینہ آئی تھی۔“

”ارے۔ تو چلی کیوں گئی اتنی جلدی؟“

”پتا نہیں اماں! بھائی کے کمرے میں گئی پھر چلی گئی۔“

”حمزہ نے کچھ کہا اس سے؟“ نظر ہر سرسری اعزاز لیکن فاخرہ کی پریشانی سواتھی اور بیلا تک بڑی گئی۔

”مجھے کیا پتا اماں! میں جن میں گئی۔ آپ خود جا کر پوچھ لیں بھائی سے۔“ فاخرہ اسے ٹوکے ٹوکے رہ گئیں

اور دو کا شاپرے کر حمزہ کے کمرے میں آئیں تو وہ ہنوز آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

”لو بیٹا! ملے دو الے آئی تمہاری۔“ انہوں نے کہا تو حمزہ نے آنکھیں کھول دیں۔

”آپ کیوں گئیں اماں؟“

”تو بیٹا! اور کون ہے۔ بیلا کو تو بھیجے سے رہی اور ہاں، شہرینہ آئی تھی کیا؟“ اصل میں تو وہ بھی پوچھنا چاہتی

تھیں اور حمزہ جواب دینے کے بجائے الٹا پوچھنے لگی۔

”اسے میری طبیعت کا کس نے بتایا؟“

”پتا نہیں، میری تو بات نہیں ہوئی۔ ادھر سے فون آیا نہ میں نے کیا۔ خیر کیا کہہ رہی تھی؟“

”کچھ نہیں۔ بس طبیعت کا پوچھا۔“

”تو چلی کیوں گئی؟“

”کانچ سے آ رہی تھی۔ مگر میں نہیں بتایا ہو گا جب ہی فوراً چلی گئی۔“ اس نے کہا تو فاخرہ زچ ہو گئیں۔

”یہ تو تم اپنی طرف سے کہہ رہے ہو۔ یہ بتاؤ تم نے کیا کہا اس سے؟“

”اوہو اماں! میں کیوں کچھ کہوں گا۔ آپ خواہ خواہ نہ اپنی طرف سے باتیں فرض کر لیا کریں۔“ وہ ناراض

ہونے لگا تو اس کی طبیعت کے باعث فاخرہ نے خاموشی اختیار کر لی لیکن وہ مطمئن نہیں تھیں۔

شہرینہ کو کسی ایک پل قرائن نہیں تھا اور کسے ہو سکتا تھا۔ وہ شخص جو اس کی نس میں سایا تھا، وہ کیسے اس سے

دور جا رہا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ سوچیں بھی ایسی تھیں، کبھی سوچتی جا کر ریکا کا گلا دبا دے اور اتنا

ہی نہیں پھر اس کے ہاں باب کو وہ سناے کہ وہ اپنی مری بیٹی کا منہ دیکھنا گوارا نہ کریں۔ کبھی حمزہ کی شامت آتی

اور جب سوچتی وہ کچھ نہیں کرتی تو دل چاہتا کچھ کھا کر ہمیشہ کی نیند سو جائے۔

اس وقت وہ انتہائی بے قراری سارے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی کہ فاخرہ آ گئیں۔ وہ انہیں دیکھ کر رک کر

گئی لیکن ہمیشہ کے برعکس ان کی طرف بڑھی نہیں تھی۔ اصل میں اسے ان کی آمد سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کیونکہ وہ

اس طرح اکیلی تو بھی نہیں آتی تھیں۔

”کیسی ہو بیٹا؟ بھابھی جان کہاں ہیں؟“ فاخرہ نے قریب آ کر پوچھا تو اس نے کمرے کی طرف اشارہ

کر دیا۔ فاخرہ اسی طرف چلی گئیں۔ وہ ایسے ہی ان کے پیچھے دیکھ کر جاری تھی کہ اچانک اسے جھٹکا لگا تھا۔ فوراً

آگے بڑھی اور حمیدہ بیگم کے کمرے کے دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ منہ چاہتی تھی فاخرہ کیوں اور کیسے

آئی ہیں۔

”ارے بیٹھو فاخرہ! بیلا کہاں ہے؟“ حمیدہ بیگم کہہ رہی تھیں۔

”بیلا کو نہیں لایا بھابھی۔“ فاخرہ می آواز پر اس نے کان دروازے کے ساتھ لگا لیا۔

”کیوں؟“

”بس وہ آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔“ فاخرہ کا مجرمانہ سا انداز تھا۔

”ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے۔“

”وہ بھابھی.....“ فاخرہ کیا کہتیں ایک دم رونے لگیں۔

”ارے۔ خیر تو ہے..... سب ٹھیک ہے ناں..... فاخرہ..... ارے فاخرہ! بولو بھی۔“ حمیدہ بیگم ان کے

رونے سے قدرے پریشان ہو کر بے صبری ہو رہی تھیں۔ ”بتاؤ ناں فاخرہ؟“

”کیا بتاؤں بھابھی؟ مجھے حمزہ سے لڑائی نہیں تھی۔“ فاخرہ روتے ہوئے بولیں۔

<https://www.urdu tubes.com/>

”حمزہ! کیا ہوا ہے حمزہ نے؟“

”میرے سارے ارمان خاک میں ملا دیے۔ بگڑ گیا ہے، لالچی ہو گیا ہے۔ ایک دم اونچی چھلانگ لگتا

چاہتا ہے۔“ فاخرہ بولے چلی گئیں۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا فاخرہ! صاف صاف بتاؤ کیا ہوا ہے۔“ حمیدہ بیگم نے ٹوکا تو غالباً فاخرہ نے

باتھ جوڑے تھے۔

”مجھے معاف کر دوں بھابھی! خدا گواہ ہے میں ایسا نہیں چاہتی لیکن حمزہ میری نہیں سن رہا۔ وہ کسی امیر لڑکی

کے سادی کرنے جا رہا ہے۔“

”ہیں.....“ حمیدہ بیگم کو جھکا لگا تھا۔

”میں کیا کروں بھابھی! میں تو لٹ گئی۔“ فاخرہ اور شدت سے رونے لگیں تو وہ جو دروازے سے لگی کھڑی

تھی۔ وہ مزید برداشت نہیں کر سکی، تیزی سے اسے کمرے میں آ گئی۔ حمزہ پر جتنا غصہ تھا، فاخرہ پر اسی قدر ترس

آنے لگا۔ بے جاری نے ہو کی میں کس طرح زندگی گزار رہی تھی، حمزہ یہ سب کیوں نہیں سوچ رہا تھا۔

”میں نہیں جانتی ایک.....“

”میں تم لالچ میں آ گئے ہو۔ تمہیں ریکا نہیں اس کی دولت چاہیے۔ لالچی، مکار..... مجھے کیسی جھوٹی داستانیں

سناتے ہو۔ اللہ کرے تم.....“ وہ دل ہی دل میں حمزہ کو کوسے جا رہی تھی کہ حمیدہ بیگم کی آواز سن کر فوراً سوتی بن

گئی۔

”تم صبر کرو فاخرہ! شہرینہ کے لیے بھی کوئی نہیں ہے۔ میں نے تو سوچا تھا.....“ حمیدہ بیگم کی آواز دور

ہو گئی۔ غالباً فاخرہ کو گٹ تنک چھوڑنے جا رہی تھیں۔

”میرے لیے کی نہیں ہے یا مجھ میں کمی ہے۔“ اس کی آنکھوں کے کنارے سے آنسو روانی سے چھٹک کر

نکے میں جذب ہونے لگے۔

اور اب تک تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کسے حال دل سنائے۔ حمزہ کے بارے میں کیا کہے، وہ کیوں

اسے چھوڑ رہا ہے۔ بھلا کے بارے میں جو اس نے داستان سنائی تھی، اسے وہ زبان پر نہیں لاسکتی تھی اور اب اس

نے فاخرہ کی بات پر یقین کر لیا تو رات میں جب حمیدہ بیگم سو گئیں، اس نے خزینہ کو کال ملا دی جو ابھی ملائیشیا میں

تھی۔

”ارے، تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔“ ادھر سے خزینہ نے چھوٹے ہی کہا تو وہ چیخ کر بولی۔

”ہاں تم مڑے کرو، میری قسمت میں تو اب ریتجے ہی لکھے ہیں۔“

”ہیں ہیں..... کیا ہوا ہے؟“ خزینہ کھٹکی نہیں تھی۔ مذاق سمجھ کر کھٹکلائی تھی۔

”قیامت ٹوٹ گئی مجھ پر۔“ میں مراؤں گی خزی! مجھ سے یہ درد سہا نہیں جا رہا۔“ وہ رونے لگی تو اب خزینہ

طیبہ عتیقہ

جہاں تیرا دل لگا

<https://www.urdutubes.com/>

پریشان ہوئی تھی۔

”شہری! کیا ہوا ہے۔ امی ٹھیک ہیں؟“

”ہاں۔“

”پھر اور کیا بات ہوئی ہے؟“

”حمزہ نے بھگتی تو ڈی۔ وہ شادی کر رہا ہے۔“ وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے بولی تھی۔

”ہشت پاگل! مذاق کیا ہوگا اس نے تمہارے ساتھ۔“ خزی نے ٹوکا تو وہ پچکیاں لے کر کہنے لگی۔

”چچی جان تو مذاق نہیں کر سکتیں۔ وہ بے چاری بھی آج روتی ہوئی آئی تھیں۔ امی سے معافیاں مانگ رہی

تھیں کہ حمزہ پران کا بس نہیں چل رہا۔ خزی! حمزہ ایسا تو نہیں تھا۔“

”اچھا تم روتی مت۔“ خزی نے ٹوکا بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”تو اور کیا کروں، میرا دل پھنسا جا رہا ہے۔“

”پاکل مت بنو۔ میں ایک دو دن میں آ رہی ہوں۔ میں خود حمزہ سے بات کروں گی۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا،

سن رہی ہوں۔“

”ہاں۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ جب وہ چچی جان کی نہیں مان رہا تو.....“ شاید لائن کٹ گئی تھی۔ اس نے

کان سے ہٹا کر سیل فون دیکھا پھر ایک طرف رکھ کر نیچے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

دل کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس سٹم گر کی ایک ایک ادایا د آ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بہت اہتمام سے تیار ہو رہا تھا کیونکہ اسے حسان صاحب کے ہاں جانا تھا۔ کل جب اس نے انہیں فون

کر کے کہا کہ وہ ان سے ملنا چاہتا ہے تو انہوں نے آج شام کی چائے پر مدعو کر لیا تھا۔ اس نے دن میں ریپکا کو

کردیا تھا کہ وہ آج شام اس کے ڈیڑی سے ملنے آ رہا ہے تو ابھی یہ ساری تیاری اسی سلسلے میں تھی۔ لیکن اس نے

فاخرہ کو نہیں بتایا، صرف اس لیے کہ وہ بار بار انہیں اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ بہت خاموشی سے گھر سے

نکلا تھا۔ فاصلہ طویل تھا، جب ہی تقریباً گھنٹے بھر بعد وہ حسان صاحب سے مصافحہ کر رہا تھا۔

”بیٹھو.....“ حسان صاحب نے اپنے ساتھ والے صوفے کی طرف اشارہ کیا لیکن اس نے مقابل نشست

کا انتخاب کیا اور پھر ان کے سامنے گردن تان کر بیٹھا تھا۔

☆☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شام اللہ)

چکن اور آپ

اس ماہ اقرامتناز کو ”چکن اور آپ“ میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ادارے کی جانب سے اقرامتناز ماہ

کے لیے ”ماہنامہ کرن“ مفت دیا جا رہا ہے۔

عورتوں میں عمومی عادت کے مصداق کھسر پھسر جاری تھی، جہاں دلہن اور دولہا کی خوب صورت جوڑی پر رشک و حسد کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ وہیں دلہن اور دولہا کے لباس اور زیورات پہ بھی سب کی ایسی ہی ملی جلی کیفیات تھیں۔

دلہن کے چہرے پہ بہت حسین مسکراہٹ تھی اور ہوتی بھی کیوں نہیں، آخر کو سال بھر کی مٹکنی کے دوران سسرال کی طرف سے جس طرح نازاٹھائے گئے تھے وہ زل کی خود اعتمادی کو چار چاند لگا گئے تھے سب کزنز اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں اور کیوں نہ کرنیں، آخر کو وہ ایک مختصر فیملی کے اکلوتے بیٹے کی بیوی بن گئی تھی۔ دو بہنوں کا لاڈلا بھائی جاسم، بہنوں سے چھوٹا تھا۔ دونوں بہنیں خیر سے بیاہی ہوئی تھیں سسرال ساس کے نام پہ سسرال میں تین افراد ہی تو تھے جبکہ زل ایک بڑی فیملی کی لڑکی تھی اس کے خاندان میں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا جو زل کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

ہر وقت گھر میں پوری امارت کا سماں رہتا تھا۔ اس کے ابو کے چھ بھائیوں کی ہر سائز کی اولادیں تھیں۔ ہر وقت کسی نہ کسی کا مہمان آیا رہتا تھا، اوپر سے چار پھیلیاں جو بات بات پہ مکے میں ڈیرا لگانے کو تیار رہتی تھیں، اسی لیے اسے گھر مگر اور بھائیوں کے گھر بچوں سمیت موجود رہتی تھیں۔ اس ماحول میں اس کا گریجویشن کر لینا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

لڑکا نارمل سی شکل و صورت کا تھا بہت زیادہ وجاہت کی متمنی تو زل بھی نہیں تھی لیکن بہت سے رشتوں میں سے اس رشتے پہ سب نے برابر اتفاق کیا تھا کہ جاسم کی شرافت ہر ایک کو گرویدہ کر گئی تھی یوں یہ شادی خالصتاً رائج میرن تھی۔

جاسم نے زل کو اور زل نے جاسم کو ایک بار دیکھ لیا تھا جو سب کی مرضی سے طے ہوا تھا کہ شرعی اعتبار سے ایک نظر لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو بہتر ہے۔

زل اس گھرانے کی سب سے بڑی اولاد تھی اور اس کے قریبی سارے کزنز، اس سے چھوٹے

تھے۔ یوں بہت ہی خوب صورت انداز میں اس کی مٹکنی جاسم کے سنگ ہو گئی تھی۔

سال بھر کی اس مٹکنی میں عید شب برات جہاں اس کے لیے سسرال سے قیمتی تحائف کا تبادلہ ہوتا رہا، وہیں اس کا سامنا بھی جاسم سے ان ہی مواقع پہ ہوتا۔ اماں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ زل کے گھر

میں شادی سے پہلے ان سے بات کرنا یا اس کے ملنے کی بالکل اجازت نہیں ہے اور اماں نے اسے بھی اس بات کی تنبیہ کی تھی کہ وہ ایسا کچھ نہ کرے جو کہ دو سال

سے جیسی بھوکی ان کو تلاش تھی وہ خدا خدا کر کے زل کی صورت انہیں دستیاب ہوئی تھی اور وہ اب کسی قیمت پہ اس سے دست برداری اختیار کرنے کا تصور بھی نہیں کر

سکتی تھیں اور اماں کی اس خواہش پہ ڈٹ جانے کی جاسم کو جو قیمت چکانا پڑی تھی وہ صرف جاسم جانتا تھا۔

چاہتے ہوئے بھی جاسم اس محفل سے جانیں سلکا تھا لیکن وہی جانتا تھا اس وقت وہ کس مشکل سے

گزر رہا تھا ایک ہی وقت میں وہ موجود بھی تھا اور غیر موجود بھی، جب بھی اسے پکار کوئی سلائی کی رسم ہوا

کرتا تو جبراً اسے مسکراتا پڑتا، وہ کوشش کر رہا تھا اپنی اضطرابی کیفیت پہ قابو پانے کی لیکن شاید نا کام ہو رہا

تھا۔ تب ہی کچھ جھانپتے نظروں سے اس کی پریشانی چھپانے نہیں چھپ رہی تھی۔

بہترین کھانا، خوب صورت ڈیکوریشن، بے پناہ عالی شان بینکونٹ ہال اور دلہن والوں کی طرف سے بے انتہا پذیرائی، قیمتی جہیز سے گھر بھر گیا تھا دلہن

ایک کہ آنکھیں خیر ہو جائیں اور جاسم کو سلائی میں گاڑی تک ملی تھی پھر کیا تھا جو وہ یوں مضطرب تھا۔

☆ ☆ ☆

جملہ عروسی میں نئے نئے پردے، فرنیچر، پھولوں کی سجائو کے علاوہ بیڈ سے دروازے تک گلابوں کی پتیاں ہی پتیاں تھیں جن پہ کچھ سیر دھری نازک سی زل نے آس پاس بکھری خوب صورتی کو محسوس کیا، رخصتی کے بعد اس کا واسطہ کوئی لمبی جوڑی رسموں سے نہیں پڑا تھا اس لیے جلد ہی اس کی نندوں نے اسے

کمرے تک پہنچا دیا تھا سچ یہ سچے سفید پھولوں، گلابوں میں اس کے پرنیوم اور مہندی کی خوشبو نے مل کر عجیب سرور بھرا دیا تھا، اس نے اپنے بھاری لہنگے کو بیڈ پہ پھیلا دیا اور اپنے جہیز کے بھاری بھر کم قیمتی بیڈ کی سنہری بیک سے سر نکال لیا اسے انتظار تھا کہ اب وہ ساری باتیں جو وہ دل میں لیے مٹکنی کا دور گزار آئی تھی اب وہ تمام باتیں جاسم کے ساتھ جی بھر کرے گی۔

جاسم کے آنے کی آہیں سن کر وہ سدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ بکھری دیر تک باہر کھڑی رہی مگر اسے یہ معلوم

تھا کہ اندر اس کی پر یوں جیسی بیوی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

وہ دھیرے دھیرے چلا ہوا بیڈ کے قریب آیا تو بچی سوائی زل کے معصوم حسن نے اسے اپنی طرف

میں بٹھول کر لیا وہ بے اختیار بیڈ سے اس کے سامنے بیٹھ گیا اور دیر سے بے زل کا ہاتھ اپنی ٹانگی پہ رکھا تو کچھ یاد

آنے پہ شہزادی کی جب سے دل کی کھل کی بجلی ڈبیہ نکالی اسے گھول کر اس میں موجود خوب صورت انگلی کو

نکلنے لگا تو ایک دم جیسے وہ زل کے حسن کے جادو سے باہر نکل آیا انگلی پہنانے کے بجائے اس نے زل کے

چہرے کے پاس گرا دی اور اٹھ کر اپنے پاؤں کمرے سے ہی نکل آیا۔ زل ہکا بکا ہو کر کبھی انگلی کو دیکھتی تو کبھی

کھلے دروازے کی جانب جہاں سے ابھی ابھی سروس مت جاسم عجیب انداز میں نکل کر گیا تھا پل رات

کے فوس خیز لمحات دھیرے دھیرے سینتے جا رہے تھے اور زل حیران و پریشان ہوتے ہوتے اب رونے لگی تھی

روتے روتے کب سچ ہوئی اور کب صبح کے وقت اس کی آنکھ لگی اسے پتا بھی نہیں چلا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دروازے پہ کی جانے والی دستک پہنچوڑی دیکھ کر اسے یاد بھی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور رات کو کیا ہوا لیکن اگلے ہی لمحے اس کی نظر بیڈ پہ دائیں جانب لیٹے جاسم پہ پڑی تو اس نے

دھیرے سے اس کا کندھا ہلایا جاسم گہری نیند میں نہیں تھا جاگ گیا تو اس نے دروازے پہ وقفے وقفے سے جاری دستک کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ دروازہ کھول دیں میں واش روم میں جا رہی ہوں۔“ رات کو جو بھی ہوا تھا اس کے پیچھے جو بھی راز تھا بہر حال وہ اپنا تماشا نہیں بنونا چاہتی تھی اس لیے اس نے لہنگا سمیٹا اور واش روم کی طرف بڑھ گئی کوئی کیا سوچے گا اسے رات والے دلہن کے روپ میں دیکھ کر جبکہ جاسم تو نہ جانے کب کمرے میں آکر اسے کپڑے بدل کر سو گیا تھا شاید کونہی۔ وہ سوچتی ہوئی آنکھوں پہ پانی کے چھینٹے ڈالنے لگی جو رونے اور جاگنے کی وجہ سے سوچتی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

شام کو ولیمہ کی تقریب مارگہ کی پہاڑیوں کے درمیان عالی شان ہوٹل میں منعقد تھی اور سب جی بھر

کے اس شادی کی یادگار تقریبات کی تعریف کر رہے تھے۔ زل کے سارے خاندان کے چہروں پہ خیریت مسکراہٹ تھی اور زل کے والدین تو پھولے نہیں سا

رہے تھے کل کی نسبت آج جاسم نے اپنے آپ پہ قابو پالیا تھا لیکن بے انتہا خوب صورت میک اپ اور بے

پناہ ہنگے اور خوب صورت لہنگے اور بے شمار جیوری کے باوجود زل کچھ بھی سمجھی ہی تھی اس کی کزنز اس سے چھیڑ

چھاڑ کر رہی تھیں تو وہ زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پہ سجا کر نہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی نہ چاہتے

ہوئے بھی وہ انگلی جو کل جاسم اسے پہنانے کے بجائے اس کے قدموں کی نذر کر گیا تھا اس نے اسی لیے

اپنی انگلی میں پہن کی تھی کہ وہ جانتی تھی سب اس سے منہ دکھائی کے تحفے کے لیے لازمی پوچھیں گے۔

سب جاسم کی پسند کی تعریف کر رہی تھیں انگلی بہت ہی نازک و نئیس تھی اس میں لگے ڈائمنڈ کی

چمک ہر چیز پہ حاوی ہو رہی تھی، اس کی چمک میں ہی زل کے آنسو بھی چھپ رہے تھے شاید۔

☆☆☆

”ایک اجنبیت کی دیوار ہے سامعہ ہم دونوں کے درمیان جو بٹ ہی نہیں پار رہی ہے۔“ آج اس نے دل کڑا کر کے اپنی قریبی دوست سے فون پہ بات کی۔

”کیا تم دونوں بھی اسی طرح رہ رہے ہو سامعہ؟“ ساری تعصبات سن کر سامعہ کو شدید جھٹکا لگا۔

”نہیں یار! شادی کے ان دنوں میں تو احمد مجھے اپنی نظروں سے اوجھل ہی نہیں ہونے دیتے تھے حتیٰ کہ جہاں جہاں میں جانی وہ بھی میرے پیچھے ہی رہتے تھے بعض اوقات تو میری ساس کو بھی برا لگتا تھا کہ لڑکا بیوی کے پیچھے دیوانہ بنی ہو گیا ہے، اور تو اور مجھے میکے رکنے نہیں دیتے اب تک۔ روزانہ گجرے لانا خود اسنے ہاتھوں سے پہنانا اور جب میں تیار ہوتی تھی تو جتنی مرضی دیتی وہ میرے سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ کر مجھے دیکھتے رہتے تھے کئی بار تو میں اتنا شرمابی کہ انہیں جھٹکا کر کرے سے نکلتی لیکن وہ پھر بہانے سے آمو جوڑ ہوتے تھے۔ اب دو سال بعد رات دیوانی تو نہیں ہے لیکن اب بھی وہ گھر آتے ہی مجھے ڈھونڈتے ہیں اور جب تک ہاتھوں کا ہار نہ بنالیں تب تک فریٹش بھی نہیں ہوتے۔“ سامعہ آگے بڑھی کچھ کہی لیکن بیکار کر گئی۔

”تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کچھ تو ہے جو غلط ہے سامعہ! جاسم کا رویہ بس، ایسا ہے جیسے ہم روم میٹ ہوں بس حقوق زوجیت کا رشتہ ہے ہم دونوں کے درمیان ہے بانی دواہ سے ہم اچھی ہیں اتنے ہی جتنے منگنی کے وقت تھے مجھے نہیں پتا جاسم کو کیا ہوا؟“ اس نے سر آدھ بھری تو دوسری جانب سامعہ کو بھی تشویش ہوئی۔

”کوئی نفسیاتی گڑھ ہے تم کو کمبختوں کرتی ہو زل؟“ ”ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو منگنی کے وقت جاسم کی طرف سے کارڈ، تحفے، چاکلیٹ، آنکھوں میں اشتیاق کا جہان آباد رہتا تھا۔“ وہ رو دینے والی ہو رہی تھی۔ ”تم پھر سوچو منگنی سے شادی تک کے عرصہ میں کچھ تو ایسا ہوا ہے جس نے جاسم کو بدل دیا تم اکیلے میں سوچو کہاں یہ غلط ہوا، یا پھر خدا ناخواستہ کوئی اور لڑکی.....“ سامعہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

زل نے فون بند کر دیا اور سوچنے لگی کہ کیا ہوا ہوگا، جس نے جاسم کو بدل ڈالا۔

☆☆☆

”سنیے!“ جاسم نے زل کی جانب غور سے دیکھا اگر وہ اسے خول میں بند تھا تو زل نے بھی کبھی اسے چھپنے کی کوشش نہیں کی تھی پھر کیا تھا جو وہ آج اس کو اتنے استحقاق سے مخاطب کر رہی تھی۔

اس نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا، گویا پوچھ رہا ہو کیا کہنا ہے۔

”آنکھوں سے کہنے کے بجائے آپ مجھے منہ سے بھی پوچھ سکتے تھے۔“ زل روہا لسی ہو گئی اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

”بولو کیا کہنا ہے تمہیں مجھ سے؟ میرے خیال میں میں نے تمہاری ساری ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے میں کوئی کمی نہیں رکھی ہے پھر بھی اگر تمہیں مجھ سے کوئی گلہ ہے یا کسی محسوس ہوتی ہے تو وہ بھی بتا دو۔“ اس کے لہجے میں صدیوں کی تسکین تھی جیسے لیے سفر کا مسافر منزل کے درمیان راستہ بھول بیٹھا ہو۔

اسے پہلی بار لگا کہ جاسم پریشان ہے لیکن آخر کس بات سے؟

”جاسم ہم کہیں مٹی منوں کے لیے نہیں گئے ہیں سب مجھ سے پوچھ رہے تھے تم لوگ سیر کے لیے نہیں گئے آپ کی اماں نے بھی کہا ہے کہ انہوں نے تو آپ سے کہا تھا جانے کے لیے لیکن آپ نے منع کر دیا کہ ضروری نہیں ہے۔“

”ہاں! میں نہیں سمجھتا کہ یہ ضروری ہے اور اگلے ہفتے سے میں اتوار کو بھی گھر میں نہیں رہ سکوں گا۔ نہ ہی عام دنوں کی طرح شام کو جلد گھر آؤں گا۔“ جاسم نے سر دھجے میں اسے اطلاع دی۔

”لیکن کیوں؟ کہاں جایا کریں گے آپ؟“

”کچھ مسئلے مردوں کو خود حل کرنے ہوتے ہیں اس کے لیے ضروری نہیں کہ عورتوں کو بھی پریشان کیا جائے یا لازمی ہو کہ ہر بات انہیں بتائی جائے۔ تمہارے لیے اتنا کافی ہے کہ میں تمہاری کسی ضرورت سے غافل نہیں ہوں بہت جلد شاید سیر کے لیے بھی لے جاؤں گا ان شاء اللہ۔ اب سو جاؤ۔“ آگے بڑھ کر لپک لپک لائٹ بھی جاسم نے

بند کردی اور کڑوٹ بدل کر لٹ گیا۔

اس کے رویے پر زل دیر تک تکیہ بگھوتی رہی لیکن اس بے دردی کی بے خبری پہ جی بھر کے غصہ بھی آیا لیکن خاموشی سے اُسو بہانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

شادی کے نو ماہ بعد بھی وہ دونوں دوست نہ بن سکے تھے نہ ہی وہ جان پائی تھی کہ آخر کیا وجہ ہے جو جاسم آج بھی سرد مہر ہے۔

ان دنوں زل کی زندگی میں ایک عجیب سا غلطہ اٹھا۔ اس کی سب سے قریبی سہیلی، جاسم کے نو آنے سے منفرد کر لی گئی تھی۔ اس نے اپنی خاصی رقم دے دی تھی تقریب کی شاپنگ اور لین دین کے لیے۔ وہ جانتی تھی جاسم کی مصروفیات کہ وہ رات کو گیارہ بارہ بجے سے پہلے گھر نہیں آ پاتا تھا اور چھٹی کے دن بھی اسے شام کو جانا ہوتا تھا۔ سہ ماہ میں سب اچھے تھے ننہیں بہت کم مکے آتی تھیں اور ساس مسر بہت محبت کرنے والے تھے بس جاسم میں والہانہ بین نہیں رہا تھا۔ اس نے بھی کوہنٹا تو نہیں چھوڑا تھا بس بھجوتا کر لیا تھا۔

وہ میکے میں داخل ہوئی تو ویسی ہی رونق تھی جیسی اس کی منگنی پر ہر طرف تھی لڑکے کی تصویر وہ دیکھ چکی تھی بہت ہی سادہ اور سلی زندگی کو پرسکون دیکھ کر غیرہ کے لیے بھی دلچسپی گھرائی گھر اندر دیکھا گیا تھا۔ لڑکا اپنے والدین کی اکلونی اولاد تھا نہ کوئی بہن نہ بھائی۔

وہ سب گھر کو سجا کر اب تک سک سے تیار تھے۔ لڑکے کے لیے تحائف کا ڈھیر تھا بالکل ویسے ہی جیسے جاسم کے لیے سب لائے تھے۔ وہ خاموشی سے بیٹھی دیکھ رہی تھی تو اسے احساس ہوا کہ بڑی فیملی بھی ایک نعمت ہے، بے شک چھوٹی فیملی میں سکون زیادہ مسائل کم ہوتے ہیں لیکن کیا اس کی مندوں کی شادی میں بھی اسی طرح رونق ہوتی ہوگی جتنی کہ اس کے میکے میں لڑکی کی منگنی پہ تھی۔ ہرگز نہیں وہ تو شادیوں کی مودی بھی دیکھ چکی تھی بہت ہی سادگی اور خاموشی سے شادیاں کی گئی تھیں مختصر مہمانوں کے ساتھ گھر میں ہی مایوں کیا بارات بھی آگئی تھی۔ لڑکے والوں کے آنے کا شورا تھا تو وہ بھی نوٹوں والا ہار اور گلاب کی پتیوں والی پلیٹ اٹھا کر

☆☆☆

انھی سامنے سے آتے تین لوگوں کو دیکھ کر آج پہلی بار اسے بہت عجیب لگا لیکن سر جھٹک کر آگے بڑھ کر استقبال میں مشغول ہو گئی۔

☆☆☆

تقریب بہت جلد اختتام پذیر ہو گئی تھی چچی کا موڈ سخت آف لگ رہا تھا وہ ایک ایک کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ بڑی چچی ابھندھیں کہ منگنی تو زل جانی گئی بڑے پچا اور زل کے ابو کو یہ نامناسب لگ رہا تھا۔

”منگنی کی حیثیت ہی کیا ہے، شرعی طور پر تو کچھ بھی نہیں ہے بھائی صاحب۔“ بڑی چچی نے ابو کو ہموایا جابا۔

”بھائی! بات منگنی کی شرعی حیثیت کی نہیں ہے زبان کی ہے..... دعا کی ہے..... یہ سب تو منگنی سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“

”منگنی یہ ایک ٹوکرا منگنی کا، ایک جوڑا، اور ایک سونے کا چھلکا سی انگوٹھی لاکر وہ لوگ یہ بھی جتا رہے ہیں کہ ہم نے تو یہ بھی آپ کے لیے کیا ہے ورنہ ہم اس رسم درواج کے قائل ہی نہیں، اب یہ بھی کوئی بات تھی جو بڑی بی بی نے کر ڈالی۔“ چچی نے منہ بورتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بشرہ! دیکھیں تو ہمارے تو گفت ہی ہزاروں کے تھے۔ بچے بچے نے بھی دیے کھانا الگ اتنا سارا بنوایا، اوپر سے لڑکے کے لیے ہیرے کی انگوٹھی چار جوڑے وہ بھی برانڈڈ، کچھ اندازہ ہے صرف منگنی پہ ہی کتنا کچھ کیا ہم نے اور ان لوگوں نے تو منگنی کو ڈھنگی بنادیا۔“ زل کی امی نے بھی چچی کی حمایت میں تاہو توڑ حسلے کیے۔

”جیلہ خانم! یہ سب آپ نے اپنی مرضی سے کیا۔ آپ کو ان لوگوں نے یہ سب کرنے کو نہیں کہا تھا۔“ ابو نے امی کو احساس دلایا۔

”نہ جی! میں نے تو پھر آگے کی باتیں بھی کر لیں کہ ابھی سب بات صاف ہو جائے ہم بیٹی کو اتنا زیادہ جہیز دیں گے تو ان کو بھی پچاس تو لے سونا ڈالنا ہوگا۔ زل کے لہنگے لاکھوں کے تھے تو غیرہ کے سرایوں کو تو اس سے بڑھ کر کرنا ہوگا۔ بڑے ہوٹل

میں ولیمہ ہوگا ہم بھی تو بارات برداشت کریں گے تا بڑے ہونے میں۔ انہوں نے دوسرے سے انکار کر دیا۔ بڑے میاں بولے ہم شادی بہت سادگی سے کریں گے۔ جتنی ہماری توفیق ہوگی اتنا ہی خرچ کریں گے، یہ بھی کوئی بات ہے۔ مجھے نہیں کرنی ان لوگوں میں غیرہ کی شادی، سب سن لیں۔“ غیرہ جو زل کے پاس ساکت بیٹھی تھی اٹھ کر آنسو روکتی اندر کو بھاگی۔

”دیکھو نیگم! ان کی بات بھی ٹھیک ہے ہم اگر اتنا زیادہ خرچ کرتے ہیں تو اپنی مرضی سے کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے تو مجھ سے بھی منع کر دیا تھا اور ہم یہ یہ چیزیں اس لیے بوجھ نہیں بنتی ہیں کہ ہم سارے بہن بھائی شادی کا خرچ مل کر کرتے ہیں بانٹ لیتے ہیں آپس میں۔ آپ کو یاد تو ہوگا زل کی دفعہ ہم نے عیدیاں بھی اسی طرح شاندار بھیجی تھیں کیونکہ ہم جوائنٹ فیکلٹی میں یہ سب مل کر کر لیتے ہیں جبکہ وہ لوگ اپنے اوپر انحصار کر کے جو کر سکتے ہیں کریں گے۔“

چچانے دھڑے سے چچی کو سمجھایا۔

”لیکن زل کے سسرال والے بھی تو مختصر فیکلٹی کے لوگ تھے انہوں نے تو سب کام ہماری مرضی کے مطابق کر دیے تھے۔“ چچی نے احتجاج کیا۔

”آپ بھول رہی ہیں بھائی کے سونے کی بات یہ زل کے سسر بھی پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے چچی کہا تھا کہ ہمارے پاس اتنا نہیں ہے۔ وہ تو اس وقت جمیل خانم نے ہم سے بالائی بالا جاسم کی اماں کو دھکی دے دی تھی کہ ہم رشتہ توڑ دیں گے تو وہ بے جاری ہر خرچ کے لیے تیار ہو گئی تھیں اور تو اور پارلر کے بھی ساتھ ہزار دے ڈالے تھے تب ہی تو جاسم اب قرضے کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ خود دار ہے میری مدد بھی نہیں لینا چاہتا ہے حالانکہ میں نے خود اسے آفر کی تھی۔ ہمیں اب ہوش سے کام لینا چاہیے، ہمیشہ لڑکی والے ہی مظلومیت کا رونا روتے ہیں کبھی نہیں دیکھتے کہ اکثر لڑکے والوں یہ بھی بوجھ ڈال دیا جاتا ہے اور یہ فضول کی رسومات کا بھی اب میں خاتمہ چاہتا ہوں۔ میں اپنا باقی بیٹوں کی دفعہ بہت

سادگی سے نکاح کروں گا بس۔“ ابو جان بولتے جا رہے تھے اور زل کو لگ رہا تھا اس کی آنکھوں پہ بڑے سارے پردے چاک ہوتے جا رہے ہیں وہ ایک دم گھمی۔

”اماں میرا سارا زور آپ کے پاس ہے نا وہ مجھے دیں اور ابو پلیز مجھے آپ کی ضرورت ہے میری مدد کر دیں۔“ آج وہ گڑ گڑاتی۔

وہ کب سے فالگوں میں سرکھپا رہا تھا گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے اس کا دھیان روز کی طرح زل کی طرف چلا گیا۔ وہ روزانہ اس کے لیے دیر رات تک بھوکا رہتی تھی آج شاید تقریب میں کچھ کھایا ہوگا، میں کیا کروں کہ اپنے آپ کو نامل کر سکوں پہلے کی طرح، جسے میں مگنی کے وقت تھا کتنی پیاری تھی مجھے زل، راتوں کی نیندیں اڑادی تھیں اس نے اور اب جب وہ میرے پاس ہے میری بن کر تو میں اس کو وہ محبت کیوں نہیں دے پا رہا ہوں جو میرے دل میں اس کے لیے ٹھانھیں مارتا سمندر تھی..... یہ سمندر آکس برگ کیوں بن گیا..... میرے احساسات یہ برف کیوں جم کر ہے۔ روز ارادہ کرتا ہوں اسے اپنی پریشانی بتا کر معافی مانگ لوں گا جو ہوا اس میں اس کا کیا قصور؟ اماں بھی تو برابر کی قصوروار ہیں ان کو بھی تو ہر حالت میں یہ امیر خاندان کی خوب صورت لڑکی بچا لگی تھی اور ان کے دیے تحائف پہ تو وہ شاد ہو جاتی تھیں، بہتی تھیں۔

”کتنے قدر دان ہوں گے داماد کے جو ہر موقع پہ اتنا کچھ کرتے ہیں۔“

اس نے درد کرتی کپٹی پہ ہاتھ رکھا اور کرسی پہ جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اور میں بھی تو زل کے علاوہ کسی کو تصور میں بھی نہ لاسکتا تھا اگر وہ مجھ سے چھن جاتی تو میں کیا کرتا؟ اس نے خود سے سوال کیا، ہرگز نہیں میں اس کو نہیں کھوسکتا تھا، نہ اب اسے تکلیف دے سکتا ہوں

بہت جلد یہ لاکھوں کے ہی سہی میں قرض اتار دوں گا پھر مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی پھر میں اپنی زل کے لیے وہی جاسم بنوں گا جس سے اسے محبت کا والہانہ اظہار چاہیے،

نہیں میں آج ہی اسے سب بتا کر معافی مانگ لوں گا، غلطی اس کی نہیں ہے ہماری بھی ہے ہمیں شروع میں ہی اس کے ابو سے بات کر لینی چاہیے تھی۔ اب وہ

وہ گھر میں داخل ہوا تو خلاف معمول سب ہی جاگ رہے تھے اسے حیرانی کے ساتھ پریشانی بھی ہوئی سب لاؤنج میں جمع تھے ایک کونے میں زل کے ابو اور اسی ہی موجود تھیں، اس نے سلام کیا تو دونوں بڑھ کر اسے ملے۔ اس نے کونے میں کھڑی زل کی طرف دیکھا وہ ملٹی ٹکڑے کا مدانی سوٹ میں قیامت لگ رہی تھی۔ زل بھی اسی کی طرف متوجہ تھی اس کی آنکھوں میں اپنے لیے مگنی کے وقت والے رنگ دیکھ کر زل کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی نے ڈیرے ڈال لیے۔

”لاؤنج کی درجائی میز پر بڑے برف کیس کو زل کے ابو نے اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ لو بیٹا اسارانا نہ کہی بہت سا بوجھ ان پیسوں سے تمہارے کندھوں سے ہٹ جائے گا۔“

جاسم نے ہاتھ اس طرح پیچھے کیے جیسے کرنٹ لگا ہو۔

”ابو! میں نے پہلے بھی کہا تھا میں خود سب کر لوں گا میں کسی کا بھی احسان نہیں.....“

”یہ کسی کا احسان نہیں ہے جاسم! یہ زور بیچ کر میں نے پیسے لیے ہیں جو آپ کی کمائی سے تھے آپ نے میرے دن کو خاص بنایا آپ کا شکریہ، اب میں آپ کی زندگی کا حصہ ہوں آپ کی پریشانی، دکھ، ہنسی، خوشی ہر چیز کا حصہ ہوں میری خوشی اسی میں ہے کہ میں آپ کی پریشانی بننے کے بجائے پریشانی کو دور کر دوں۔“

جاسم نے اپنے ابا کی طرف دیکھا تو انہوں نے آنکھوں سے اس کو سمجھایا کہ اسے سب کی بات مان لینی

چاہیے اس نے برف کیس کو اٹھا کر زل کو پکڑ لیا۔

”اسے تم سنجال کر رکھو، کل ہی میں قرض ادا کر دوں گا۔“ سب نے مسکرا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا زل کے والدین نے رخصت کی اجازت چاہی۔ رات بہت ہو چکی تھی ان کے رخصت ہونے کے بعد جاسم اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

شرمیلی مسکان چہرے پہ لیے وہ جاسم کے مد مقابل تھی اس کی نرم کلنیاں جاسم کے مضبوط اور گرم ہاتھوں میں تھیں۔ ابھی انہی جاسم نے اپنے لیپ ٹاپ کے بیگ میں چھپائے گجرے اس کی کلنیاں میں پہنائے تھے۔ وہ سنہری پلکوں کی چلن اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرتی تھی اور نا کام ہو کر شرم سے دوبارہ پلکیں گرا لیتی تھی۔

”پلکیں پلیز جانے دیں بھوک لگی ہے، کھانا کھاتے ہیں۔“ وہ اس کی گرفت میں کسمائی تھی۔

”کیا مطلب تم نے مگنی میں کھانا نہیں کھایا؟“ وہ حیران ہوا۔

”کیسے کھاتی آپ کے بغیر؟“ اس نے محسوسیت سے جاسم کو دیکھا، وہ اس کی اداسی بھاری اور اس کے گرد بازوؤں کی گرفت ڈھکی کی تو وہ فوراً بھاگ کر کمرے سے نکلی اور کچن میں جا کر اپنے دھڑکنے والے دل کی رفتار کو قابو میں کرنے لگی تو پیچھے سے جاسم نے ایک خوبصورت شرارت کر ڈالی۔

”ایش، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ روز کی طرح ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھیں۔ میں کھانا لاتی ہوں۔“

اس نے شاکی لہجہ میں کہا۔

”نہ جی، اب آپ جہاں ہم وہاں۔“ وہ کہہ کر زور سے ہنسا تو زل نے اس کی ہنسی میں اپنی بے ساختہ ہنسی ملا دی۔ دونوں کی ہنسی میں جہان بھر کے زور و جہاں قربان ہو رہے تھے اور پھولوں کے گچروں کی خوشبو سونے کے کنگنوں کو مات دینے پہ تلی تھی۔

زندگی اس طرح مسکراتی ہے۔

☆☆☆

منشا محسن علی

ابا کی صفی گل

میں نے سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے اس تین منزلہ گھر کو برسی بارش میں بڑی شان سے کھڑے دیکھا ہے۔ چار سال اور چھ ماہ کے طویل عرصے، جگہوں کو کتنی جلدی ہوتی ہے بدلنے کی۔ اپنی ہیئت تبدیل کر کے نئے رنگ میں ڈھلنے کی..... بس انسان ہی نہیں بدل پاتا (شاید میں یہاں کچھ غلط ہوں کیونکہ انسان تو عمارتوں سے بھی جلدی رنگ بدل لیتے ہیں)۔

اگر کوئی نہیں کوئی بدل پایا تو وہ میں ہوں۔ ابا کی بیٹی صفی گل..... میں برسی بارش میں اپنے سامان کے ساتھ کھڑی بیگ رہی ہوں۔ بارش اور آنسوؤں کا پانی ایک ساتھ مل سا گیا ہے۔ میرے اوپر کوٹ گی جیبنیں تک پانی سے بھر گئی ہیں۔ وہ نیم والی گلی جو سرخ اکھڑی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی، اب پختہ ہو چکی ہے۔ جانے بارشوں کے پانیوں میں کاغذ کی کشتیاں بنانے والے کہاں کم ہو گئے ہیں؟ (چار سالوں میں بچپن کا رنگ تو نہیں بدل جاتا۔)

وہ ہمارا سرخ اینٹوں والا گھر جس کی دیواروں کے ساتھ بارگھار کے پتھر لگے ہوئے تھے، اب نہیں ہے۔ مور پتھر کی قطاریں بھی ختم ہو چکی ہیں۔ گلابوں کے وہ چھنڈ بھی ان مناظر میں نہیں ہیں جن میں ہم پھولوں کی بوھوتری کے لیے انڈے کے چھلکے پیس کر ڈالا کرتی تھیں۔ اکثر چھوٹی دیوار کے ساتھ راحیلہ اور زینت ساتھ ساتھ بیٹھی اپنے بالوں کی چوٹیاں پتار ہی ہوتی تھیں۔ اب ان دیواروں کی جگہ باڑیں لی گئیں

کبھی بھی دوسروں کو ناراض کرنا نہیں آیا۔ کاش میں کر سکتی، ابا کے حقے تازہ کرنے سے لے کر اماں کی چوٹی بنانے تک۔ باورچی خانے کی ساری ذمہ داری بھی میرے سر تھی۔ وال دلیہ سے لے کر چار مغز تک۔ گھر کے سارے افراد کہیں بھی کسی بھی وقت کم ہو سکتے تھے اور جس دن میں ”گم“ ہوتی تھی سب کے کام رک جاتے تھے۔ ابا کا حقہ پڑا رہتا، اماں سرسوں کے تیل سے لے کر.....
راحیلہ اور زینت بچے کی کتابیں اٹھا لے کر تصویریں

بنانے کو میری منتظر بیٹھی ہوتی تھیں۔ پرکار اور پیمانے میرے علاوہ کسی کے ہاتھ میں بھی نہیں چلتے تھے۔ رنگ میری پوروں پر کھیلے تھے، بھائیوں کی پٹریوں اور گرتوں میں کلف صرف میں ہی لگا سکتی تھی۔ ان کے دوستوں کی دعوتیں اور لوازمات کی تیاری میرے ذمے ہوتی تھی۔

میں نے ہر گرم جون اور سرد ستمبر میں موسموں سے بے پروا ہو کر کام کیا تھا۔ سینے پسنے ہوتے یا سردی سے تھر تھر کانپتے، برتنوں کے ڈھیر دھوتے اور

کلمہ طبع

(مجھ سے میری یادیں اور آنسو نہیں سنبھالے جا سکتے، ایک وقت یہ دونوں چیزیں کتنی ہلکی اور سستی ہو جاتی ہیں ناں)۔ میرے ہنڈ بیک کا بوجھ بڑھنے لگا ہے۔ طویل کلمے برآمدے کی جگہ اب پورچ نے لے لی ہے۔

میرے بھائی مرسیڈز کے مالک بن گئے ہیں اور میں.....؟ آج بھی خالی ہاتھ ہوں کسی بھی بینک بیلنس کے بغیر (کیا انسان کی شناخت صرف بینک بیلنس ہوتی ہے..... آہ نہیں)۔

پورچ اور ٹیرس کی روشنیاں بارش میں لگ رہی ہیں۔ بھی میں ایسی ہی بارشوں کی دیوانی ہو کر رہی تھی جب زرد پتے بلبلوں کی روشنی میں اکٹھے ہوتے اور جل کر مر جاتے تھے۔ تب میں، راحیلہ اور زینت کے ساتھ مل کر بیٹھی مٹی میں کڑھے کھود کر انہیں دبایا کرتی تھی۔ (اپنے آپ کو زندہ دفن کرنا کبھی آسان کیوں نہیں ہوتا)۔ بارش تیز اور تیز ہوتی جا رہی ہے۔

سب بدل گیا، سب کچھ۔ صرف ”صفی گل“ نہیں بدلی۔ میں ویسی کی ویسی ہی ہوں، ابا کی فرماں بردار..... دوسروں کو ہمیشہ خوش رکھنے والی، میں نے کبھی کچھ ”اپنے“ لیے نہیں کیا۔ میں کبھی بھی خود غرض نہیں بن سکی۔

ابا کی ہم چھ اولادیں تھیں۔ میں، راحیلہ، زینت، اصغر بھائی، اکبر اور افضل سارے گھر میں سب سے بے ضرر وجود میرا ہی تھا۔ جانے کیوں مجھے

جب سب سو رہے ہوتے تھے، نیند کے مزے لے رہے ہوتے تھے، میں دوپٹا کمر سے باندھے کاموں میں جتنی ہوئی ہوتی تھی۔ (میں کبھی بھی کسی کے لیے انسان نہیں رہی، شاید یہاں پھر میں غلط ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو انسان نہیں سمجھا)۔

آج چار سال بعد یادیں میرے حواسوں کی چٹخیاں گرانے پر تلی ہوئی ہیں۔ پوری کی روشنی پر کھڑے کھڑے میں ماضی کا سفر کر آئی ہوں۔ اس سفر کی وجہ اور میری واپسی کی وجوہات ایک جیسی ہیں۔ وہ سارے خطوط میرے ہینڈ بک میں محفوظ ہیں جو صرف میرے لیے، میری واپسی کے لیے لکھے گئے ہیں مستقل مزاجی سے، بغیر کسی تھکاوٹ کے اور اکٹا ہٹ کے۔ (لفظ لغت محبت..... محبت نامے)۔ وہ شخص بھی نہیں تھکے گا..... میں جانتی ہوں۔ عمارتیں، رشتے، سب بدل سکتے ہیں مگر وہ میرے جیسا ہے آج بھی ویسے کا ویسے ہوگا۔ بالکل صفیہ کل کی طرح، کیلکولیٹر تھا سے کاروباری اصولوں میں الجھا ہوا۔ مصروفیت سے سر کو کھٹا ہوا، نظر کی عینک جانے اب لگا تا ہے یا نہیں؟

☆☆☆

چوبارے کی منڈیر پر بیٹھی میں اور سنبل سندھی ٹانگے کاڑھ رہی تھیں۔ ہمارے ارد گرد کتر میں، سونیوں، نلکیوں اور بکرم کا انبار لگا ہوا تھا۔ آسمان کی چوٹیوں پر کبوتروں کے غول اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سارے محلوں کی چھتوں میں سے سب سے اچھی، کھلی اور کشادہ چھت ہماری تھی۔ ہم دونوں کے پاس ہی چائے کے بھاپ اڑاتے کپ بڑے تھے جن سے وقفے وقفے سے ہم چمکیاں پیتی ٹانگے کاڑھ رہی تھیں۔

سنبل میری اکلوتی دوست تھی جو دل کی صاف اور خطرناک حد تک منہ پھٹ واقع ہوئی تھی۔ ہر موقع پر بیٹھے بٹھائے اسے پھٹ پڑنے کی عادت تھی اور میں ہمیشہ سے اس کے لیے ایک اچھی سامع رہی ہوں۔ چپ چاپ سننے والی، اف تک نہ کہنے والی،

کبھی بھی نہ ٹوکنے والی۔ سنبل کے لیے شروع سے ہی میری ذات، بہترین موضوع گفتگو رہی ہے جس پر وہ کئی کئی گھنٹے بلا تکان بول سکتی ہے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کیونکہ وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔

”صفتی! کسی دن اگر تم گم ہو جاؤ ناں اس گھر کے سارے بونے پتھر ہو کر رہ جائیں گے۔“

”بونے کس کی؟“

”تمہارے سارے خاندان کو، میرا منہ ہے“

کا کھلا رہ گیا تھا۔ انسان کو اتنا زیادہ سنہ پھٹ بھی تو نہیں چاہیے ناں۔

”مگر کیوں؟“ مجھے برا لگا تھا جو اکثر لگا کرتا تھا مگر جسے وہ چکیوں میں اڑا دیا کرتی تھی۔

”سب کو تم نے اتنا تن آسان بنا دیا ہے صفیہ“

سب کو اتنا عادی نہیں بناتے، زندگی دک جانی ہے جب تم نہیں ہوگی تو یہ سب کیا کریں گے؟ میری آنکھوں میں پانی بھر نے لگا تھا۔

”میں کہاں جاؤں گی سنبل؟“ سنبل نے رنگوں کا گہرا سرخ کولا اٹھا لیا تھا۔

”انسان مر بھی تو جاتے ہیں صفتی! وہ اپنے ہی دل جلاتی تھی اکثر خود غرضی کے سبق پڑھانی کی

جنہیں میں ہر بار بھلا دیا کرتی تھی۔“

”تم تو یہی چاہتی ہو ناں سنبل! میری آنکھوں کو سادوں کی جھڑی بہت جلدی لگا کرتی تھی۔

اب بھی میں نے سادوں جمع کر لیے تھے اور سنبل ہمیشہ کی طرح ڈوب گئی۔ میرا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔

”میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں، ورنہ دیکھو تو ہمارے ارد گرد کتنے ہی تو زندہ لاشے پھر رہے ہیں۔ جسم کو نہیں روح کو موت آ جاتی ہے صفیہ کل! عالم

”روح کو موت؟“ میں نے بے خیالی کے عالم میں گھر کے چھانک سے تانگے گزرتے دیکھے تھے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں دور دور تک پھیل رہی تھیں۔

”ہاں..... جسم کے چولے میں روح رہتی

ہے۔ انسانوں کی بھیڑ میں اکثر ہم اپنی روح کو کھودیتے ہیں۔ ہمارے رشتے اکثر ہماری روح کھا جاتے ہیں۔ تب ہم جیتے جی مر جاتے ہیں۔“

میں نے گھٹنوں میں دیے سر کو اٹھا کر آزاد اڑتے پرندوں کو دیکھا تھا۔

”مجھے یہ رشتے بہت پسند ہے سنبل!“ وہ طیش سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں نے اس کے ہاتھ تمام کیے تھے۔“

”مگر مجھے تو اچھا لگتا ہے۔“

”تمہیں کچھ برا بھی لگتا ہے صفتی؟“

”مجھے خود غرض لوگ برے لگتے ہیں۔“ رنگ برنگے تاروں پر ڈالے ہوئے دوپٹے میں اتارنے لگی تھی۔ ہوا کی چیخ سے وہ رنگین دوپٹے میرے ہاتھوں سے پھسل گئے تھے۔ سنبل ایک ایک کر کے دوپٹے اٹھا کر مجھے پکڑا رہی تھی۔

”آس پاس تو خود غرض لوگوں کی محفل تھی ہے، انہیں تو

آج تک تم نابینا نہیں کر پاؤں۔ تم دنیا جہاں کی جھولی لڑکی ہو۔ ہونہ..... ہونہ!“ دوپٹے مجھے تھمائی ناک

پھول پڑھانی وہ دم دم کرتی میڑھیاں اترتی چلی گئی تھیں۔

”اطلس اس کا بھائی اسے لینے آ چکا تھا۔ بہت

دھار اور شائستگی تھی اطلس میں۔ سہراب سائیکل کو موٹر

سائیکل کی طرح دوڑائے رکھتا تھا۔ میں منڈیر کی طرف آ گئی تھی، وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح سائیکل

کے پڈل پر باؤں رکھے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ لوگ تھک چکی تو جاتے ہیں، کوئی کتنا مستقل مزاج

ہو سکتا ہے؟ وہ تھا۔“

سنبل پھاٹک پر پہنچ چکی تھی۔ وہ اچک کر کیرئیر

پر بیٹھی تھی کہ نظر میری طرف اٹھی تھی۔ ہونہ..... ہونہ

گرتے ہوئے منہ موڑ لیا گیا تھا۔

وہ بہت اچھی دوست تھی، اس بات سے میں کبھی بھی انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ زندگی اور انسانوں کو

جس نظریے سے دیکھتی تھی اس میں ”فیور“ نہیں ہوتی تھی اور میں تو فیور سے آگے کچھ بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ واحد دوست ہونا بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بچوں کی ڈار کو ابھی سفر کرتے دیکھوں۔ ان کے پچھلے سے ٹھکان کو جھڑتا ہوا دیکھوں، مگر میرے کئی کام میرے منتظر تھے۔ گھر سے سانس لیتی میں چوبارے کی میڑھیاں اترتی نیچے آ گئی تھی۔

☆☆☆

اماں اور ابا خوشبوؤں میں ہنکے سامان کے بکے صحن میں رکھے کھڑے تھے..... افضل بھائی اور عمرانہ بھابھی بھی ساتھ تھیں..... راجہ اور زینت بھی گونے کناری والے لمبوسات پہنے تیار کھڑی تھیں..... میں باورچی خانے کے دروازے میں جم کر کھڑی تھی۔ وہ خاندان میں ہونے والی ایک شادی میں شرکت کے لیے داڑی جارہے تھے..... اور جب شرکت کا سوال اٹھا تو ابا نے اخروٹ کھاتے ہوئے کتنے اطمینان سے کہہ دیا تھا۔

”صفتی کل..... ادھر ہے ناں سب سنبھال لے گی۔“ اماں نے میص کی ٹانگیں دور کرتے ہوئے سب

کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”ہاں ہاں..... صفیہ کو بھلا کہاں شوق ہے کہیں

آپنے جانے کا۔“ میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ صرف ایک بار کہا تھا کہ مجھے شادیوں کی ان

تقریبات میں موجود ہجوم سے وحشت ہوتی ہے وہ وحشت آج تک چلی آرہی تھی۔ کبھی کسی کو خیال ہی

نہیں آیا کہ صفتی کل کا دل بھی تو کسی تقریب میں جانے کو کھینکتا ہے۔ چلو کوئی بات نہیں۔ میں سب سنبھال

سکتی تھی۔

”صفیہ! مہربانی کر کے میرے تو توں کو چوری تو ڈال دینا۔“

”میں ڈال دوں گی بھابھی۔“

”ہماری تجربات کی کاپیوں کی ڈانگیر امز ساری

بنا دینا۔ اچھی بہنا!“ اچھی بہنا کا خطاب بھی میرے

وجود سے جدا نہ ہو سکا تھا۔

”تم سکون سے جاؤ۔۔۔۔۔ میں بنا کر رکھوں گی۔“
”تھوڑی ہی دیر میں وہ سرخ اینٹوں والا صحن خالی ہوتا گیا۔ ایسی میں ہمیشہ کی طرح وہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ آلوپے کے پتے بھی مٹی پر بکھرے ہوئے تھے۔ جھاڑو لگا کر آدھے گھنٹے میں فارغ ہوئی تھی کہ تو توں کی چوں چوں نے مجھے چونکایا تھا۔ وہ شاید بھوکے تھے۔ چوری بنا کر میں نے پیچروں میں ڈالنا شروع کر دی تھی۔ سرخ چونچوں والے وہ پیچروں میں بند پرندے اس گھر میں واحد میرے آشنا تھے۔ بقول سنبل کے مجھ میں اور ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جانے ان تفریقات کی اسے کیسے خبر ہو جاتی تھی۔

”تم مجھے انسان کیوں نہیں رہنے دو گی؟“
سنبل نے چیونٹ کا پانچا پھوڑا تھا۔
”تم انسان ہو ہی نہیں انسانیت کی معراج پر پہنچی ہوئی دیوی ہو۔۔۔۔۔ سب کی ضروریات کا خیال بس تم ہی کو تو رکھنا ہوتا ہے ناں۔“
”تو میں کیا کروں؟“ میں زچ ہو کر پوچھتی تھی۔

”خود کو وقت دو۔۔۔۔۔ اس سارے بھوم میں تم نظر انداز ہو رہی ہو۔“
”مجھے بھی اپنا نظر انداز ہونا نظر ہی نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔ وہ جانے کیسے دور دور تک یہ سب دیکھ لیتی تھی۔ مجھے تو آج تک خریداری کرنا بھی نہیں آیا تھا کپڑے، جوتے سب اماں اور بہنیں لے آتی تھیں اور میں ان کی پسند پر بھروسہ کر کے بیٹھ جاتی تھی۔ میں نے بھی تو ان کا اپنی چیزوں کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا۔۔۔۔۔ یہ ایسا فن ہے جو مجھے بھی آیا ہی نہیں میری ہوم اکاؤنٹس کی مس رضیہ میری دل دادہ تھیں۔

”صفیہ گل۔۔۔۔۔ تمہارے جیسا بہر کسی کسی گھر میں ہی ہوتا ہے اور کم ہی ایسے ہیروں کی قدر کی جاتی ہے۔۔۔۔۔ تمہارے کھانے اور سلانیاں شان دار ہیں ایسی تمہاریس تو مجھ میں بھی نہیں۔“

پھر آنے والوں دنوں میں مس رضیہ اور ان کے سارے سسرال کے کپڑے میں نے بے تھے، بغیر کسی اجرت کے، صرف اور صرف ایک چھکی کے لیے۔۔۔۔۔ سنبل سے تو ہمیشہ مجھے دھمو کے ہی ملے تھے۔۔۔۔۔ وہ پھٹ پڑی تھی۔

”تم ساری زندگی استعمال ہوتی رہو گی۔۔۔۔۔ مفت میں کپڑے سی کر اندھی ہو جاؤ گی کسی روز۔“
مروت نامی ایک بھاری کمرے کی چھکی میں میں نے

”وہ استانی ہیں میری۔“
”تم ان کے سارے سسرال کی شاگرد نہیں ہو۔“ میں چپ کر کے ایک طرف بیٹھ جاتی تھی۔
”گلی تا جوٹ۔۔۔۔۔ پڑاناں دل پر ہاتھ۔۔۔۔۔“
ٹریا کا زمانہ کب کا گزر چکا ہے۔
”میں مدد ریا نہیں ہوں۔“ میں نے غصے سے اسے دیکھا تھا۔
”تم ان سے کہیں بڑھ کر ہو۔“ عمرانہ بھائی اپنے میکے میں ہونے والی تقریبات میں بھی مجھے لے جاتی تھیں اور پھر چکن میں کھڑا کر کے بھول جاتی تھیں۔ صبح سے شام تک میں کام کرتی رہتی تھی۔
بھئی یاد ہی نہ آتا تھا کہ کچھ دیر پہلے مجھے بھوک لگی ہوئی تھی اور مجھے کھانا بھی کھانا تھا۔ بستر پر پڑھاں ہو کر گرتے ہوئے میری ذہن میں آخری سوچ بھوک کی ہی ہوتی تھی۔ گھٹن بھوک پر حاوی ہو جاتی تھی اور اگلی صبح میں اپنے آپ کو ڈش واش کے سامنے گندے برتن دھوتے ہوئے پاتی تھی۔ پاس پڑا جانے کا پ اور دو پاپے وہیں پڑے کے پڑے رہ جاتے۔ چائے کالی باسی ہو جاتی تھی اور وہ ہالے چیونٹیوں کا رزق۔۔۔۔۔ میں نے بھی کسی کا رزق نہیں چھین کر کھایا۔

گھر واپس آئی تو ساروں کو اپنے رکے ہوئے کام یاد آ جاتے تھے۔ ابا کا حقہ کونے میں پڑا ہوتا تھا۔
”صفی گل میں اور میرا حقہ تیری راہ تک رہے ہیں۔“ میں دوڑ کر حقہ تازہ کرتی تھی۔۔۔۔۔ ادھر اماں کی مرچیں، سرسوں کا تیل میں ابلے چھو لے، زیرے اور بانی مسالاجات کے ساتھ ساتھ بڑے مرتبان پاس

رکھے بیٹھی ہوئی تھیں۔

”آم اور اچار تیار کر کے مرتبان میں ڈال۔ دھوپ میں بھی رکھ دینا۔“ مسالوں کی خوشبو اور پتھر کے مرتبانوں کے درمیان میں ایسی بیٹھی رہ جاتی تھی۔ مسالے سرسوں کے تیل میں کس کر کے مرتبان دھوپ میں ڈال کر اچھی سی تو کھرکھن سے چور چور ہو رہی ہوتی تھی۔ راحیلہ اور زینت مجھے گھیر لیتی تھیں۔

<https://www.urdubooks.com/>

”مفت۔۔۔۔۔ اس بار ہمیں کرمیوں کی چھٹیاں گزراںے سہیلوں کے ساتھ ادھر ادھر جانا ہے۔ ہمارا کام تو لکھ دینا۔“
کے ٹو پہاڑ میں اپنے اوپر گرائیٹی اف تک نہ کرتی تھی۔ بھائیوں کو اپنے دوستوں کی دعوتیں کرنا انہی دنوں میں یاد آتا، تو توں کی پیچرے میں بند ٹا ہیں میری تلاش میں رہتی تھیں۔ جیسے ہی میں نظر آتی تھیں میں شروع ہو جاتی تھی۔ چوری کا پیالہ تھا میں سوچتی تھی۔

کیا سب لوگوں کی زندگی میری طرح مصروف ہے؟ جواب ہواؤں میں گم ہو جاتے تھے۔
ہمارے خاندان کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ میں اور سے اور حاصل کرنے کی حرص تھی۔ اصغر اور اکبر بھائی کو ان کے کوکٹ بیچ ہی فرصت نہ دیتے تھے انہیں بس صرف اور صرف پارانے کا گانٹھنا آتا تھا۔۔۔۔۔ افضل بھائی بیوی والے تھے تھوڑا بہت ابا کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹا دیتے تھے ابا بانسوں کا کاروبار کرتے تھے۔ گھر کے حالات اچھے نہیں تو زیادہ برے بھی نہیں تھے۔ میں گھر کی سب سے چھوٹی اولاد کی اور شاید اس گھر کے کمینوں کو تو میری ضرورت بھی نہ تھی مگر میں خود ہی آہستہ آہستہ ان کی ضرورت بن گئی تھی میں خود رو جھاڑی کی طرح آپ ہی آپ بڑی ہوئی گئی۔

انسان ساری زندگی ”اہمیت“ حاصل کرنے کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ شاید میں بھی ایک انسان ہونے کے ناتے بس یہی تو چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ

میں جسے ”اہمیت“ سمجھ رہی تھی وہ تو صرف اور صرف ”ضرورت“ تھی۔ اہم اور ضروری ہونے کا جو فرق ہے وہ بہت خوف ناک ہوتا ہے۔ اور یہی بات مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

سنبل نے اپنی بہن کی شادی کے موقع پر اپنے کپڑوں جیسے میرے کپڑے بھی سلوائے تھے اور اپنی اماں کے ساتھ مجھے لینے چار روز پہلے آن دھکی تھی۔ میری اماں تو منہ میں انگلی دے بیٹھی تھیں۔

”آئے ہائے صفی کو کیسے بیچ دوں پیچھے تو سارے کام ہی رک جائیں گے۔“ سنبل میدان میں کود پڑی تھی۔

”آئی، راحیلہ اور زینت بھی تو ہیں ناں۔ وہ سب کر لیں گی۔“

”انہیں کہاں آتا ہے کچھ۔۔۔۔۔؟“ تو آنٹی کیا وہ اگلے گھر نہیں جائیں گی۔۔۔۔۔؟“ آخر کار لڑ بھڑ کر وہ مجھے اپنے گھر لے آئی تھی اور مجھے پہلی بار لگا تھا کہ میں کسی پیچرے سے آزاد ہوئی ہوں۔

سنبل کے گھر میں عجیب طرح کی عقیدت اور احترام کا تاثر ابھرتا تھا۔ وہ گھر محبتوں کا گہوارہ تھا۔ راتوں کو خوب محفلیں جیتی تھیں۔ تھوے کا دور چلنا تھا اور تھوے کی خوشبو کے ساتھ بڑی بوڑھیاں چھاپ تلک سب چھین لی گاتی تھیں۔ مروٹے والی بیٹھی نکلیاں بانٹی جاتی تھیں۔ گھر کے آئین میں ہی لگے گیندے کے پودوں سے پھول توڑ کر بھرے بنائے گئے تھے۔ درزیوں اور بازار کے چکر۔

اطلس مارا مارا ہمارے ساتھ پھرتا تھا۔ سارے رستے ”قصاب لو“ کی وٹ لگائے رکھتا تھا۔ ہر چٹا چاٹ، دہی پھلے اور گول گیوں کی ریڑھی دیکھ کر سنبل کو بھوک لگ جاتی تھی۔ فٹ ہاتھ کنارے ڈھیر سارے لوگوں کے درمیان کچھ کھانے کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ دل کودھڑکا اور سکون ساتھ ساتھ ملا تھا۔

میرا دل چاہا تھا دنیا کی بھیڑ میں ایک پل کو گم ہو کر ”اہم“ ہو جاؤں۔

چوڑی محل سے چوڑیاں خریدتے ہوئے میری

دونوں کلاں بھی سنبل نے بھردی تھیں۔
 ”سنبل! میں نے بھی جوڑیاں نہیں پہنیں۔“
 میرے منہ سے کہنے پر اس نے گھوڑے دیکھا تھا۔
 ”اب تو پہنیں! شرافت سے بیٹھی رہو۔“
 میری نظر سامنے اگلی بھی اٹلس زیر لب مسکرا رہا تھا۔
 کاش میں اس بھوری آنکھوں والے لڑکے کو بتا سکتی
 کہ وہ مسکراتے ہوئے کتنا خوب صورت لگتا تھا۔
 وہ آتے جاتے ہوئے سامان ادھر سے ادھر
 رکھتے ہوئے نظریں مجھ پر بھرائے رکھتا تھا۔ وہی وقار،
 مستقل مزاجی اور خوب صورت لباس۔ کچن میں چائے
 بناتے وقت وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا جاتا تھا۔
 ”میں نے آج تک آپ جیسی کوئی لڑکی نہیں
 دیکھی۔“ میں نے کھولتے پانی میں پتی ڈالی تھی۔
 ”کیا مطلب؟“

آپ جیسی سادگی اور دلکشی، اور بے غرضی، آپ
 کیسے ہر کسی کی مدد کو تیار ہو جاتی ہیں۔“
 ”ناک مجھے جب کسی کی بھی ضرورت پڑے تو
 وہ بھی میری مدد کو تیار ہو جائے۔“ پانی کا رنگ بدلتا
 گیا۔ میں نظر ہٹا کر کھڑی رہی تھی۔
 ”آپ کو لگتا ہے کہ ایسا ہوگا؟“ وہ بہت گہرا
 سوال تھا کہ پل کو جیسے مجھے ٹھنڈا کر گیا تھا۔
 ”ہاں تو ضرور ہوگا۔“ وہ آگ دھیمی کرتا ہوا
 پاس آ کر کھڑا ہوا تھا۔
 ”کل..... یہاں مددگار کو کبھی مددگار نہیں
 ملتے۔“ چائے سے اٹھتی ہوئی بھاپ میں سب گم ہو گیا
 تھا۔

کچھ لوگ خطرناک حد تک سچے ہوتے ہیں اور
 ان دونوں بہن بھائی میں یہ خاصیت تھی۔
 وہ پانچ دن میری زندگی کے یادگار دن تھے جو
 میں کبھی اچھا کر بھول ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ آزادی کے
 دن تھے جن میں مجھے صرف اور صرف اپنی آواز سنائی
 دے رہی تھی۔ صبیحہ گل کی آواز..... اب مجھے لگ
 رہا تھا کہ اس سارے قصے میں تو صرف ”مجھے“ ہی
 میری ضرورت تھی۔ سنبل کے گھر میں چہل قدمی

کرتے ہوئے میں اپنی زندگی کے سب سے پرسکون
 دور سے گزر رہی تھی۔ مجھے کوئی حقہ تازہ نہیں کرنا تھا۔
 اچار، چٹنیوں، مرے کو مرتبانوں میں نہیں بھرنا تھا۔
 تجربوں کی کتابوں کی تصویریں بنانی تھیں پر کار
 اور پیانے مجھ سے دور تھے۔ مغز، کچلی اور پائے کے
 کھانوں میں بلکان نہیں ہوتا تھا۔ میلے کپڑوں کی
 تاریں نہیں ڈھونڈی تھیں۔ میں وہاں ”اہم“ تھی۔ اور
 گھر میں صفی گل کی طرح میں جانے کیوں ایک جانے
 گولے بھی کبھی حلق میں جانے کی پلٹ تھامے پاس آ کر
 ہیں۔ سنبل کبھی کبھی ”خیر کی پلٹ تھامے پاس آ کر
 بیٹھ جاتی تھی۔“
 ”صفی..... خود کے لیے جتنا سیکھو..... ورنہ یہ
 دنیا روند کر چلی جاتی ہے۔ ہر کوئی اپنے حصے کا جتنا سکھ
 جائے یہی بہت ہے۔“

☆☆☆
 وہ ایک بادلوں بھری صبح صبحی آسمان نیلے بادلوں
 میں گھر گیا تب ہی مجھے اٹلس کریم کا وہ پہلا محبت نامہ
 ملا تھا۔ کنواریوں کو جب خط ملتے ہیں تو ان کا دل تیز
 تیز دھڑکتا ہے اور وہ کوئی کونا کھدواؤں میں
 جہاں وہ لہرتے کانپتے ہاتھوں سے آئے والا محبت
 نامہ پڑھ سکیں۔ میں اسٹور میں چلی آئی تھی۔ وہ گھر کا
 چھوٹا سا ساز و سامان رکھنے کے لیے تارک یک سا گھر
 تھا۔ جو اکثر بندی پڑا رہتا تھا۔ میں نے چھوٹی کھڑکی
 اور روشن دان کھول دیے تھے۔ لگی روشنی میں گرد کے
 ذرے اڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ تاریکی چھٹی چلی
 گئی تھی۔ بارش آنے سے پہلے پیدا ہونے والی باس
 فضا میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے وہ رقعہ احتیاط سے
 کھولا تھا۔ وہ شخص جیسے موتی لے کر بیٹھا ہوتا تھا۔
 سارے صفحات پر موتی بکھرے ہوئے تھے۔

”آداب..... جانتا ہوں آپ کا پورا نام صفیہ
 گل ہے۔ مگر مجھے آپ کو صرف ”گل“ کہہ کر خطاب
 کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ سنبل انتہائی آدم ہے
 زار لڑکی ہے کیونکہ میرے خیال میں اس جیسی منہ
 پھٹ اور صاف گو کو کوئی لڑکی ہی پسند کر سکتا ہے۔“

مجھے پہلے پہل آپ کے بارے میں اسے ہی پتا چلا تھا
 اور اس کی عادت ہے کہ اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں مجھ
 سے شیئر کرتی ہے آپ کے ساتھ گزرے لمحات کو بھی
 وہ قصوں کی طرح دہرائی اور روشنی دیتی تھی۔ بہت کم
 دوست ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے لیے خیر خواہ ہوں
 یا پھر ہمیں بدلنا چاہتے ہوں..... ہمارے لیے سوچتے
 ہوں..... غلوں آپ کی کٹھی میں ہے اور جہاں فطرت
 اور کٹھی اکٹھے ہو جائیں وہاں انسان کچھ کبھی کچھ نہیں
 فطرت میں ہے آپ اسے نظر انداز تو کر سکتی ہیں مگر
 بدل نہیں سکتی ہیں۔ میں آپ سے از حد متاثر ہوا
 ہوں۔ عاتسانہ تکلف تو تھا ہی مگر پھر سنبل کو آپ کی
 طرف جب بھی چھوڑنے جانا تھا تو پھر آپ کی طرف
 ضرور نظر آتی تھی، پھر بار آپ جو بارے کی منڈیر کے
 اس کھڑکی ہوئی تھی..... پھر رقعہ رقعہ آپ کو دیکھنا
 معمول بن گیا۔ میں ایک شریف اور اپنے کام سے
 کام رکھنے والا رہا ہوں..... میں نے بھی لڑکیوں کی
 طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا مگر آپ کے معاملے
 میں میں نے اپنے آپ کو مجبور پایا ہے۔ ہمارے گھر
 گزارے گئے جاؤں آپ بھی شاید نہ بھول جائیں
 مگر میں بھی آپ کو ہرگز نہیں بھول سکتا۔ آپ ایک
 مہربان روح کی مالک ہیں۔ میں اپنے دل کو آپ
 کے معاملے میں بے بس پاتا ہوں۔ آپ ہی بتائیں
 میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں؟ کوئی نصیحت؟ کوئی
 بات؟

آپ کا اٹلس“
 وہ حیرت مجھے عجیب انداز میں متاثر کر گئی تھی۔ کوئی
 ایسا شخص میرے لیے ہمدردی رکھتا تھا جسے میں جانتی
 بھی نہ تھی۔ جانے اب اس سب سے کیا ہونے والا
 سنبل نے اگلے روز مجھے پزلایا تھا۔
 ”میرا جواب.....؟“ میں نے گڑبڑا کر اسے
 دیکھا تھا۔
 ”کون سا جواب؟“ وہ مجھے گھورنے لگ گئی
 تھی۔

”خط کا جواب اور کیا.....؟“
 ”میں اس کا کیا جواب دوں۔“
 ”جو تمہارے دل میں ہے۔“ میں نے بارش
 کے بعد دھل کر کھڑے والی فضا کو دیکھا تھا۔
 ”میرے دل میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ سنبل
 دھم سے گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔
 ”ادھر وہ مجھوں ہوا بیٹھا ہے اور ادھر کھلی ہے کہ
 کچھ جانتی ہی نہیں۔“
 گارجر کا جوس اس کے سامنے رکھتی میں ٹھک کر
 پوچھنے لگی تھی۔

”کیا کون ہے؟“ میری لاعلمی پر اس نے
 دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھائے تھے۔
 ”اے اللہ..... تو مجھے اوپر اٹھالے۔“
 پھر آنے والے دنوں میں وہ سہراپ سائیکل وہ
 خوبو شخص میرے راستوں میں آئے لگا تھا۔ کالج
 کے آگے چھتار درختوں والی سڑک تھی۔ جہاں دن
 کے چوبیس گھنٹوں میں سایہ سار ہوتا تھا۔ میں چلتی تھی تو
 وہ ساتھ ساتھ سائیکل لے کر چل رہا ہوتا تھا اور سنبل
 ہم سے دس قدم آگے ڈائجسٹ ہاتھوں میں تھامے
 شاعری پڑھتی ہوئی جاری ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ موسم
 سے بات شروع کیا کرتا تھا۔

”آج موسم اچھا ہے ناں.....؟“ جون کی تپتی
 رو پہر ہوتی تھی اور میں سر ہلا کر اس کی تائید کر دیتی
 تھی۔
 ”ہاں..... اچھا ہے۔“ سنبل کا کبھی کبھی منہ
 توڑنے کو دل کرتا تھا جب وہ پوچھتی تھی۔
 ”اب سمجھ میں آیا کہ کون کون اور مجھوں کون؟“
 اٹلس دھکی دیتا تھا۔
 ”سنبل! آج سے تمہاری فروٹ چاٹ بند۔“
 منہ پھٹ سنبل میری طرف لپکتی تھی۔
 ”صفی! تم سفارش کرو ناں..... اچھا کر دو۔“
 میں بدلتی تھی۔
 ”میں کا ہے..... کا ہے کروں؟“
 ”تمہاری مائیں گے۔“

”کیوں..... کیوں؟“

”تم لیا جو ہو۔“ میں نے کاندھے پر لٹکائے تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگی تھی۔

”ایک ہفتہ نظر نہ آؤ تم مجھے“ میری دھمکیوں پر کبھی بھی تو وہ خوف ناک منہ بنانے سے باز نہ آئی تھی۔ اس کا بیٹ بھی بھی نہ بھرتا تھا..... بعد میں خبر ہوئی تھی کہ آج کل وہ شام کو چاٹ کے ساتھ ساتھ لیمن بھی ڈکا رہی ہے۔

گرم جھلکتی ہوئی دوپہر کو وہ تین لیمن کی ٹھنڈی بوتلیں لے کر کھڑا ہوتا تھا..... پھر وہی سائیکل ہوتی اور چھتار درختوں والی سڑک پر ہم چل رہے ہوتے تھے۔

سنبلی کی شرارتیں ہرگز رتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ روڈ کنارے پتھروں کو پاؤں کی ٹھوک سے اڑائے رکھتی تھی اور ہم دونوں پیچھے دانت پیستے ہوئے چل رہے ہوتے تھے ہمارے نیچے سائیکل کے کیوبیر پر ٹپکے ہوتے تھے۔ وہ دونوں بہن بھائی میری زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے آئے تھے۔ میں آج بھی اپنے گھر والوں کے لیے صرف ضرورت تھی اور ان دونوں کے لیے ”اہم“ ”اہم“ ہم نے گھر والوں کی کمر کیبل سے زندگی کی طرف چھلانگ لگائی تھی..... کبھی بھی ہم تینوں اکٹھے فالوے کھا رہے ہوتے تھے۔

وہ جب بھی آتا تھا اس کی جھینس سکوں سے ٹھکنے لگتی ہوئی تھی۔ آڑھت کی دکان پر بیٹھتا تھا پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ نظریں ٹپک لگتا تھا جو بھی کھار راستے میں میں اور سنبلی بھی لگتی تھیں تب تک جب تک انکھیں پانیوں سے نمبر نہیں جاتی تھیں۔

ابا کا میں تمباکو کوٹ رہی تھی جب اماں نے مجھ سے اجا تک پوچھ لیا۔

”صوفی..... تو اب دیر سے اسکول سے کیوں آتی ہے؟“

”اماں..... وہ پیر قریب ہیں تو دیر تک پڑھائی ہوتی ہے۔“

”جلدی آجایا کر سارے کام تمہارے انتظار میں بڑے رہتے ہیں۔“ تمباکو کی کڑوی مہک میرے دماغ کو چڑھ گئی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اماں سے جھوٹ بولا تھا۔

اگلے دن وہ لیمن کی بوتلیں گرم ہو گئیں۔ فالوہ پانی ہو گیا۔ چرم پارچ چھتار سڑک کے اوپر قدموں تلے آ کر ختم ہو گئے۔ بل میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟“ میں نے بے سے بوجھ کو دوسرے کاندھے پر ہتھل کر دیا تھا۔ آج بوجھ بڑھ گیا تھا۔ کیوبیر ہم دونوں کے بستوں سے خالی تھا۔ وہ سناٹے کی سی کیفیت میں ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”تم ایسی نہیں تھیں۔“ میرا لہجہ ڈنڈا گیا تھا۔

”دیکھی سنو.....؟“

وہ جنگلی بلی کی طرح غرائی تھی۔

سنبو نہ کہنا آئندہ مجھے وہ آگے جانے لگی تھی۔

”اماں نے کہا تھا جلدی آجایا کرنا۔“ میں نے پیچھے سے چلا کر کہا تھا.....!!

”ہاں ہاں..... جاؤ جاؤ..... ٹھنڈا ٹھنڈا ہو جاؤ۔“

منہ پر ہوا۔ سب بھوکے بیٹھے ہوں گے۔ آج خودی تندور میں کود جانا۔

وہ کتنی بچی تھی۔ واقعی ایسا ہی تھا۔ میرے انتظار میں تندور ٹھنڈا ہی پڑا ہوا تھا۔ مجھ بھی کو کام کرنا پسند نہیں تھا۔ راجیلا اور تنزیلا اپنی مرضی کی یا لک تھیں کوئی بھی کام کہہ دو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں۔ اماں انا کو بھی بھی گھر کے نظم و ضبط اور رشتوں میں توازن رکھنا نہیں آتا تھا۔ مجھ سے کبھی بھی رکے ہوئے کام برداشت نہیں ہوتے تھے۔ چھوٹی دیوار کے ساتھ لگے تندور میں لکڑیاں جھونکتی میں پسینے سے پانی پانی ہو رہی ہوتی تھی۔ برآمدے کی چھتیں گرائے سب ٹھنڈی سی لی رہے ہوتے تھے۔ آگ کے شعلوں کی حدت مجھے ٹپا دیتی تھی مگر پانی کے چھینٹوں سے تندور کی حدت کم کر میں روٹیاں لگائی جاتی تھیں قلم پڑے کے سارا دن لکھتے لکھتے انگلیوں کی پوریں پہلے ہی ٹھکی ہوئی ہوتی

تھیں۔ روٹی اتارتے وقت اور جلنے لگتی تھیں۔ گرم روٹیوں پر کھن لگائی اماں سب کو اچار اور کسی سے پیش کرتی تھیں..... روٹی کھاتے ہی سب کے سب قیلوے کے لیے ادھر ادھر کو لڑھک جاتے تھے۔

آخری دو روٹیاں میری ہوتی تھیں میں بائٹ بائٹ میں رکھتی نہانے کو غسل خانے میں کھس جاتی تھی۔ پانی بھی کتنی نعمت ہوا کرتا ہے ناں سارے وجوہی ٹھکن کو کافر کر دیتا ہے۔

جب میں باورچی خانے میں داخل ہوتی تھی تو اکبر یا صغریا بائٹ سے روٹی نکال کر چنگیکر میں ڈالے اچار کی پھلتیں رکھے باورچی خانے سے باہر نکل رہا ہوتا تھا۔

”صوفی تو اپنی اور روٹی پکا لیتا۔ دوست آگیا ہے بھوکا ہے۔“ میں نے کہا تھا ناں کہ میں نے کبھی بھی کسی کا رزق نہیں چھینا۔ میں گہری سانس لیتی دوپٹا بھوکا اپنے اوپر ڈالتی چار پانی پر گر جاتی تھی۔ نیند کو میں نے اپنی سبیلی بنا لیا تھا۔

انہی دنوں میں مجھے تاب چڑھ گیا تھا۔ سنبلی جلتی چڑھتی میرے سر ہانے آ پہنچی تھی۔ ٹھنڈی پٹیاں میرے ماتھے پر لگتی تھیں وہ سخت غصے میں لگتی تھی۔

”تو توں کی خوراک تک کا خیال رہتا ہے انہیں مگر گھر کے اس فرد سے بیزار ہی ہے جو سارا سارا دن ان کی خدمت میں جتا رہتا ہے۔ جانے محبتوں میں جمع تفریق ماں باپ کیسے کر لیتے ہیں۔ ہر کسی کو رشتوں میں توازن رکھنا نہیں آتا اور تمہارا خاندان بھی انہی میں سے ایک ہے۔“ گرم آنسو میرے گال سے کپکپ کرتے رہے..... وہ ٹھنڈی پٹیاں رکھتی رہی۔

جائے جاتے مجھے دھمکی دے کر لگتی تھی۔

”اگر اب تم نے کوئی اور کام کیا تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی۔“ وہ کھری لڑکی میرے گھر والوں کو سخت چبھتی تھی۔ عمران بھابھی اندر آئی تھیں۔

”صوفی..... تو نے کیسی سبیلی بنائی ہے ہر وقت اس کی ناک پر غصہ ہی رہتا ہے۔“

”بھابھی وہ دل کی بہت اچھی ہے۔“

اے ہے..... دل کو چھوڑو یہ یہ بتاؤ کچھ طبیعت بہتر ہوئی ہے؟“

”جی بھابھی..... کچھ بہتر ہوں۔“ میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

”اچھا آنا گوندھ آئی ہوں۔ ذرا روٹیاں تو لگا دینا۔ تمہیں تو عادت ہے اس گرمی میں کام کرنے کی ویسے بھی تم جیسے روٹیاں کوئی بھی نہیں پکا سکتا۔“

گھر کے دیواریں قہقہے لگا کر ہنسی رہی تھیں۔ مجھے واقعی عادت تھی گرمی میں کام کرنے کی.....؟؟ سنبلی سچ کہتی تھی گھروں اور رشتوں میں توازن ضروری ہوتا ہے ورنہ رشتے روح کھا جاتے ہیں۔ بھڑ بھڑ جلتے تندور میں روٹیاں لگاتے ہوئے میں تیورا کر گہری تھی۔ میرے نیچے گرم زمین بھی تپتی ہوئی۔ اور سر پر آگ لگنا کھلا آسمان۔ دونوں کے درمیان میری مردہ روح لٹک رہی تھی۔

☆☆☆

نہر کنارے وہ میرے ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ بے حس و حرکت..... ”تنی کتور تم پہلے تو نہیں تھیں۔“ اٹلس کریم میری رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ اور اس کی بہن میرا انعام تھے۔

”میں تھک گئی ہوں۔“ میں نے پتھر اٹھا کر نہر کے گدے پانی میں پھینکا تھا۔ پانی پھٹتا چلا گیا۔ ”کس سے؟“ وہ سوال کر رہا تھا۔ ٹیکر کے جھنڈوں سے فاختا میں جھانک رہی تھیں۔

”زندگی سے۔“

”اؤ نہیوں..... ایسے نہیں کہتے۔“

”کیوں کیا ہمیں زندگی نہیں تھکا سکتی؟“ نہر کنارے چھوٹے چھوٹے پتھر بڑے رہتے تھے۔ ہم انہی پتھروں کے پاس بیٹھے تھے۔

”نہیں زندگی بہت نرم اور مہربان ہوتی ہے ہمیں صرف اور صرف اپنے رشتے تھکاتے ہیں..... جن سے ہم بے تحاشا محبت کرتے ہیں۔ جنہیں چاہتے ہیں۔“

میں نے غور سے اس شخص کو دیکھا تھا جو آج بھی

اتنا ہی خوب صوت مسکراتا تھا جتنا کہ کچھ عرصے پہلے..... آج بھی اس کی ہنسی میرے لیے سکون کی گولی کی طرح کام کرتی تھی۔
”اطلس..... میں ان کے بغیر، ان کی خوشی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”اور اپنے بغیر؟“ نہر کے گدلے پانی میں پتھروں میں کیمر کے جھنڈوں میں ہر جگہ خالی پن پھیل گیا تھا۔
”میں..... اپنے بغیر.....“ میں نے ہنسنے کی کوئی ناکام کوشش کی تھی۔

”میں کیا ہوں؟ میرا وجود کیا ہے۔ میری اوقات کیا ہے؟ میں تو جیسے کچھ بھی نہیں تھی۔“
”تم زندگی ہو پاؤں اور جو زندگی ہوتے ہیں وہ تو حیات کے پیاؤں سے بھی بالکل ماورا ہوتے ہیں..... خون کے رشتے ہر میدان میں ساتھ کھڑے نہیں ہوتے بدل کے رشتے ہوتے ہیں جو ہر مشکل میں ساتھ آکر کھڑے ہو جاتے ہیں انہیں تو مدد کے لیے صدا بھی نہیں لگانا پڑتی فاختاؤں کی قطاریں گدلے پانیوں پر بیٹھنے لگیں۔ چیز کے درختوں پر ادا سی طاری تھی۔

”تم بہت اچھے ہو اطلس۔“ میری آواز بھیک گئی تھی۔
”اچھی تو تم ہو گل.....“
”اور میں کیسے اچھی ہوں؟“
”تم نے کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا ہمیشہ دوسروں کی فکر میں ہی رہی ہو..... ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنے لیے جینا نہیں آتا۔ شاید تمہاری اسی خوبی نے مجھے خریدا ہے۔ تمہاری ذات میں تمہارے اپنے لیے بے پروائی ہے مگر دوسروں کے لیے نہیں۔ آج کا دور تم جیسے حساس لوگوں کے لیے موقوف نہیں ہے یہ گرم مزاج لوگوں کی دنیا ہے جنہیں صرف اور صرف جلاتا آتا ہے اور بس..... آج ہر کوئی اپنی فکر میں ہے۔ کوئی کسی کے لیے نہیں

ٹھہرتا۔“

”کوئی کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا۔“ میری خود کلائی پر فاختاؤں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔
”مجھے تقریبات میں جانے کے لیے تیار کھڑے وہ“ سارے یاد آئے تھے۔ اور باورچی خانے کے دروازے میں جم کر کھڑی ہوئی میں..... صفیہ گل..... عید کے تہواروں پر تانگا بھانکا، برکتا تھا راجیلہ اور زینت لپک کر چلتی تھیں..... میں آنا کو..... سے آواز میں تھی۔

”صفیہ کو بھی لیتی جاؤ۔“ توینیت ہمیشہ کی طرح جلدی میں ہوتی تھی۔
”ارے اماں۔ اسے کہاں بھاتا ہے مہندی کا رنگ اور خوشبو کا شکر اس گھر میں کسی کو نہیں ہوتی کہ مجھے پسند ہی صرف مہندی کا رنگ اور مہک تھی۔ اماں ہانک لگاتی تھیں۔
”صفی..... ہاتھ دھو کر باہر آ..... تانگا بھانک پر رکا ہے۔“

میں آئے میں نمک ڈالنا بھول کر ہاتھ دھوئی باہر بھاگتی تھی۔ پچانک کسی بھی تانگے کے وجود سے خالی ہوتا تھا۔ بس دور دور تک گرد اٹھ رہی ہوتی اور تاپوں کی آواز، میں واپس تھکے تھکے قدموں سے آواز آ جاتی تھی اماں کی وی کے آگے بھی بیٹھی وارث دیکھ رہی ہوتی تھیں۔

”واپس کیوں آگئی ہو.....؟“ میں مسکراتے کی کوشش کرتی تھی آنسو حلق میں انک سے جاتے تھے۔
”اماں..... آئے میں نمک ڈالنا بھول گئی تھی۔“

شام سے پہلے جب لائین جلتے تھے وہ آ جاتی تھیں۔ ہتھیلیاں اور پورے مہندی سے بچی ہوتی تھیں۔ مجھے ہاتھ دکھا کر وہ ہنس ہنس کر پوچھتی تھیں۔
”تم نے دیر کر دی صفی گل..... ہم نے تو اتنا انتظار کیا تھا۔ پچانک پر گھنٹہ تانگا روک رکھا۔ لفظ ”انتظار“ میری بے بسی پر ہنسا رہا تھا۔

<https://www.urdutubes.com/>

اس شام آئے میں نمک نہیں تھا۔ مجھے یاد تھا مگر میں نے نہیں ڈالا تھا۔ وہ سارے سب بھول گئے۔ جو میں نے ان کے لیے کیا اور جو ہمیشہ سے کرتی آرہی تھی۔ انہوں نے صرف اتنا یاد رکھا تھا۔
”صفیہ تمہارا دھیان کہاں ہوتا ہے۔ ہوش سے کام لیا کرو، روٹی نمک سے خالی ہے۔“ وہ شام ان سب رشتوں سے توازن ”خالی“ کر گئی تھی۔ غیر متوازن.....

پھر وقت نے کسی کو بھی تو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اسول کی زندگی کا ج تک آگئی۔ اس نے پھر بھی اس کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ بھوری آنکھیں انتظار میں ہوتی تھیں۔ سائیکل تھا وہ ساتھ ساتھ چلتا تھا سائیکل کو آج کل پر لگ گئے تھے اس کی شادی ہو رہی تھی۔ وہ کانچ چھوڑ رہی تھی مجھے پھر اکیلے ہی آنا جانا ہو گا یہ سوچ کر ہی مجھے تو دشت سی ہونے لگتی تھی۔
کانچ کی ہماری اتنی یادیں تھیں۔ گیلریاں، برآمدے، گارڈن، بطول پھولوں بھری روش جہاں ہم ساتھ ساتھ جلتے تھے۔ لائبریری کی خاموشی میں بیٹھ کر سہارے تاول پڑھتے تھے ہم نے پھانکتے تھے۔ یادوں کے سہارے جتنا بہت مشکل ہوتا ہے بہت۔ جب امارے اپنے بس ہماری یادوں میں باقی رہ جائیں تو..... جتنے کھاتے ہم دونوں چل رہے تھے اور وہ ہم دونوں کے بستے کیمریز پر رکے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بیوں اور چورن کا ذائقہ زبان کو تیکھا سا لگ رہا تھا۔

”تم چل جاؤ گی تو میرا کیا ہو گا؟“ میں نے روٹی صورت بنا کر اس سے پوچھا تھا۔
”تم چھانک جاؤ گی..... صفیہ گل..... اب میری کمی ہوتی باقی تمہیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ میرے جانے کے بعد تمہیں زندگی کی ساری حقیقتیں سمجھ میں آئیں گی۔“ وہ میرے لیے رک چکی تھی چل اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی۔

”سنو تم بہت اچھی دوست ہو۔ تمہارے جانے کے بعد میں کیسے سامنا کروں گی حالات کا۔“ سائیکل رک چکی تھی۔ بھوری آنکھوں والا سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔
”اطلس ہے ناں۔ میں جا رہی ہوں یہ تو ساتھ رہے گا ہمیشہ۔“ میری سرگوشی ہواؤں میں ٹھہر گئی تھی۔
”ہمیشہ۔“ سائیکل چلی کھاتی آگے بڑھ گئی تھی۔ میں اور اطلس اب ساتھ ساتھ چلتے گئے تھے۔
”یقین نہیں ہے مجھ پر؟“
”خود پر نہیں ہے۔“
”کیوں؟“
”میں رشتوں کو فاقیت دے دیتی ہوں خود کو پرے رکھ دیتی ہوں۔“
”مجھے بھی.....؟“ وہ سوال انتہائی ضروری تھا مگر جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ میں آگے بڑھ آئی تھی.....!

”سنو تم بہت اچھی دوست ہو۔ تمہارے جانے کے بعد میں کیسے سامنا کروں گی حالات کا۔“ سائیکل رک چکی تھی۔ بھوری آنکھوں والا سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”میں رشتوں کو فاقیت دے دیتی ہوں خود کو پرے رکھ دیتی ہوں۔“
”مجھے بھی.....؟“ وہ سوال انتہائی ضروری تھا مگر جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ میں آگے بڑھ آئی تھی.....!

سائیکل کی شادی کے دنوں میں میں وہیں ہی رہی تھی۔ وہ میری زندگی کے یادگار اور اداس کر دینے والے دن تھے۔ وہ ہر کام میں میری اور سائیکل کی رائے لینے آ موجود ہوتا تھا۔ میں اور سائیکل کھڑکی میں کھڑی اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں بحث کر رہے ہوتے تھے۔
”عورت بھی کیا ہوتی ہے بچپن میں ہی اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ باپ کا گھر عارضی ہے اور اس کو اگلے گھر سدا جا جاتا ہے اور اگلے گھر جا کر اس کی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم عورتوں میں خود غرضی نہیں ہوتی سب کی فکر لگی رہتی ہے۔ اس فکر میں ہی کل جاتی ہیں۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔“ اور بس میں نے اپنی اگلی دوست کے دونوں ہاتھ تھام کر عقیدت سے اسے دیکھا تھا۔

”سنو..... تم تو ایک بہادر لڑکی ہو۔ تم آگے سب کچھ سنبھال لو گی۔“ میری ٹپلی پر وہ کھوکھلے انداز میں ہنست تھی۔
”ہم جتنی بہادر بھی ہو جائیں ہمارے دل ہمیشہ بزدل ہی رہیں گے۔“

دوست چھین لیا تھا۔ اب پھر وہی رشتوں کی گلیاں
تھیں اور وہی مسافر وہ، اب کی صفیہ گل۔

☆☆☆

جانے اتنے سال گزرنے کے بعد بھی مجھے
لندن کی سرد بارشیں اور ٹھنڈے موسم راس نہیں
آسکے۔ کفن میں کافی کے سب لیتے ہوئے میں اپنی
چھوٹی انگلی کی پور سے آنکھ کا آنسو صاف کرتی تھی۔
زندگی نے مجھے بھی اپنی زندگی کے درد و غم کو جھیلنے کے بعد
سب سے بڑے بلیک میلر بن گئے۔ دوستی کے پلڑے
میں بیٹی کو تول دیا۔

”میرے دوست کا بیٹا ہے لندن میں ہوتا ہے
انہیں راحیلہ اور زینت کا نہیں صفیہ کا رشتہ چاہیے۔
میرے قدموں تلے سے چپکے سے زمین نکال لی گئی
اور سر کا آسمان بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ کاش مجھے اپنے
رشتوں کو فیورڈ بنا دیتا۔“

وہ بھوری آنکھوں والا شخص جس کی ہنسی میرے
دل کا سکون ہوا کرتی تھی۔ میری فلاسفر دوست
کریم۔ کچھ بھی تو مرے کام نہ آیا۔

اور میں چپ چاپ سرخ جوڑے میں بیٹھ کر
ٹھنڈے شہر میں آگئی تھی۔ صفیہ گل روجہ شہر
یوسف، گھر کے بھانک سے باہر ڈرڈر کر قدم رکھنے
والی لندن میں آکر گھبراہٹ تو گئی تھی۔ میری سادہ کی
زندگی میں رنگ بھرنے والے صرف وہ ”دونوں“
فلسفی ہی تو تھے جنہیں میں پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

شہر یار یوسف جیسا شخص میرے مزاج سے میل
ہی نہ کھاتا تھا۔ تیرے دن ہی اس نے مجھے سامنے
بٹھا کر کہہ دیا تھا۔

”میں نے ایک ہوٹل میں تمہارے لیے جاب کا
بندوبست کر لیا ہے۔ پہلے پہل صرف زبان کا مسئلہ
ہوگا پھر آہستہ آہستہ تم سب سیکھ جاؤ گی۔“ وہ صرف
”زبان“ کا مسئلہ نہیں تھا وہ تو لباس اور اقدار کا بھی
مسئلہ تھا۔

”میں کیسے جاب کر سکتی ہوں۔ مجھے تو کسی بھی
چیز کا پتا نہیں۔“ انٹر کیا ہوا ہے تم نے..... بچی نہیں ہوں

وہ بہن بھائی ہمیشہ ہی مجھے حیران کرتے رہتے
تھے ان کے فلسفے، سوچ اور ارادے مجھے بہت عجیب
لگتے تھے۔ کبھی پتھر تو کبھی موم، ہر آنے والے دن میں
سنبھل کی قنوطیت برقی ہی جا رہی ہوتی تھی۔

”پہلے گھر پاپ اور بھائی کی رضا میں راضی ہونا
پڑتا ہے۔ اگلے گھر شوہر اور سارے سرال کی خوشی کی
پردہ لگی رہتی ہے۔ اور پھر بڑھاپے میں بھی اولاد کی
نشی پڑتی ہیں۔“

آج مجھے وہ کوئی بڑھاپے کی حدود کو چھوٹی ہوئی
بڑھاپا کے جیسی لگی تھی۔ یاپوں کی دہن زرد رنگوں میں
انگارے کی طرح دکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے
بالکل پاس بٹھا لیا تھا۔

”صفیہ گل..... تم بھی میری طرح دوست
بنانے کے فن میں بالکل کوری ہو..... میں جانتی ہوں
میں نے دوست ہونے کے ناتے تمہیں پراچھی بات
سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اب بھی کہوں گی کہ رشتے
ضروری ہیں مگر اپنی فکر اور پروا اشد ضروری ہے۔ کبھی
کبھی ہم اپنوں کو اپنی ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ پھر ساری
عمر بس ہمارا استعمال ہی کرتے رہتے ہیں۔ تم نے
اپنے گھر والوں کو تن آسمان کر دیا ہے۔ تمہارے
جانے کے بعد وہ کس کا منہ دیکھیں گے۔ غلطی ان کی
نہیں تمہاری ہے۔ جب ہم اپنا آپ سارے کا سارا
دوسروں کو سونپ دیتے ہیں تو پھر ہمارے پاس کچھ بھی
نہیں بچتا۔ رشتوں میں توازن نہ ہو تو بس ضرورتیں
بانی رہ جاتی ہیں۔ محبت اور خلوص پھر اس چھت کے
نیچے نہیں رہ سکتے۔“ میں دھندلی آنکھوں کے ساتھ بس
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھی رہی تھی۔

سنبھل اپنی شادی میں سب سے حسین دہن لگ
رہی تھی۔ برا آمدے کے طویل ستونوں کے ساتھ لگ
کر کھڑے ہوتے ہوئے میں نے اپنے دل کے خالی
پن کو بڑھاتا..... اور بڑھتا پایا تھا۔ دوست یونہی
دوستوں کے لیے اداس ہوا کرتے ہیں۔ ہزار
لڑائیوں، جھگڑوں اور خلیوں کے باوجود بھی ہم
دونوں اچھے دوست تھے۔ زندگی نے مجھ سے میرا

آرڈر الگ سے بھیجا۔“ میں چپ چاپ اپنا سارا
جب خرچ پچھلوں کو مٹی آرڈر کر دیتی تھی یہاں تک کہ
بچی تو میرے پاس کافی پینے تک کے پیسے بھی نہیں
بچتے تھے۔ کبھی کبھی آئینے کے پاس جب میں لپ
اسٹک لیے کر کھڑی ہوتی تو اپنا گلس دیکھ کر ہولے سے
ہنس دیتی تھی۔

”تم بھی بھی نہیں بدلو گی صفیہ گل..... کبھی بھی
نہیں۔“

شہر یار یوسف آہستہ آہستہ مجھ پر کھل رہا تھا۔ وہ
لڑکیوں سے تعلقات رکھتا تھا۔ شراب بھی پیتا تھا.....
میں اس سے لڑ پڑی تھی۔

”آپ کیوں کرتے ہیں ایسا.....؟“
”یہاں ہر مرد کی دوسری عورت سے آشنا کی ہے
ہر مرد الکول پیتا ہے۔“

”یہاں کے سارے مرد مجھے جواب دہ نہیں
ہیں کہ وہ جو بھی کریں مگر میں آپ کی بیوی ہوں پوچھنے
کا حق رکھتی ہوں۔“ شہر یار نے اپنے ناخن میرے
مازوں کا ڈبے تھے۔

”تم کوئی بھی حق نہیں رکھتی ہو۔“ میرے دل کی
دھڑکنیں رک گئی تھیں۔ پھر میں نے آپ کو ”خاموشی“
کے حوالے کر دیا تھا۔ میں اس سے شاید کچھ بھی پوچھنے
کی اہل نہیں تھی۔ میں نے سوال پوچھنے بند کر دیے
تھے۔ وہ راتوں کو نینے میں دھت گھرانے لگا تھا۔

ابا کی کال آتی تھی تو بلیک میلر ابا خوشی سے پھول
رہے ہوتے تھے۔

”کہا تھا ناں کہ تم وہاں ہمیشہ خوش رہو گی کوئی
بھی پریشانی نہیں ہو گی۔“ میرے منہ سے نکلتی بھاپ
شیشے پر نشان چھوڑ جاتی تھی۔ بھلا میں کیسے خوش تھی۔
خوشی کا تو میری زندگی سے وجود ہی رخصت
ہو چکا تھا۔ پاکستان سے ان کی فرمائشیں ہی ختم ہونے
کو نہیں آتی تھیں۔ راحیلہ اور زینت کے لیے میں نے
اپنی جمع پونجی سے بہت کچھ بھیجا تھا۔ میں شادی کے
دعوت نامے کی منتظر ہی رہی مگر اس بار بھی مجھے یکسر
بھلا دیا گیا۔ انہیں تو لگتا تھا کہ صفیہ گل کو آج بھی

سب آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گی ورنہ میں سمجھا دوں گا مجھے
اچھی طرح سمجھانا آتا ہے۔“

وہ ساری رات میں پن کے ٹھنڈے فرش پر
سکایا لیتی بیٹھی رہی تھی۔ وہ ملک، لوگ، رہن بہن
سب کچھ نیا تھا میرے لیے۔ پھر میں نے اس بے حس
معاشرے میں خود کو سب سے زیادہ بے حس ہوتا پایا
تھا۔ شیر یا خوش تھا ہر ماہ اس کی ٹھکانے پر بخورہ کی رقم پہنچ
جاتی تھی۔ زندگی بہت عجیب ہو چکی تھی لڑائیاں لے
کر اور اب ایک سرور کی پڑی تھی۔ اب اس کا بھلا ہوا تھا
کہ پروفیشنل سکراہٹ کتنے درد و غم کو جھیلنے کے بعد
چہرے پر آتی تھی۔

اس مصروف معاشرے کی مصروفیت میں میں
نے اپنے آپ کو گم کر لیا تھا وہ بھی کچھ پرانے سچے
دوست یاد آ جاتے تو اور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ
ڈالے ٹھنڈی سڑکوں کے سفر پر نکل جاتی تھی۔ سرد
ہوائیں میرے بالوں سے سرسراتے ہوئے گزرتی
تھیں۔ ہر بار تار کو لکڑی سیاہ سڑکیں میری رقتی ہوتی
تھیں۔

اسٹریٹ سگزر کی برفا منس چند ٹاپے رک کر
دھکتی میں ماں کی طرف کوٹ کی جیب سے سکے نکال
کر اچھائی آگے بڑھ جاتی تھی۔

راحیلہ اور زینت کے رشتے طے پا گئے تھے وہ
بار بار فون کرتی رہتی تھیں۔
”صفو..... اب تو تم غیر ملکی ہو وہاں کی زندگی
کا تو اور ہی مزہ ہو گا۔ امپورٹڈ چیزیں..... پرفیوم اور
کپڑے۔“ ان کی زندگی صرف اور صرف امپورٹڈ
چیزوں کے گرد ہی گھومتی تھی۔

”صفیہ..... ہمارے لیے میک اپ کا سارا
سامان تم وہیں سے بھیجا۔ ارے ابھی ہماری بہن
لندن رہتی ہے کچھ تو ہمیں فائدہ ہو۔“ مہندی کی
مہک میرے حواسوں کو چڑھنے لگتی تھی..... وہ کھلا
بھانک، اٹھتی ہوئی دھول اور دور سے ابھرتی کھوڑے
کے ٹاپوں کی آواز..... اماں ہر بار کہتی تھیں۔
”صفو..... پیاری بیٹی..... اس بار میرا منی

تقریبات کے جہوم سے وحشت ہوتی ہے۔ کتنا سمجھتے یا جانتے تھے وہ سارے مجھے۔

راجہ اور زینت اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئی تھیں رختی والے دن انہوں نے فون پر کہا تھا۔
”صفیہ کو تین چیزیں ابھی رہتی ہیں لست تیار کر کے پھر تم کو بتائیں گے تو تم وہیں سے بیچ دینا۔“ میں جیسے انسان نہیں مٹیں تھی۔ میں نے خود کو اتنا بے حس کر لیا تھا۔

روڈ کنارے لگے درختوں کو دیکھ کر مجھے وہ جھنکار سڑک نظر آنے لگتی تھی۔ وہی ہم تین..... گھرے سائے میں ڈوبی سڑک..... لیمن کی بوتلیں..... بھوری آنکھوں والا سہراب سائیکل کا سوار چلتے چلتے آنکھوں میں پانی جمع ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ اوور کوٹ کی جبین ٹشو پیپر سے خالی ہوتی تھیں آنسو لڑھکتے ہوئے گالوں پر آجاتے تھے۔ پاس سے گزرتے وہ انجان پپی لڑکے ٹھک کر رک کے مجھ سے پوچھتے تھے۔

”نیم..... آریو اوکے.....؟“ مسکرانے کی کوشش میں میرے ہونٹ اور میرا اندر تک زخمی ہو جاتا تھا۔

شہر یار یوسف سے بات بے بات چھڑپ روز کا معمول بن گئی تھی۔ اب تو اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ میں ڈوبی گئی شروع کر دی تھی بھائیوں کو بھی میرے پیچھے گئے مٹی آرڈر کا انتظار رہنا شروع ہو گیا تھا۔ ٹپل دوسرے ملک میں ہو کر بھی اپنے گھر والوں کے لیے کیل ثابت ہوتی تھی۔ سنبلی کی پیرکوشیاں اکثر لندن کے جہوم میں میرا چھپا کرتی تھیں۔

”صفیہ گل..... رشتے روح کھا جاتے ہیں۔“ اماں کی موت پر میں ایسی کرہ بند کر کے روتی رہی تھی۔

”ابا..... میں آچلوں؟“ نہیں بیٹا..... تم نہ آؤ..... بس اپنی ماں کی مغفرت کی دعا کرنا..... وہ ساری رات پھر میری

سڑکوں، فٹ پاتھ پر گزری تھی۔ جانے اب اماں کس جہان کو گئی تھیں جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ واپسی کے سفر ختم ہو گئے تھے۔ انہی دنوں میں مجھے طلح کے خطوط ملنا شروع ہو گئے تھے۔ وہی لفظ۔ وہی جذبہ وہی شدت کی محبت۔

”گل..... جب زندگی کی جھکن بڑھنے لگے تو واپس آ جانا..... راستہ منتظر ہیں۔“

میں نے اسے جیسے کی جیسے کی گزری تھی۔ آج تک نہیں بھولا تھا۔ زندگی میں اسنے مجھ سے کہے تھے کہ شہر یار یوسف کا ساتھ برواشت کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ ایک سردی رات تھی جب شہر یار ایک کینیڈین لڑکی کو اپنی دوسری بیوی کی حیثیت سے مجھ سے متعارف کروا رہا تھا۔

”یہ کیسی ہے..... کیتھرین..... میری دوسری بیوی۔“

”تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ کیسی اس کے گلے میں بازو جھانک کے ہوئے تھی۔

”میں سب کچھ کر سکتا ہوں..... سمجھیں۔“ وہ غرا ہوا بیڈ روم میں چلا گیا اور میں ڈرائنگ روم میں صوفے پر ڈھسے گئی تھی میرے گھر والوں نے شخص منتخب کیا تھا میرے لیے..... انہیں پرکھنا نہیں آتا تھا.....؟“

مجھے اس کے الفاظ یاد آنے لگتے تھے۔

”تمہارے گھر والے تمہیں نہیں جانتے۔“

اس دن رو میں گے جب تمہیں جانیں گے۔

لیٹی نے میرے بیڈ روم پر قبضہ کر لیا تھا۔ میرے شوہر پر بھی..... عورتیں بھی کیا کر جاتی ہیں۔ پھر مجھ میں اور شہر یار میں چھڑپ ہوتی تھی۔

”وہ میرا بیڈ روم ہے۔“ میں نے اپنا حق تسلیم کیا تھا۔

”تمہارا.....؟ یہ فلیٹ میرا ہے تمہیں جتنی جگہ چاہیے ہے پھر احسان مانو۔“ میں اس دن آخری حد تک لڑتی رہی تھی۔ اس نے میرے بال کھینچے تھے۔ پھٹ مارا تھا۔ اور پھر وہ اڑے سے باہر دھکیل دیا تھا۔

”میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔“ کیا بس یہی تین لفظ عورت کی اوقات ہوتے ہیں؟ میں قیامت کی اس سردی میں سڑکوں پر شعلاتی رہی تھی۔ لندن مجھے راس نہیں آیا تھا۔ میرا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے کپکپاتے ہوئے ہینڈ بیک سے وہ خط نکالا تھا۔

”گل..... خود کو اتنی اذیت مت دو..... پلٹ

ابا بچپن میں اکثر مجھے پیار سے ”اما کی صفیہ گل“ کہا کرتے تھے۔ وہ صفیہ گل اب تو جیسے ختم ہونے کو تھی۔ میں ہول کے پیسٹ میں رہنے لگی تھی۔ گھر والوں کو طلاق کی خبر ہو گئی تھی۔ تسلیاں..... ولا سے..... بہت ہو گئے اور میں ادھر ایک جملہ کو سننے کو کہتی رہتی۔ ”لوٹ آؤ صفیہ.....“ مگر وہ جملہ کی نے بھی تو نہ کہا تھا۔

”تو کمری تو باقی ہے ناں.....؟ اچھا ہے، وہاں

تو کمری ہو تو اکیلی عورت سارے حالات سے لڑ جانی ہے۔ تم تو بہت اچھی بہنا ہو..... بہادر ہو۔ چلو شکر ہے شہر یار ٹکڑے سے جان چھوٹی۔

اب خواہ میں حصہ دار نہ ہوں۔“

میری ہتھیلیں ٹوٹی جرتی رہیں..... دن رات کو محنت اور میں نے اپنا آرام تک نہ دیا تھا۔ ساری تنخواہ بچپلوں کو جانے لگی تھی۔ جواب میں شہر آ گئیں لہجے۔

انہی دنوں میں ابا بھی گزر گئے۔ میں پھر سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھی۔

”میں آ جاؤں بھیا.....؟“ بھیا تو جیسے گھبرا سے گئے تھے۔

”تمہیں..... نہیں صفی..... تم وہیں رہو اچھی بھلی تو کمری ہے۔ اللہ کے کاموں میں انسان کیسے دخل دے سکتا ہے۔“

زندگی کے اس مقام پر مجھے وہ خطرناک حد تک منہ پھٹ سہمی یاد آ جاتی تھی۔

”تم ان کے لیے اپنے وجود کے سارے

ٹکڑے کاٹ کر بھی اگر انہیں دے دو ناں..... یہ پھر بھی راضی نہیں ہوں گے صفی.....“

وہ سچ کہتی تھی اس کے جانے کے بعد مجھے ساری باتیں سمجھ میں آ رہی تھیں..... میں نے اب بھی دو سالوں میں اپنی ساری تنخواہ پاکستان بھیجی ہے۔ اب بھی کے بغیر۔ کسی کو بھی جتانے بغیر..... اب بھی مہینے کے آخری دنوں میں میرے پاس کافی پیسے کے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔ لندن کی ٹھٹھری شائو میں ڈاک سے مجھے وہ لفظ ملا تھا.....

”یہاں عمارتیں کھڑی ہو گئی ہیں گل..... مگر مجھے علم ہے تمہارے وجود کی عمارت گر چکی ہوگی۔“ میں نے بمشکل اپنی سسکیاں روکی تھیں۔ ”لوٹ آ گل..... کہیں طلح کو بھی زندگی تھکا نہ دے۔“

☆☆☆

کاہے کو بیابانی بدلیں

رے لکھی باہل مورے

ہم تو رے باہل آگن کی چٹیاں

بھو بھسے اڑ جائے

رے لکھی باہل مورے

میں تو باہل تو رے

کھونے کی گلیاں

ہانگو جدھر ہنک جائے

کاہے کو بیابانی بدلیں

بھائیوں کو دے باہل غلے دو محلے

ہم کو بیابانی بدلیں

اے لکھی باہل مورے

کاہے کو بیابانی بدلیں

ایک نہ دی باہل سر کی رے سنگھنی

موری ساس نند مارے بول

تاج بھری میں نے گڑیا بھی چھوڑی

چھوڑا سہیلیوں کا ساتھ

رے لکھی باہل مورے

ڈولے کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا

مریم شہزاد

کراچی کی کہانی



ہیں مگر میں نہیں مانتی۔ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ شوہر اتنا ظلم کرے اور آخر میں معافی مانگ لے اور آپ مہمان دیوی بن کر معاف بھی کر دیں۔“ فاطمہ تپ کر بولی۔

”ابھی تم نے زندگی دیکھی ہی کتنی ہے، کیا پتا شادی شدہ لائف میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ ندا بولی۔

”تو بہ توبہ باز آئی میں ایسی شادی سے۔“ اس نے کانوں کو ماتھ لگائے۔

”چپ کر جاؤ، مت بولا کرو اتنا فالتو۔ اللہ نہ کرے ایسا وقت آئے۔“ ندا اس سے ایک سال ہی بڑی تھی اس نے فاطمہ کو ڈرایا، تو فاطمہ نے ڈر کر ایک دفعہ اور کان پکڑے۔

☆☆☆

حرا نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔

کرن 63 فروری 2019

میرے آنسو بارش کے پانی میں گم ہوئے ہیں۔ میں نے سب کے چہرے دیکھے۔

”جہاں ایک رات کے لیے چھت نہیں لی وہاں ہمیشہ کے لیے ٹھہرنا بے وقوفی ہے۔“

وہ سارے پتھر کے بت وہیں کھڑے ہیں۔ میں مضبوط قدم اٹھاتی پوری کی روش پر چلتی جا رہی ہوں اس یقین اور محنت کے سہارے جو کہ گم ہوئے

منتظر ہے۔ وہ آج بھی میری ساری ساری باتیں چھتری تھا سہارے گھر کے پچانک پر کہ بارش میں بیٹھ رہا ہے اور طلس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ ہے۔

”کل..... دیر تو نہیں ہوئی ناں.....؟“ وہ فخر مند سا لہجہ..... وہ بے تابانہ انداز.....

”نہیں..... انجی کچھ وقت باقی ہے۔“ ہم دونوں چھتری تلے چلتے ہوئے چھتا

سڑک سے گزر رہے ہیں۔ میرا ہینڈ بیک طلس کے سائیکل کے کیمر پر پرکھ لیا۔

”تھک تو نہیں کیں.....؟“

”نہیں..... ابھی ہمت باقی ہے۔“ ہم دونوں ہنس دیتے ہیں۔ ایک بار اس

سوال کیا تھا۔

”اگر کبھی زندگی میں تمہارے رشتے اور میں آمنے سامنے آگئے تو کسے فیور دوگی.....؟“ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

”مگر آج میں نے اسے وہ ”فیور“ دے دی ہے۔“

سیرت کی شہسب

ماٹائل..... کئی قہقہہ خان
میلاک لپ..... روٹی پٹی پٹائی پلاو
ٹیش گولی..... مونسٹی وٹھا

کرن 62 فروری 2019

آیا یادیں

کا ہے کو بیاہی بدلیں

باہر کب کی بارش ختم ہو چکی ہے..... مگر میرے اندر کہیں اب بھری گئی ہے۔ میں اندر لاؤنج میں بیٹھی ہوں۔ اور میری بھابیوں کی اپنے بچوں کے ساتھ

تکرار شروع ہو چکی ہے۔

”زارا..... تم کچھپو کے لیے کمرہ خالی کر دو ناں۔“

زارا میری بھتیجی کتنی بڑی ہو چکی ہے۔ گندی رنگت..... تھکے نقوش..... اور زہرا آلودہ.....

”میں اپنے کمرے میں کسی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ پاؤں پختی اندر بھاگ گئی ہے۔ اصغر بھائی نے اسے بیٹے زید کو گھورا تھا۔

”بیٹے آپ شاباش کمرہ خالی کریں پھپھو کے لیے۔“ وہ چھوٹا سا لڑکا مجھے سب سے اچھا لگ رہا ہے۔ وہ یقیناً ابھی کمرہ خالی کر دے گا میری ہینڈ بیک

پر گرفت بڑھتی جا رہی ہے۔

”آپ کی بہن ہے آپ خالی کر دیں۔“ سارے بچے جو پہل پہل تحائف کی کھوج میں آئے تھے۔ اب سب کے سب اپنے کمروں میں دھاڑ سے

دروازہ بند کرتے گم ہو گئے ہیں۔

عمرانہ بھابی کی سرگوشی مجھ تک پہنچی تھی۔

”صفیہ کتنی چھٹیوں پر آئی ہو.....؟“ میں نے آنکھوں سے آنسو بمشکل روکے ہیں۔

”ہمیشہ کے لیے۔“ میں لاؤنج میں بیٹھے اپنے سب کے سب رشتوں کے چہروں کے رنگ آڑتے دیکھ رہی ہوں..... میں نے ہمیشہ انہیں ”فیور“ دی ہے مگر آج نہیں۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ میرے اندر اور باہر ایک ساتھ بارش شروع ہو چکی ہے۔ میں - سامان کھینٹی پوریج کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ وہ سب میرے پیچھے بھاگے ہیں۔

”صفیہ کل..... کہاں جا رہی ہو.....؟“

گلکاری

پونجی قسط

<https://www.urdutubes.com/>



URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com



ناپے پھر رہے تھے، ساتھ میں شادیز غریب کو بھی کب کا بلوا کر بٹھا رکھا تھا۔ اس کے ذمے مومن کو کال ملاتے رہنے کا کام تھا۔ وہ بھی ایسا تابع دار تھا کہ ایک بل کو بھی اس نے دادا کے موبائل کو سنانے نہیں دیا تھا۔ اور اب کسی بھی وقت مظلوم کی مٹری آنکھیں موند سکتی تھی۔

مومن عام طور پر پانچ بجے تک گھر آ جاتا تھا، آکر چائے بنا کے خود بھی پیتا تھا اور دادا کو بھی پلاتا تھا۔ سارے دن کی تفصیل دادا نے سننا خون پر واجب کر رکھا تھا۔ نئی نئی جاب بھی، مومن کے پاس می سنانے کے لیے بہت کچھ ہوتا تھا۔ دونوں دادا اپنا

رات کے کھانے تک یوں ہی سر سے سر جوڑے بیٹھے تھے اور پھر ایک بھر پور لڑائی پر بیٹھک کا اختتام ہوتا۔ دادا چاہتے تھے کہ مومن ان کے لیے چلا کا بنائے جبکہ مومن کی کوشش ہوتی تھی کہ تندر سے دور وہیاں پکڑ لائے، پر دادا اپنے جبروں کی دہائی دے کر ہمیشہ اسے روٹی پکانے پر مجبور کر دیتے تھے اور پھر یہ ہائی چھلکی تکرار رات سونے سے پہلے تک جاری رہتی۔

آج مومن کو کافی دیر ہو چکی تھی۔ دادا سچ میں پریشان سے شادیز کو کب سے بلائے بیٹھے تھے۔ جو مسلسل مومن کو کال پر کال ملائے جا رہا تھا۔ دادا کی فکر اب طیش میں بدلتی جا رہی تھی۔ شادیز ان کے تاثرات دیکھتے ہوئے مستعد ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ دادا کے ہاتھ میں چھڑی تھی جس کی فرش پر پڑنے والی ٹک ٹک کی آواز میں شدت نمایاں ہوتی جا رہی تھی

”ایک تو میں اس ٹیکنالوجی سے بڑا تنگ ہوں، مجال ہے جو کوئی ایک سکھ ہی دیا ہو۔ بلکہ زیادہ پریشان ہی کیا ہے اس نے لوگوں کو؟“ دادا مسلسل ٹپکتے ہوئے مٹن کے چکر پر چکر کاٹ رہے تھے اور ساتھ ہی بڑبڑائے بھی جا رہے تھے۔ قریب کری پر ٹھنڈ کی شدت سے اکڑا بیٹھا شادیز دادا کے موبائل سے مومن کو کال پر کال کیے جا رہا تھا مگر مجال ہے جو وہ اٹھانے کا قصد کرتا۔ اور اسی بات کو لے کر دادا کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔ وہ خود تو سردی سے بے نیاز مٹن



اور شادیز جانتا تھا کہ جب یہ آواز مسلسل اور تیز ہو جائے تو چھڑی برس بڑنے کے امکانات کافی روشن ہوتے ہیں۔ وہ جی کڑا کرتے ہوئے دادا سے بولا۔
”دادا جی! مجھے لگتا ہے کہ مومن کا فون سالنٹ پر ہے، یا پھر وہ بیچنے ہی والا ہوگا جب ہی کال پک نہیں کر رہا۔ یا پھر۔“

”اُوئے بھئی بند کر اپنی یا پھر میں کرواؤں۔ اس غصیت کو آج آ لیتے دے۔ اس کا موبائل دیوار کے ساتھ ماروں گا کھینچ کر۔ اس عمر میں مجھے یمنشن دینے سے باز نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے کہ جان کر نہیں اٹھا رہا، زنج کر رہا ہے۔ کل ماسی شوکت نہیں آئی تو کپڑے دھوئے ہیں نا پھر زبردستی۔ اسی کا بدلہ لے رہا ہے۔ اور ایک تو نکما۔ تجھ سے کسی کوئی کام ڈھنگ کا نہ ہوگا، ایک نمبر کا گھونچ ہے تو بھی۔ ایسا کر ذرا اپنے موبائل سے نمبر ملا۔ دیکھا اٹھا ہے۔“

انہیں شہر تھا کہ مومن ان کو ستانے کے لیے کال پک نہیں کر رہا۔ شادیز کا ”گھونچ“ کہنے پر مندا ایسے بنا تھا جیسے گھوٹا پڑا ہو۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے جیب سے اپنا اسٹارٹ فون نکالا اور بڑی احتیاط سے ہاتھوں میں تمام کے نمبر پیش کرنے لگا۔ دادا رک کر بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

”کیا..... کیوں کر رنٹن ہو تم۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تجھے دن میں تارے دکھا دوں گا، تو ابھی مجھے جانتی نہیں۔ بڑی آئی۔ ہونہہ!“

”اُوئے کیا ہوا۔ سچ بول۔ کس زنانی نے اٹھا لیا میرے مومن کا فون۔ بول!“ دادا پریشانی سے قریبی کرسی پر بیٹھ گئے۔ شادیز نے غصے سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں دادا جی۔ آپ پڑھتی۔ کہہ رہی تھی اس کال کے لیے آپ کے پاس مطلوبہ بیلنس نہیں ہے۔ جب بھی کہیں کا نمبر ملاؤں، ہمیشہ یہی بولے گی۔ آج میرا میٹر گھوم گیا بس۔ سوچا ذرا منہ بند کرادوں اس کا۔“ دادا جو بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے، منتھے بھلائے اور کب کی بیاسی چھڑی

رکھ کے اس کے گھٹنے پر دے ماری۔ سخت سردی میں ٹھنڈے جسم پر چوٹ پڑی تو شادیز بلبل کر رہ گیا۔ شکوہ کتناں نظروں سے دادا کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے گھٹنے کو ملنے لگا۔

”ایسے کیا دیکھتا ہے غصیت۔ شکر کریہ چھڑی سر پر نہیں ماری۔ رکھنے کو اتنا مہنگا فون رکھا ہوا ہے اور اندر چار روپے کا بیلنس نہیں ڈلواسکتا۔ اسے کیا کیل ٹھونکنے کے لیے بیچ دے۔ جانا تو ہے اپنے دادا بھی جوانی میں ایسا ہی چل تھا۔ جانا تو ہے اپنے دادا پر جانے میں رتی کسر نہیں چھوڑی۔“

”تو کیا کروں دادا جی۔ جو کما تا ہوں، وہ دادا ابا لے لیتے ہیں، اس میں سے اس طرح گن گن کر نوٹ مجھے تھماتے ہیں کہ اپنے کمانے پر رعت بھیجے کو دل کرتا ہے۔ ایک انڈر وئیر خریدنے کے لیے مجھے دادا ابا کو پہلے پورا ڈیمانڈ نوٹس دینا پڑتا ہے، بیلنس بہت بڑی بات ہے۔“

شادیز تپا بیٹھا تھا، اسے بڑے بھائی کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹاتے کافی وقت ہو گیا تھا، ساتھ ایم بی اے کی تیاری بھی کر رہا تھا، لیکن ایک تو چھوٹا بڑا جھانٹ، اوپر سے گھر میں سب سے چھوٹا بڑا کے دباؤ میں رہتا تھا۔

دادا نے اس کی بات پر اتنی مسکراہٹ کو چھپانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ بلکہ انہیں ہولے ہولے اہلی آنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہنس ہنس کے شادیز کا دل مزید جلاتے، گیت کے باہر گاڑی رکنے کی آواز پر دونوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ تیل ہوئی۔ شادیز نے گیت کھولا تو سامنے مومن کھڑا تھا۔ دادا کی جان میں جان آئی مگر چہرے پر خشونت طاری کر لی۔

”السلام علیکم دادا۔ سوری آج لیٹ ہو گیا بہت۔ اصل میں بہت ضروری کام پڑ گیا تھا اس لیے لیٹ ہو گیا۔“ مومن تھکے قدموں سے چلتا ہوا دادا کے قریب آ کر بیٹھ گیا، گاڑی کی کاپی تپائی پر رکھ کر دادا کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے

کھانا کھایا؟“

”کون کھلاتا مجھ بڑے کو۔ ہاں۔ بول؟ کتنے مزے سے ٹہلتا ہوا آیا ہے نواب کا بچہ اور پوچھ رہا ہے۔“ آپ نے کھانا کھایا دادا۔“ دادا نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔ ”تجھے احساس بھی ہے کہ میری جان کب سے سوکھ رہی ہے تیری فکر میں۔ کیسے کیسے وہم ستار ہے تھے مجھے۔ نہ تو موبائل اٹھاتا تھا نہ خود سے کوئی خر خریدی اور تجھے لگتا ہے کہ میں اتنا پرسون تھا کہ کھانا کھاتا تو خود سے ستر پر پڑ جاتا۔ ہاں نا۔“ دادا کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ مومن جب گرتی سے اٹھا اور اٹھ کر دادا کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اکڑوں بیٹھے ہوئے بولا۔

”سوری دادا، معاف کر دیں۔ واقعی غلطی میری ہے۔ مجھے خیال ہونا چاہیے تھا آپ کی پریشانی کا۔ اور اس شادیز کے بچے سے بہت ناگہ آپ کو کھانا کرم کر دے۔ آڑا تر چھا چکا بھی پکا لیتا ہے یہ نیم زنانی۔“ مومن کے یوں کہنے پر دادا تو کھل کے ہنسے مگر شادیز کا بس نہ چلا کہ اس کا سر تو ڈرے۔ ایک تو دو گھنٹے سے دادا کے ساتھ مغز ماری کر رہا تھا اور اب باقی کا دماغ چائے مومن چلا آیا تھا۔ اس نے کرسی پر پہلو بٹھاتے ہوئے اپنی ناراضی دکھائی مگر واک آؤٹ نہیں کیا اور اس کی وجہ مومن بخوبی جانتا تھا۔ اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے دادا سے پوچھا۔

”چلیں غصہ تو کیوں، یہ بتائیں آج کھانے میں ہے کیا۔“

”حق باہ۔ وہ زمانے لد گئے پوتے جب ہمارے گھر سے بھی پکوانوں کی مہک اٹھا کرتی تھی۔ تیری ماں ہمیشہ ساری خوشبوئیں اور ڈالتے ساتھ ہی لے گئی۔ صبح سبزی والا امانت کو لگھو دے گیا تھا، وہ اس کھڑ پھنچ۔“ اشارہ شادیز کی طرف تھا۔ ابرو اچکا کر دادا کو گھورا ضرور مگر گل کا مظاہرہ بدستور جاری تھا۔ ”کی بھابھی کو بھجوائے۔ اللہ ماری کا ہاتھ بلا کا بدذائقہ ہے۔ کچی الگ اور پانی الگ صاف نظر آرہا تھا، میں نے اٹھا کر فریج میں رکھ دیا۔ اب اسی کو گرم

<https://www.urduubooks.com/>

خانہ

بہنوں کا اپنا ماسٹرم

لاہور

نوروری 2019 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

نوروری 2019 کے شمارے کی ایک کاپی

ہر گھر کے لیے ماحولیات

- ☆ ”وہ اک پل بھار کا“ بشری ناز کا مکمل ناول،
- ☆ ”تم میرے پاس رہو“ روشن بلال کا مکمل ناول،
- ☆ ”حیثیت یا مات“ قرۃ العین سکندر کا مکمل ناول،
- ☆ ”حاصل زیست ہو قسم“ فہیمہ آصف کا ناول،
- ☆ ”میں وقصم“ بشری سیال کا ناول،
- ☆ ”زندگی مسکرائے لگی“ سحریرہ جابر کا ناول،
- ☆ ”زر قاسم“ فرحت انصاری، شمیمہ طاہر،
- ☆ سہاس گل اور قرۃ العین رائے کے افسانے،
- ☆ ”دل گزیدہ“ ام مریم کا سلسلے وار ناول
- ☆ ”پرویت کے افسانے پاؤ کھیں“ نایاب جیلانی

کا سلسلے وار ناول اپنے اختتام کی طرف گامزن،

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،

عید کے پکوان، مہندی کے رنگ اور وہ تمام مستقل سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی کتب اسٹال سے طلب کریں

نوروری 2019

کر کے حلال کرتے ہیں۔ اور کیا ہو سکتا ہے۔
 ”ہم! چلیں اسے کل پر اٹھا رکھیں۔ ابھی تو
 میں راستے سے سچ کباب اور نہاری پکڑ لایا ہوں،
 وہی کھاتے ہیں۔ ساتھ نان بھی ہیں روٹی۔“ مومن
 نے اشتباہ انگیز انداز میں کہہ کر دادا کی بیوک بڑھادی
 تھی۔ ایسی عیاشی دادا نے بے سے بھی نہیں کروائی
 تھی۔ پوتے کی کمائی کھانے کا بھی الگ ہی لطف
 ہے۔ وہ خوش ہو گئے۔

”اٹھ جاؤ شادی میاں۔ جا بے باہر گاڑی کے
 ڈیش بورڈ سے شاہر اٹھا لائے، جس پر آپ کی
 نظر گرت کھولنے ہی پڑتی تھی اور جس کی وجہ سے آپ
 اتنی مٹی پلید کروانے کے باوجود نکلے بیٹھے ہیں۔
 جاؤ اور لے کر آؤ اندر۔ میں تب تک کپڑے بدل کر
 آتا ہوں، تم بچن سے پتلیں لے کر لاؤنچ میں چلو،
 وہیں کھانا کھاتے ہیں اور دادا آپ بھی اٹھیں باہر
 سے اب، باہر ٹھنڈ بہت زیادہ ہے، بیمار نہ ہو جائیں
 کہیں!“ وہ شاہزاد اور دادا دونوں کو بیک وقت کہتا
 اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہزاد منمناتا ہوا بولا۔

”تم ہمیشہ مجھے چول ہی سمجھتا۔ ایک تو
 تمہارے پیچھے میں دادا جی کا خیال رکھتا رہا، مسلسل
 ان کا دل بہلاتا رہا اور تم ہو کہ بجائے میرا احسان
 ماننے کے باتیں سنارہے ہو۔ نہیں کھانا میں کھانا۔
 ہاں لیکن میں جاؤں گا اس وقت تک نہیں جب تک
 کہ دادا جی کھانا کھا کر لیٹ نہیں جاتے۔ کیونکہ میں
 نے آج کے دن کے ان کی مکمل دیکھ بھال کی ذمہ
 داری لی ہے۔ سمجھا!“ شاہزاد سینہ ٹھونک کے جوش
 سے بولا تو مومن ایک قدم پیچھے ہو کر اس کے کندھے
 پر ہاتھ دھرتے ہوئے جذباتی انداز میں کہنے لگا۔

”مجھے تجھ سے یہی امید تھی میرے بھائی۔ میں
 تیری رگ رگ سے واقف ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں
 پیارے کہ تیری رگوں کی اکثریت کباب خنوں کے
 نام پر ہی پڑنے لگتی ہیں۔ یہ تو نہاری کا بھی ساتھ ہے
 رے پگے۔ چل اب۔ جا کے شاہر اندر لا اور پتلیں لے
 کر لاؤنچ میں۔ میں وہیں آتا ہوں۔“ وہ

اسے پکارتا ہوا سکون سے کمرے کی طرف چل دیا۔
 پیچھے دادا کا جاندار قہقہہ سارے میں گونجا تھا، شاہزاد
 کھستانی ہنسی ہنستا فوراً گیٹ کی طرف لپکا تھا۔
 رات کو بستر پر لیٹ کر سارا واقعہ ایک بار پھر فلم
 کی طرح اس کے تصور کے پردے پر جھلکانے لگا۔
 ماحور کا چہرہ، اس کی برہمی اور بے بسی پوری شدت
 سے اس کے احساسات پر حاوی ہونے لگیں۔ اس
 نے کروٹ بد کر کے کھڑکی کی طرف دیکھا۔
 کمرہ ہوش کے آخری لمحے تک اس کی سوچیں ماحور کے
 گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھیں۔

☆ ☆ ☆
 صبح کے آٹھ بج چکے تھے مگر بلا کی دھند چھائی
 تھی۔ ٹھنڈ پڑیوں میں مہس کر جوڑ جوڑ کڑکڑانے لگی
 رہی تھی۔ دادا کو چوبے پر دودھ ڈالنے کے لیے دیکھتے اور
 بھاری لوہے کا توڑ چوبے پر رکھ کر اس کے پیچھے آکر
 جلاتے ہوئے شدت سے احساس ہوا کہ یہ کام اب ان
 کے بس کے نہیں رہے تھے۔ مومن بہت احساس کرتا تھا
 لیکن لاکھ کوشش کے باوجود وہ ناشتا بنانے سے کئی کترانا
 تھا۔ اب تو آفس جانا ہوتا تھا تو ایسی ہڑ بھگ بجاتا تھا
 محض دودھ مکس میں بھر کر مائیکرو ویو میں گرم کرنا اور پھر
 فائنٹ نکل جانا۔ پیچھے دادا خود ہی جانے بگا ساتھ دو
 سلاٹس گرم کر لیتے اس کھا کر گزارہ کر لیتے۔ براہ ان
 کے لیے بھی صبح صبح گرم بستر چھوڑ کر بچن میں جانا بہت
 کٹھن ہوتا تھا۔ انہیں آج کل شدت سے مومن کی
 شادی کا خیال ستا رہا تھا۔

”چلو اور کچھ ناسی، ایک کپ چائے تو بستر
 میں ہی پکڑ دیا کرے گی۔“ اس طرح کے چھوٹے
 موٹے گمان انہیں مومن کی بیوی سے تھے۔ لیکن
 حیرت کی بات یہ تھی کہ دادا کے دو چار بار یہ موضوع
 چھیڑنے کے باوجود مومن نے بات گول کر دی تھی۔
 بلکہ مذاق مذاق میں یہ تک کہہ دیا تھا کہ آپ اپنی کروا
 لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ دادا کا دل کیا اپنی
 چھڑی سے اس کی ”چھتر ول“ کر ڈالیں مگر اب پوتا
 کماؤ ہو گیا تھا۔ روز با بون کے گھر سے کھانا تھا تو وہ

بشت نکلتے بلائیں لیتے نہ تھکتے تھے۔ ایسے اونچے لمبے
 کو بھلا وہ چھڑی کی مار مارتے اچھے لگتے۔
 آج بچن میں سردی سے کپکپاتے انہوں نے
 لپکا ارادہ کیا تھا کہ مومن کو شادی کے لیے راضی کریں
 گئے، اس کہیں گے کہ جلد از جلد اس لڑکی کے گھر
 والوں سے ملوانے انہیں۔

ماسی شوکت کے آنے سے دادا کو واقعی صفائی
 اور دھلائی کی طرف سے آسانی ہو گئی تھی۔ کپڑے
 دسل کرتے ہوئے ماسی شوکت کے ہاتھ چائے تو وہ ماسی
 شوکت کے ہونے پر حیرت مناتے۔ پر ظالم صبح صبح اٹھ
 کر بچن میں آنا اور ناشتا بنانا۔ یہ کام بس سے باہر ہوتا
 جا رہا تھا۔ وہ دودھ کا چوبلیا لپکا کر کے اور توڑے کا بند کر
 کے آکٹا کر باہر صحن میں چلے آئے۔ ساری رات سے
 پڑی ٹھنڈی گرمی پر بیٹھے ہوئے انہیں جبر جھری کے
 ساتھ بے اختیار مومن کی ماں کی یاد آگئی۔

چار سال پہلے کی ہی تو بات تھی جب صبح صبح
 انہیں بستر میں گرم گرم چائے بھی مل جاتی تھی اور وہ
 صحن میں آتے تو وہاں کرسیوں کے درمیان میں
 ایک ٹیسی چل رہی ہوتی۔ دادا کی آنکھیں میگی سی گئیں۔
 مومن کی ماں آصفہ ان کی پیچھے تھی۔ بڑی خدمت گزار
 تھی۔ جوانی میں بیوی کا ہی محض دادا اور اپنے اکلوتے
 بیٹے کے لیے۔ کتنے رشتے آئے مگر اس اللہ کی بندی
 نے چچا کو تنہا چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ دادا نے جوان بیٹی کی
 میت کو کندھا دیا تھا۔ ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔

بیوی کو مرنے پر عرصہ بیت چکا تھا۔ مومن بھی
 محض نو سال کا تھا، جوانی تھی کوئی دیکھتے تو اپنا آپ خود
 غرض لگتا۔ جب چچا نے دل پر پتھر رکھ کر رشتے کی
 بات چلا دی۔ لیکن جیسے ہی آصفہ کے کان میں پڑی
 ، بچن سے مٹی کے تیل کے لیکن اٹھالائی۔ خود پر اور
 مومن پر ڈھیر سارا تیل اغڑایا، ہاتھ میں ماچس کی ڈبیا
 پکڑی اور چچا کو دھکی دی کہ ابھی کے ابھی اگر انہوں
 نے قرآن پر حلف نہ دیا کہ کبھی بھی ان کے دوسرے
 بیاہ کی کوشش نہیں کریں گے تو وہ مزید ایک لمحہ ضائع
 کیے بغیر خود کو اور ان کے پوتے کو آگ لگا دے گی۔

دادا ایسا سمجھ کہ کھڑے قدموں گر گئے۔ آصفہ اور
 مومن لپک کر اٹھانے کو آگے بڑھے۔ دادا نے پوتے
 کو سینے میں بھینچ لیا جو مٹی کے تیل میں نہایا ہوا تھا۔ جی
 بھر آیا اور بچوں کی طرح رو دیے۔ مومن نا سمجھ تھا مگر
 دادا کو یوں رو دنا دیکھ کر بے اختیار کھنکھانے لگا۔ صحن کے
 پتھوں سچ تین نفوس بے بسی کی انتہا پر پہنچ آئیں۔ سو بھا
 رہے تھے۔ تینوں کے اندر دکھ پل رہے تھے لیکن پھر
 تینوں نے ایک دوسرے کو سنبھال لیا۔ وہ ایک
 دوسرے کی ذات میں کم ہو گئے۔ ان کے دکھ سکھ
 ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے۔ آصفہ نے خود پر
 جبری بزرگی طاری کر کے بیٹا جوان کر لیا۔ دادا مزید
 بوڑھے ہو گئے۔

دادا ریلوے میں ملازم تھے، مومن کے بابا
 بھی۔ بس دونوں کی پینشن سے سچ تان کے گز رہا
 ہو رہی تھی۔ کی میں بھی آسودگی تھی کیونکہ خواہشات کا
 دائرہ چھوٹا تھا۔ مومن کا بچپن گزر گیا تو کالج میں آکر
 اس کی چھوٹی موٹی فرمائشیں دادا بخوش پوری کرنے
 لگے۔ وہ صابر بچہ تھا لیکن جوانی ترنگ پیدا کر رہی تھی
 ہے۔ دیکھا دیکھی دل رنگین چیزوں کی طرف ہمک
 ہی جاتا ہے۔ دادا تو خوش ہوتے مگر آصفہ کو تشویش
 ہونے لگتی۔ وہ اشارے کنائے میں منع کرتی اور دادا
 نظر انداز کر دیتے۔ اگلے دن ہی پوتے کی فرمائش
 پوری ہو جاتی۔ اتنا عرصہ آصفہ اس قدر کفایت سے
 چلی تھی کہ دادا کا جی کرتا تھا کہ وہ کچھ خرچ کریں۔
 آصفہ نے تو محض مومن کے مستقبل کے لیے جوڑا ہی
 تھا۔ گھر کی حالت بھی بہتر بنائے رکھی تھی مگر اپنے بل
 بوتے پر۔ رنگ روغن سے لے کر صوفوں کی پوشش
 تک وہ خود ہی دادا اور مومن کو ساتھ ملا کر کر ڈالتی تھی۔
 پھر گھر کا یہ سکون بھی تاراج ہوا۔ آصفہ کو بیٹھے
 بٹھائے بیماری نے گھیرا۔ دبائے رکھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ
 جب تکلیف برداشت سے باہر ہوئی اور فوت ڈاکٹر
 کے پاس جانے کی آئی تو ڈاکٹر نے ہاتھ جھاڑ دیے
 تھے۔ معدے کا کینسر تھا۔ لاسٹ اسٹیج تھی۔ ڈاکٹر کے
 بقول اب کچھ ہو تو نہیں سکتا تھا مگر مرلیفہ کی تکلیف کم

کرنے کے لیے کچھ دوائیں تھیں، جو دی جاتی تھیں تو مرلیضہ آرام سے ”مر“ جاتی۔ دادا تو کم صبر ہی ہو گئے۔ آصف نے انہیں سختی سے منع کیا کہ ان پر کسی قسم کا پریس نہ لگایا جائے، مگر دادا نے اپنے خزانے کا من کھول دیا تھا۔ دوائیں منجی تھیں لیکن دادا نے پروا نہیں کی۔ آصف نے بہتیرے ترلے کیے کہ مریتے ہوئے پر پیسہ برباد نہ کریں، مگر دادا کو کتنی بچائی تھی چاہے جیسے بھی ہو۔ آصف کی بہن بھی، یہ بات تو وہ عرصہ ہوا بھول بھال چکے تھے۔

مومن ماں کی حالت سے پریشان تھا، اس نے دادا سے ”فرمائش“ کی کہ امی کو بچالیں۔ تھڑا بیر کا تاڑسا لپا پوتا بوڑھے دادا کے گھٹنوں میں منہ دے کر بے حد رو دیا اور دادا سے اس کا رونا نہیں دیکھا گیا۔ وہ رپورٹس لے کر کمرے کی گھوڑے۔ جہاں سے آس گئی، وہیں مومن کو ساتھ لے کر چلے جاتے۔ آصف کو دادا پوتا کی مجلس خورانی وارانہیں کھا رہی تھی، اس لیے ایک رات دونوں سے نظر بچا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس رات سونے سے پہلے مومن ماں کے پاؤں دبا رہا تھا تو آصف نے اسے پاس بلا کر اس کا سر سینے پر رکھا اور دادا کے لیے خصوصی ہدایت دیں، بالکل ویسی جیسی کہیں ضروری کام سے جانا نہ جاتا تو دے کر جاتی تھی۔ مومن ماں کے سینے پر سر رکھنے غنودگی میں چلا گیا تھا۔ آخری بار اسے ماں کا ممتا سے بھر پور کس ل رہا تھا۔ اسی نے مومن کی پیشی نیند سلا دیا اور آصف کو اب دی

گئی تھی۔ مومن کی تو ماں مری تھی، دادا بھی ٹوٹ چھوٹ گئے۔ ان کا بڑھاپا اٹھانے سے عاجز تھا اور عم تھے کہ انہیں تاک تاک کر نشانے پر رکھتے رہے۔ ایسا انسان سا نظر آتا تھا ہر کونہ مومن کا کالج سے گھر واپس آنے سے کترانے لگا۔ ٹیوشنز بڑھانے کے بہانے زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا اور گھر آتے ہی بڑکسو جاتا۔ اپنے دکھ میں بوڑھے دادا کی ٹھیک سے خیریت بھی دریافت نہیں کر پاتا۔ وہ کیا کھا رہے تھے۔ کیسے بنا رہے تھے۔ دوا لے رہے تھے یا نہیں۔

ان باتوں سے وہ یکسر بے نیاز ہو گیا تھا۔ نتیجتاً دادا کی حالت بگڑ گئی۔ ایک دن شام گھر پر گھر واپس آیا تو دادا کو برآمدے کے ٹھنڈے گندے فرش پر بے سہہ گرا پایا۔ اوسان خطا ہونا کسے کہتے ہیں، اس گھڑی مومن کو ادراک ہوا تھا اور اس پر ساتھ ہی یہ عقدہ کھلا کہ دادا اس کے لیے کیا تھے۔ اگر انہیں بھی کچھ ہو جاتا تو اس کا کیا بنتا۔ وہ اکیلا کسی قابل نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم تھا کہ مومن کیسے اس کے من سے جج ہو جاتے ہیں۔ گھر کی چوٹی مومن پرستوں کوں کرنا ہے۔ راشن کون لاتا ہے۔ اس کی کالج کی فیس کہاں سے آتی ہے۔ ایسے چھوٹے بڑے کتنے ہی تارے تھے جو اس کی آنکھوں کے آگے ناچ گئے۔

لیکن ان تمام باتوں پر ایک احساس جو سب سے زیادہ حاوی تھا وہ دادا کے کھوجانے کا ڈر۔ ایک آخری خونی رشتے کے مرجانے کا ڈر۔ جس اس ایک ڈرنے سے اسے ہوش کی دنیا میں لا چکا تھا۔ وہ دادا کو شادی اور محبت بھائی کے ساتھ فوراً ہسپتال لے کر گیا تھا۔ معمولی سا انجاننا کا ایک تھا، مگر ڈاکٹر نے یہ احتیاط کرنے کو کہا تھا اور مومن نے دادا کو کسی چھوٹے کالج کی طرح ٹریٹ کرنا شروع کیا۔ دادا کے ہسپتال سے ڈسچارج ہونے سے پہلے مومن گھر گیا۔ بڑوں میں کام کرنے والی ملازمہ سے اجرت پر سارا کھر دھلانا۔ واش روم سے لے کر کچن تک۔ بڑروم سے لے کر گھر کی چھت تک پورا گھر سر پر کھڑے ہو کر صاف کر دیا۔ کھانا دادا کے گھر آنے پر شادی کی

نے بھجوانے کا کہہ رکھا تھا سواں طرف سے بے فکر تھی کیونکہ وہ ہر کام کر سکتا تھا سوائے کوکنگ کے۔ اس ہنر سے وہ بالکل نابلد تھا۔ آصف نے واقعی اس کے بہت لاڈ اٹھائے تھے۔ ماں کی یاد اس کی آنکھیں بھگو گئی۔ اس نے فوری طور پر خود کو اس جذباتی حصار سے نکالا اور گیٹ کے قریب کھڑے ہو کر ایک ناقدانہ نظر دھلے دھلائے گھر پر ڈالی۔ کم از کم صاف ستھرے گھر کا اثر دادا کی صحت پر اچھا پڑے گا۔ وہ ہر طرف سے تسلی کر کے دادا کو ہسپتال سے واپس لانے

کے لیے چلا گیا تھا اور پھر شام کو جب وہ دادا کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو ان کے چہرے کے تاثرات اس قدر خوش گوار تھے کہ مومن کو خود کی استے دن کی کوتاہی پر بے حد افسوس ہوا۔ ابھی بھی وہ دادا کو کچھ ہو جانے کے خیال سے قراٹھتا تھا۔

پھر اس دن کے بعد سے سب روٹین میں آتا چلا گیا۔ مومن دادا کو مناسب وقت دینے لگا تھا۔ شام کو وہ دادا اور پوتا کے گھر کی صفائی کرتا۔ اور پھر رات کا کھانا وہ ل کر بیٹائے۔ مومن کو دادا نے انڈیا بنانا سکھایا تھا مگر وہ مومن کو اسی قدر آسکا کہ انڈیا توڑنے کے لیے وہ پہلے اسے کاؤنٹر پر توڑتا اور پھر پیچ سے پیچ کر اسے فریجنگ پین پر انڈیل لیتا۔ ہفتے میں ایک دن کپڑوں کی دھلائی کا ہوتا اور اس دن سارا خلد دیکھتا کہ کپڑے جب کپڑے دھوتے ہیں تو کیا بھونچا آتا ہے۔ لیکن اس سب میں یہ ضرور تھا کہ دادا اور مومن ایک دوسرے سے بھل گئے۔ ایک دوسرے کی سنگت میں انہیں کھانے کا بد مزہ ہوتا، روٹی کا کچا ہونا یا جلا ہونا اتنا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے پھوڑ پنے کے عادی ہو رہے تھے۔ وہ اب بلاوجہ ایک دوسرے کو اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔ اور یہی چیز دادا کو زندگی کی طرف کھینچ لائی۔ وقت گزرتا تو سب سے لیکن گزارنے والے کو پھیرے دے کر جاتا ہے۔ مومن ایم بی آئی کی کر کے نوکری سے جاگتا تو یو پی نہیں۔ بڑا روندے گئے تھے دونوں وقت کے گرد بادی تھیں۔

نوکری سے پہلے سب کچھ ایک ترتیب سے چل رہا تھا پر اب مومن کو کچ کے وقت اس قدر جلدی ہوتی تھی کہ دادا سے محض سلام دعا ہی ہو پانی، لیکن اس سارے کا گلہ دادا کو ہر گز بھی مومن سے نہیں ہوا۔ خلاف توقع انہوں نے اس کا دوسرا حل سوچنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں گھر کے لیے حج معنوں میں گرہن چاہیے تھی۔ اب ان کا اکیلے مومن سے گزارہ نہیں تھا۔ وہ بوٹے کی خوشیاں دیکھنا چاہتے تھے۔ چل چلاؤ تو تھا ہی مگر حسرتیں عمر بیتنے کے ساتھ جوان ہوتی

ہیں۔ اپنے گھر کو مومن کے بیوی بچوں سے سجاد کھنا ان کی حسرت تھی اور آج، ابھی انہوں نے با آواز بلند مومن کو کھونٹے سے باندھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

زندگی ہمارے لیے اس وقت امتحان بنتی ہے جب ہم اپنی کمزوریاں اس کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔ زندگی کو برتنا آنا چاہیے، اس کی مشکلات اور مصائب کا بہادری سے سامنا کرنا، ہمیں اشرف المخلوقات ثابت کرتا ہے ورنہ گزرتو کبھی کی جاتی ہے۔

عرصہ ہوا، ماحور کو ایسی کوئی جگہ یاد نہیں تھی جب اس نے ہنس کر سورج کی کرنوں کا استقبال کیا ہو، جب اس نے بنا ڈانٹ ڈپٹ کے بہن بھائیوں کو اسکول اور کالج روانہ کیا ہو۔ ماں کے جانے کے بعد اس پر اچانک اس قدر ذمہ داریاں پڑی تھیں کہ اس کے لیوں نے مسکراتا بھلا ڈالا۔ زبان کی شیرینی جھڑ گئی اور وہ چھوٹی سی گیارہ سال کی بیٹی خود سے چھوٹے بہن بھائیوں کو پالنے میں جت گئی۔ زہان سب سے چھوٹا تھا اور اس وقت محض نو ماہ کا تھا۔ اس کو سنبھالنا اتنی ہی نا تجربہ کاری کے لیے بے حد دقت طلب تھا۔ ننھے بچے کے لنگوٹ بدل بدل کے وہ ہلکان ہو جاتی۔ وہ ان سب کی ماں بن گئی۔ اسے روٹی بنانا نہیں آتا تھا۔ اس نے پیڑے کو تیل کر اس کے اوپر گول تھالی رکھ کے روٹی کو گول کرنا شروع کیا، اضافی آٹا اور دگر سے ہٹا دیتی۔ آہستہ آہستہ روٹی پکنا آ گیا۔ بہت بار جلی، کئی بار کڑکڑا پڑ بن جاتی مگر وہ سب بہن بھائی ایسے صابر نکلے کہ آف کیے بغیر پانی کے ٹھونٹ بھر بھر کے نگل لیتے۔ گیارہ سال کی بیٹی جو خود ابھی ماں سے لیٹ کر سوتی تھی یک دم اتنی بڑی ہو گئی کہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو لپٹا کے سونے لگی۔ عقلی بغل کا حال تب بھی ایسا ہی تھا، نثر کرنے کے بعد انہیں یہ تک ہوش نہیں رہتا تھا کہ رات کو گھر کا دروازہ ہی لاک کر آئیں۔ ماحور چھوٹے سے سیف کا ہاتھ پکڑ کر باہر صحن تک جاتی اور گیٹ پر تالا ڈالتی۔ سیف اس دوران اپنا پلاسٹک کا بلڈا ہاتھ میں لیے

لہر اتار رہا تھا جیسے نادیہ قوتوں سے بھڑ رہا ہو۔

صد شکر تھا کہ ان بچوں کو راشن بانی کا مسئلہ نہیں ہوا نہ ہی اسکول کی فیسیں رکی تھیں۔ عقل مغل کے بڑے بھائی نے اپنی زندگی تک یہ ذمہ داری خوب نبھائی۔ چھوٹے بھائی کی دگرگوں حالت میں ہر ممکن سدھاری کی کوشش کے بعد جب انہیں ناکامی ہوئی تو خود ہی مہینے کے شروع میں راشن دے جاتے اور بجلی کا بل جمع کروا دیتے۔ ہر ماہ سہولت سے چاروں بچوں کی اسکول فیس بھی جمع ہو جاتی۔ ماحور، زوہان کو اسکول جاتے ہوئے عاقب بھائی کی اماں کے حوالے کر جاتی۔ ان کا ماحور کی ماں سے بہنا تھا اور ان بچوں کی ایسی حالت پر ان کا بھی جی کٹتا تھا لیکن ہر کسی کو اپنے اپنے گھر کی سوجبوریات تھیں۔ یہ ضرور تھا کہ وہ پانچ گھنٹے کے لیے زوہان کو خوش اسلوبی سے سنبھال لیتی تھیں۔ ناہید آئی نے ہی ماحور کو لنگوٹ باندھنا اور بدلنا سکھایا تھا۔

اسکول کی سالانہ سب بہن بھائیوں کے لیے بے حد محنت ثابت ہوئے۔ تایا جس قدر ممکن تھا، ان کا بوجھ اٹھانے ہوئے تھے۔ وہ شاید اتنی سہولت سے اس لیے کر پار ہے تھے کیونکہ تائی گزر چکی تھیں، دو بیٹے ملک سے باہر تھے اور دو بیٹیاں تھیں جو کالج، یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھیں۔ دونوں بیٹیاں، ماحور اور اس کے بہن بھائیوں سے بے حد خار کھاتی تھیں اور اپنے بھائیوں کے بھی فون پر کان بھرتی تھیں، اس کے باوجود تایا کو گوارا نہ ہوا کہ ان بن ماں کے بچوں کو رلنے کے لیے چھوڑ دیں، جن کا باپ بھی مردے سے بدر تھا۔

ماحور نے بہت کم عمری میں ہی ہاتھ پاؤں مار کر چند بچے اکٹھے کر لیے تھے ٹیوشن کے لیے۔ تھوڑا بہت جب خرچ نکل آتا جو زیادہ تر عقل مغل اپنے نشے کے لیے بھینسا لیتے۔ اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی اور باپ سے خوف زدہ بھی رہتی تھی لہذا احتجاج نہیں کر پاتی تھی۔ کی بار ایسا ہوا کہ عقل مغل، تایا کا لایا ہوا راشن کہیں بیچ آتے اور ان سے ملنے والے پیسے نشے

میں اجاڑ دیتے۔ وہ دن ماحور کے لیے بے حد تکلف دہ ہوتے۔ سر پر سارا مہینہ بڑا ہوتا اور پکانے کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایسے میں وہ آسو جیتی، دو بچے کی بکل مارنی، سیف کا ہاتھ تھامتھی اور سبزی والے کی دکان کے پاس جا کھڑی ہوتی۔ ایک سائیڈ پر بیٹھتی مٹی کی مڑی سبزیوں میں سے چن چن کر بہتر حالت کے آلو پیاز اٹھاتے اور ان کی آگ سے گھس گھس کر روٹتے چھوٹے بہن بھائیوں کے خالی پیٹ اس سے یہ کام بھی سہولت سے کروا لیتے۔

ایک بار تایا نے اسے بڑی چٹنے دیکھ لیا۔ وہیں پر دو تھپڑ لگائے اور گھسیٹے ہوئے کمرے لے کر آئے۔ وہ اسے کندھوں سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھتے رہے کہ راشن ڈلوانے کے باوجود وہ گندی غلیظ سبزی کیوں اٹھا کر لاتی ہے، جواب میں اس کی ایک ہی چپ تھی۔ بہن کے ایک تار بیتے آنسوؤں کو دیکھ کر ریاں آگے بڑھا اور تایا کو فریاب کی ساری کارستانیاں سنا ڈالیں۔ تایا ششدر سے بچوں کے کلمائے چرے دیکھ کر رہ گئے۔ ماحور کو کھینچ کر سینے سے لگا اور ایک لمحے کے لیے عقل مغل سے ملنے کی کوشش کی۔ اس دن سے تایا نے چوری چھپے عقل مغل کے روز کے روز کچھ روپے دیے شروع کر دیے تاکہ وہ اپنی نشے کی لت پوری کرنے کے لیے بچوں کی خوراک نہ اجاڑیں۔ تایا کی اس مہربانی کا نتیجہ نکلا کہ وقت سکون سے گزرنے لگا۔ لیکن جلد ہی تقدیر کی جھولی سے ایک اور آزمائش کھینکھانی ہوئی آگئی۔ ماحور اور اس کے ننھے بہن بھائیوں کو قسیم کر گئی۔ تایا کی اولاد کو پہلے ہی پر خاش تھی ان سے، سواب کھل کر اظہار ہوا اور ہر طرح کا تعلق واسطہ ختم ہوا۔

مصائب اور مشکلات کا انبار جیسے برساتی مینڈکوں کی طرح گھر کے ہر کونے کھدرے میں ٹرانے لگا۔ ماحور نے بمشکل ابھی میٹرک کیا تھا لیکن اب نوکری کے بغیر چارہ نہیں تھا اور یوں اس نے سب سے پہلی جاب ایک پرائیوٹ اسکول میں بطور کسٹوڈین کی۔ یہ انتہائی مشقت طلب جاب تھی لیکن

اس وقت تنخواہ کے آٹھ ہزار بھی اس کے لیے خزانے سے کم نہیں تھے۔ اس جاب کا انتظام بھی عاقب بھائی نے کر کے دیا تھا، چونکہ اس کی تعلیم ابھی محض میٹرک تھی اس لیے اس سے بہتر جاب کا صرف سوچا جاسکتا تھا۔ عاقب بھائی اور ناہید آئی بہت ساتھ دیتے تھے۔ چھٹی درجہ ماحور گھر سے باہر رہتی اسے پیچھے کی فکر نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ دونوں ماں بیٹا پورا دھیان دے کر اس کے لیے سارا سارا کام کر دیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنی سارا حور سے لینے کے لیے رکتی تو وہ اس کے پاس آتا ہی نہیں تھا، ہمک ہمک کر واپس ناہید آئی کی گود میں گھستا۔ احسان اپنی جگہ بیکر ایسے زوہان کی اس حرکت سے تکلیف ضرور ہوتی تھی۔ حالانکہ اس میں کمی کا تصور نہیں تھا مگر حالات اس طرح کے تھے کہ زوہان کو وہاں چھوڑے بغیر چارہ ہی نہیں تھا اور پھر زبردستی لانے پر وہ ساری رات وقفہ وقفے سے روتا رہتا۔ عقل مغل کی نیند ٹوٹنے کے ڈر سے وہ اسے کندھے سے لگائے لپکتی رہتی۔ یوں تقریباً ساری رات جاگتے کٹ جاتی اور اگلی صبح وہ پھر سے ایک پیر پر کھڑی ہوتی۔

بہت لمبا وقت تھا مگر گزر گیا کیونکہ گزر جانا وقت پر لازم ہے۔ اس نے میٹرک کے بعد پرائیوٹ انٹر کیا اور پھر میٹرک ڈیوڑیوں میں گریجویشن۔ گزشتہ چار سالوں میں اس نے کئی چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے گھر کی گاڑی کھینچی تھی۔ سیف بھی جوہنی میٹرک کے انگریز اسے فارغ ہوا، کمپیوٹر میں چھوٹا موٹا ڈپلوما لینے کے بعد میٹ کینے میں عارضی نوکری کرنے لگا۔ ماحور نے موبائل کمپنی کی فرنیچر میں جاب اشارٹ کی تو ساتھ ہی ایم اے اکنامکس میں بھی داخلہ لے لیا، یوں زندگی جو چند بل فرصت کے ہاتھ میں تھاتی تھی وہ بھی گئے۔ اسے ہنسنا، بولنا حتیٰ کہ سونا بھی بھول گیا۔ مشقت مشقت اور بس مشقت۔ کسی جیل کے قیدی کی طرح۔ بنا بیگار بنا انتظار۔

لمحہ لمحہ مرتے ہیں وہ بچے جن کو بہت چھوٹی عمر

میں زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ تارے ہوتے ہیں جو زمین پر اتارے جاتے ہیں مگر ان کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ ان کی ٹٹماہٹ کھو جاتی ہے۔ یہ پانچ بہن بھائی بچپن جی کر نہیں، فکر اور ذمہ داری کی قباؤں سے بڑے ہوئے تھے۔ انہیں کبھی کسی تہوار نے خوشی نہیں دی تھی کیونکہ ان کے نازاٹھانے کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ ماں نہ باپ اور نہ ہی پیسہ۔

مومن تراب وہ پہلی کرن تھا جو بند کواڑوں سے پیر باندھ کر زبردستی عقل زندہ زندگی میں روشنی کرنے چلا آیا تھا۔ ماحور کو زہر لگا تھا یہ شخص۔ حالات نے مزاج ہی ایسا کر دیا تھا کہ کوئی بھی بھاتا ہی نہیں تھا۔ ہر کوئی اسے اپنا استحصال کرتا محسوس ہوتا تھا۔ مومن تراب کے لیے بھی اس کے دل میں ہرگز کوئی جذبات نہیں تھے، حتیٰ کہ جب مختار انصاری کے چنگل سے بچ نکلنے کے بعد مومن نے اس کی مدد کی تھی تب بھی اسے کچھ الگ محسوس نہیں ہوا تھا۔ لیکن پھر میں جو تک اس وقت لگی جب مومن، رائے کے کہنے پر ان دونوں کو گھر ڈراپ کرنے آیا تھا۔ سارا رستہ اس نے مومن کی نگاہوں کو بیک ویو مر سے خود پر مرکوز پایا تھا۔ اس لمحے پہلی بار اس کی دھڑکنیں بکھری تھیں مگر وہ ساٹ چہرہ لیے بھی رہی۔ پھر جب اپنے ہی گھر کے صحن میں پھیل کے بیٹھے مومن کو اس نے بچن سے جھانکا تھا تب بھی کوئی ٹٹھا احساس اس کے اندر چٹکیاں لیتا رہا اور کل رات یہ لکا چھپی کا کھیل بھی ختم ہوا۔ مومن تراب کے اظہار نے اس کے چاروں اور یوں گھیرا ڈالا تھا کہ فرار کی راہ مسدود ہو گئی تھی۔ وہ صبح میں تمام رات سوئی جاگتی کیفیت میں اسے ہی دیکھتی رہی اور خواب میں اس نے مومن تراب کے ساتھ زندگی بھر کا سفر طے کرنے کے پیاں کیے تھے۔ زندگی کا جودوٹا تھا اور اگلی صبح بے حد خوش گوار تھی۔

☆☆☆

ہلکی پھلکی گنگناہٹ کے ساتھ چھوٹے سے لاؤنج سے متصل کچن میں کھڑی رات کا کھانا بناتی

ماحور کو حیرت سے سب نے سنا تھا۔ سیف اور ریان نے بھنویں اچکا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور مگر دے۔ سدا کی خاموش طبع جنت نے بھی ہوم ورک کرتے ہوئے سر اٹھایا اور اچک کر مایا ایسا کا چہرہ جانچنے کی کوشش کی۔ ایک واحد زونی تھا جو ریوٹ ہاتھ سے پھینکنا اٹھا اور پھدکتا ہوا پگنی میں ماحور کے پاس چلا آیا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی تین بھی کام کاج چھوڑ دیں آگے اور بنا آواز کیے ماحور کی پشت پر ایک ترتیب سے کھڑے ہو گئے۔

”ایسا کیا بات ہے؟“ آپ اور گانا کیا کوئی نئی جاب مل گئی ہے؟“ زونی نے ایشیائی سے پوچھا۔ ماحور اسی طرح ہنسا میں چچہ چلائی مصروف مگر مسکراتے لہجے میں بولی۔

”ہم..... نہیں میری جان..... جاب تو وہی ہے مگر کچھ اور مل گیا ہے..... کچھ ایسا جواب تک بھی نہیں تھا۔“ وہ واقعی بڑے موڈ میں تھی۔

”ہیں۔ جی! زونی کی بات چیں جریں اور منہ میں پانی آ گیا۔“ آپ کو خوبانی کی گمشدگی میں سے باوام ملاتا ہے۔ مجھے تو آج تک نہیں ملا۔“ اس نے مایوسی سے سر جھکایا۔ ماحور کو کسی آگئی۔ پیچھے بت بن کے کھڑے باقی تینوں نے بھی بمشکل اپنی ہنسی کا گلا گھونٹا۔

”بائے میرا اپنا راجہ۔ مجھے پہلے بتایا ہوتا، میں اپنے زونی کے لیے اصلی والے باوام لے آئی۔ وہ بھی زیادہ سارے۔“

ماحور نے اسے بہلاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی چوہے کی آغوش میں کمر کے کوچے پر چوہے پر دھرنا۔ ”ٹھیک ہے ایسا۔ اب لا دیتا۔ لیکن آپ بتائیں تاکہ آپ کو کیا ملا۔ میں نہیں مانگوں گا آپ سے۔“ جواب کا، وہ آپ کا۔ جو میرا، وہی بس میرا۔“ زونی کی اتنی کھجور داری کی بات پر ماحور نے سر دھنا اور توہ کے نیچے آگ جلاتے ہوئے بولی۔

”زونی۔ میری جان، تمہاری ایسا کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی اور اصول خوشی ملی ہے۔ ایسی

خوشی جس نے مجھے ہنسا سکھا دیا۔ مجھے مومن ملا ہے زونی..... مجھے صرف میرا مومن ملا ہے۔“ وہ جذب سے آنکھیں میچے بولی اور اس کے پیچھے یک دم نلوا بلند ہوا۔

”اوووو!“ وہ ہڑ بڑا کے مڑی۔ دیکھا تو سیف، ریان اور جنت ایک لائن میں کھڑے تھے اور انہوں نے با آواز بلند کیا تھا اور اب ماحور کی ہوا سے کچھ ہاتھ پر ہاتھ مار کر نفس رہے تھے۔ وہ مصروف تھے سے تھی، چوہے بند کیے۔ کاؤنٹر سے سین اٹھایا اور تینوں کے پیچھے لپکی۔ اگلے چند منٹوں میں کھر میں وہ بابا کار بھی تھی کہ اللہ کی پناہ۔ مگر یہ شور شرابا بہت دل خوش کن تھا۔ مومن ان سب کو پسند تھا۔ وہ بناوٹی شکل تھا۔ ایک دم خالص اور شفاف۔

دوبار پار سے رائے نے جب یہ شور سنا تو وہ نہیں پانی اور دوڑی چلی آئی۔ ماحور کو گلے لگا کر مبارک باد اس نے ایسے دی تھی جیسے مٹکی کے لٹا ملے ہوں۔ کچھ دیر میں عاقب بھائی بھی پہنچے آئے تو محفل کو چار چاند لگ گئے۔ انہوں نے مومن کو پسندیدگی کی سند دے کر اگلا کمال یہ کیا کہ سیف سے اسے کال کر دے کے بلا لیا۔ سب نے پر جوش انداز میں عاقب بھائی کو شاباشی دی۔ ماحور ہکا بکا یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس کے سان و گمان بھی نہ تھا کہ عاقب بھائی ایسی پھرتی دکھائیں گے۔

تین منٹ میں مومن تراب حاضر تھا۔ سب کے ذرا ہٹ کے کیے گئے استقبال نے ایک بل بوتے پر اس کی بھی شکم گردی مگر وہ اتنی خود اعتماد تھا۔ جی ہی دیر میں اندر لاؤنج کے صوفے پر ”جوانی“ کی طرح پھیل کر بیٹھا عاقب بھائی کے ساتھ قہقہے لگاتا، سیف اور ریان کے کانوں میں کھر پھر کر تا۔ زونی کے گال کھینچتا وہ اتنے مزے میں تھا جیسے سسرال مگلا دے کی رسم پر آیا ہو۔ رائے اور جنت نے بھی سنہال لیا۔ چائے کے ساتھ جو بھی اس وقت ممکن تھا، لا رکھا۔ چنڈیکٹ، باسی کیک، ذرا سی نمکو اور شام

کے بچے ہوئے پکڑے جو ماحور آفس سے واپسی پر راستے سے لپٹی آئی تھی۔ مگر ان سب میں بھی مزاح تھا۔ خوشی کا ذائقہ تھا۔ ماحور کو پہلی بار مومن کے سامنے بیٹھنا عجیب لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر سننا یہ تھے۔ وہ یہاں وہاں پھر کفاتو کے کام بھٹکا رہی تھی حالانکہ جانتی تھی وہ ہر دوسرے منٹ ایک گہری نگاہ اس پر ڈالتا تھا مگر اس نے بھی مومن سے نگاہیں چار کر کے نہ ہٹائیں۔ جنت نے بھی ایک ایک ایک نکتے میں ڈولتے، جھومتے جھانتے میل محل کھر میں داخل ہو کر مین لاؤنج کے وسط میں دھڑام سے گر نہیں گئے۔ بے ڈھنگے پین سے کرتے ہی وہ بے سدھ ہو چکے تھے اور باقی سب بھی ایک دم چپ۔ شرمندگی نے ماحور اور اس کے بہن بھائیوں کے چہرے پر زردی پھیر دی تھی۔ ماحور کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بابا کو محفل سے غائب کرے یا خود کو۔

لیکن اگلا بل بہت حیران کن تھا۔ مومن نے صوفے پر سے دوپٹن اٹھائے اور نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عقل مغل کے سر کو اونچا کر کے اس کے نیچے سا دیے۔ اب وہ قد سے آرام دہ حالت میں محسوس ہوتے تھے۔ سب کو دونوں ہاتھوں سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے، سرگوشی میں خدا حافظ کہا اور عاقب بھائی اور رائے کو بھی چلنے کا سگنل دیا جیسے یہاں اسی کے ساتھ آئے تھے۔ وہ دونوں بھی اس کے اتنے کبیر تک روئے پر حیران ہوئے آہستہ کے پیچھے ہی نکل گئے۔ سارے میں ایک دم سکوت چھا گیا۔ مومن کے اس عمل نے ان سب کو ایک دوسرے سے نگاہ چرائی پر مجبور کر دیا تھا۔ سیف نے ایک طویل سانس آہستہ سے خارج کی اور اندر کمرے سے کبل لا کر عقل مغل کے اوپر ڈال دیا۔ یہ مومن کے عمل کا رد عمل تھا اور اب سے پہلے یہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ماحور کے پھر ہوئے چہرے پر بھی شرمندگی کی لکیریں تھیں۔ سیف کو یقین تھا کہ آج کے بعد سے یہ عمل روز دہرایا جائے گا، اس میں بھی چوک نہیں ہوگی۔ وہ

آگے بڑھا اور ماحور کو کندھوں سے تھام کر نرمی سے اس کے کمرے کی طرف دھکیلا۔ باقی سب کو بھی کمروں میں بیچ کر بنا آواز لائٹ آف کی اور خود باہر گیٹ بند کرنے چلا گیا۔

باب لا رہا ہوتا ہے، غیر ذمہ دار بھی ہو سکتا ہے، بدکار بھی۔ مگر شرع کہتی ہے کہ اس کا احترام لازم ہے۔ یہ وہ ناؤ ہے جس کے پینڈے میں چھید بھی ہو تب بھی پار لگنے میں کام آتا ہے۔

☆☆☆

گلوری بیڈروم میں اس وقت نیم تاریکی پھیلی تھی۔ صبح کا وقت تھا مگر کمرے کی کھڑکیوں پر پڑے دیزر پردے ہٹائے نہیں گئے تھے۔ ہیڈنگ کی وجہ سے کمرہ گرم تھا۔ سارے میں برقیوم اور ایر فریشنر کی ملی جلی خوشبو پھیلی تھی۔ کمرہ کچھ کچھ ٹھنڈی حالت میں تھا۔ آج صبح ہی منہ اندر میرے عادل یا شاتین دن کے لیے کراچی گئے تھے۔ ان ہی کے کچھ کاغذات ڈریسر پر، کچھ فالتو کپڑے سیٹی پر پڑے تھے۔ جہازی ساؤنڈ پر ناعمہ پاشا پڑھ رہی تھیں۔

وہ تین دن سے سخت اذیت کا شکار تھیں، جس کا اظہار تک نہیں کر سکتی تھیں۔ پچھلے تین دن اور تین راتوں سے عادل پاشا کے دیے گئے لفظوں کے گھاؤ اور کچھ کے انہیں ادھ موا کر چکے تھے اور ان کے جانے کی دیر تھی، وہ اس طرز پر پک پک کر روئیں کہ اب تک ان کی پچھلی بندھی تھی۔ طبیعت الگ بڑھ حال ہو چکی تھی۔ لگتا تھا جیسے جسم ٹوٹ رہا ہے۔ انہیں ہلکی حیرت محسوس ہو رہی تھی۔ جائے کی شدید طلب ہو رہی تھی مگر دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کسی بھی ملازمہ کو کمرے میں داخل ہونے دیں۔ چت لینے سے وہ کہنی کے بل ذرا سانس لیں اور سیدی ہوتی ہوئی نیچے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئیں۔ بیڈ کے بالکل سامنے ڈریسر کے ساتھ دیوار میں نصب قد آدم آئینہ تھا۔ اپنا عکس اس میں دیکھ کر ان کی آنکھیں دوبارہ بجھنے لگیں۔ وہ آئینہ، چستی اسکرین بن گیا اور گزشتہ دن کے اذیت ناک مناظر وہاں کسی فلم کی مانند چلنے

لگے۔

ساک، امیرش سے شادی سے انکار کرنے کے بعد جا چکا تھا، یہ دیکھ بغیر کہ پیچھے عادل پاشا کا تنفس ایک دم تیز ہوا تھا اور رنگت متغیر۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ساک ان کیوں دو ٹوک انکار کر دیے گا۔

ناعمہ پاشا کی ٹانگوں پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ وہ تھوک نکلتے ہوئے بے بسی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ دل میں فکر کھائے جارہی تھی کہ ساک جس لڑکی کا نام لے کر گیا ہے، اس کے لیے کوئی فرمان نہ جاری کر دیں۔ عادل پاشا کی سفاکیت کو بھلا ان سے بہتر کون جانتا تھا۔ وہ کچھ دیر تو ساکت بیٹھے، بند مٹھیاں ہونٹوں پر جمائے، محض اپنی تیز نظریں گھما گھما کر سوچتے رہے پھر اچانک اٹھے۔ ایک زوردار ٹھوک میز کو لگائی۔ چائے کا کپ اور ایک آدھ کرشل کے ڈیکوریشن پیر پھسل کر چمن کی آواز کے ساتھ جکتے ٹائل والے فرش پر آ گئے۔ ناعمہ کے ماتھے پر پسینے کی نمی بوندیں چلیں۔ عادل پاشا شکتا تو ہوئے کمرے میں جا چکے تھے۔ ناعمہ پاشا کو بھی ناچار اٹھ کر ان کے پیچھے جانایا تھا۔ انہوں نے ملازمہ کو آواز دے کر سب سے اگلا اسمیٹھ کا کہا اور خود بھی بیڈروم کا رخ کیا۔ دروازے کا تاب تمام کر وہ کئی بل کھڑی رہیں۔ خود کو قدرے نارل کیا اور چہرہ تھپتھا کر اندر داخل ہو گئیں۔ وسیع و عریض بیڈروم میں عادل پاشا طیش میں چکر کاٹ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ڈریسنگ اسٹول پر ٹک گئیں اور سر جھکا کر نظریں ادھر سے ادھر جاتے شوہر کے قدموں پر لگا لیں۔

”تو اب میرے بیٹے میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی کہ وہ میرے سامنے تن کر فیصلے کرے گا۔ واہ۔ وہ بھی میرے سامنے۔“

ناعمہ پاشا نے ایک نظر اٹھا کر تاسف سے انہیں دیکھا اور فوری طور پر نظر واپس پھیر لی۔

”اس کی یہ جرأت بلا سبب نہیں ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً وہی لڑکی ہے۔ وہ کیا نام بتا رہا تھا اس کا۔“ وہ ایک بل کی گھٹنے پھر نخوت سے سر جھٹکتے ہوئے

بولے۔ ”نہہہ! جو بھی ہے۔ کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کا نام میرے بیٹے کے نام سے جڑے۔ عادل پاشا کے بیٹے کے نام سے۔ وہ چیونٹی، ہاشمی کی سوڈ میں گھسنا چاہ رہی ہے۔ مجھے اس سے پہلے ہی اسے مسلنا ہوگا۔“

وہ انتہائی حقارت اور سرد لہجے میں بولتے ناعمہ پاشا کے حواس سلب کر گئے۔ ان کے ہاتھ یک دم ٹھنڈے بڑ گئے اور پھر ان کی پریچسپاں میں گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں، کچھ ماننا چاہتی تھیں مگر ہونٹوں پر جیسے قفل پڑ گئے تھے۔

عادل پاشا کا وچ پر بیٹھے۔ دو تین لمبے لمبے سانس لیے۔ جب سے موبائل نکالا اور کوئی بہر ملانے لگے تھے کہ ناعمہ پاشا کے قیچہ پر نظریں گاڑتے ہوئے بولے۔

”اب کی ہوائیاں کیوں اڑی ہوئی ہیں ناعمہ! اوہ! بھول گیا۔ آپ کے تو اسے ہی سوگ ہیں۔ ہونہہ۔ میرا بیٹا میرے مقابل کھڑا کر ڈالا آپ نے۔“

ناعمہ پاشا حیرت کے سمندر میں غوطہ خور آئے۔ جتنی سوچتی رہ گئیں کہ اس سب میں وہ کہاں تصور دیا۔ یہ کھاتے اگر کھل جاتے تو کھجور عادل پاشا کی گردن کے گرد کسا جاتا۔ وہ سب تم بھلا بیٹھے تھے مگر ناعمہ نہیں۔ اپنے ہونٹ بے دردی سے چبانے انہوں نے عادل پاشا کو موبائل پر کسی سے کہتے سنا۔

”ہاں ایاز۔ عادل پاشا بات کر رہا ہوں۔ ایک لڑکی کا اتنا پتا معلوم کر کے دو۔ ماحور نام ہے اس کا۔ منصور کی فرم میں ملازمت کرتی ہے۔ آج اینڈ ایوری تھنک اباوٹ ہر شے بھی اون مانی نہیں۔ وہ ان پل آف ڈیز۔ (اس لڑکی کے بارے میں مکمل معلومات کچھ دن میں میرے میز پر ہونی چاہئیں)۔ اس کے بعد اگلی بات ہوگی۔ صبح میں کراچی جا رہا ہوں، میری واپسی پر مجھے آفس میں ملو۔ سمجھے۔“

کال کاٹ کر انہوں نے بڑے تنفس سے موبائل سیٹی پر ہی اچھال دیا۔ پھر ناعمہ پاشا کو ترچھی ادھر

جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”شادی تو ساک کی وہیں ہوگی جہاں میں نے کہہ دیا ہے، دیکھتا ہوں کہ آخر یہ کیا بلا ہے جو میرے بیٹے کو پھنسی ہے اور جس کے ذکر نے آپ کا رنگ بھی قیق کر ڈالا ہے۔ ناعمہ بیگم، عادل پاشا بھی کچے کام نہیں کرتا۔ نا ہی پچھلی کڑیاں جوڑ کے رکھتا ہے۔ اگر اس لڑکی کی کڑی آپ سے جڑی ہے تو سمجھ رہے ہیں۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی کہ اس کی پریچسپاں میں گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں، کچھ ماننا چاہتی تھیں مگر ہونٹوں پر جیسے قفل پڑ گئے تھے۔

عادل پاشا کا وچ پر بیٹھے۔ دو تین لمبے لمبے سانس لیے۔ جب سے موبائل نکالا اور کوئی بہر ملانے لگے تھے کہ ناعمہ پاشا کے قیچہ پر نظریں گاڑتے ہوئے بولے۔

”اب کی ہوائیاں کیوں اڑی ہوئی ہیں ناعمہ! اوہ! بھول گیا۔ آپ کے تو اسے ہی سوگ ہیں۔ ہونہہ۔ میرا بیٹا میرے مقابل کھڑا کر ڈالا آپ نے۔“

ناعمہ پاشا حیرت کے سمندر میں غوطہ خور آئے۔ جتنی سوچتی رہ گئیں کہ اس سب میں وہ کہاں تصور دیا۔ یہ کھاتے اگر کھل جاتے تو کھجور عادل پاشا کی گردن کے گرد کسا جاتا۔ وہ سب تم بھلا بیٹھے تھے مگر ناعمہ نہیں۔ اپنے ہونٹ بے دردی سے چبانے انہوں نے عادل پاشا کو موبائل پر کسی سے کہتے سنا۔

”ہاں ایاز۔ عادل پاشا بات کر رہا ہوں۔ ایک لڑکی کا اتنا پتا معلوم کر کے دو۔ ماحور نام ہے اس کا۔ منصور کی فرم میں ملازمت کرتی ہے۔ آج اینڈ ایوری تھنک اباوٹ ہر شے بھی اون مانی نہیں۔ وہ ان پل آف ڈیز۔ (اس لڑکی کے بارے میں مکمل معلومات کچھ دن میں میرے میز پر ہونی چاہئیں)۔ اس کے بعد اگلی بات ہوگی۔ صبح میں کراچی جا رہا ہوں، میری واپسی پر مجھے آفس میں ملو۔ سمجھے۔“

کال کاٹ کر انہوں نے بڑے تنفس سے موبائل سیٹی پر ہی اچھال دیا۔ پھر ناعمہ پاشا کو ترچھی ادھر

آج ہوتیں تو اسے بے حد ڈھارس رہتی۔ وہ کبھی بھی نہیں چاہتا تھا عادل پاشا کے روبرو ہو مگر یہ اس کی زندگی کا معاملہ تھا جسے وہ عادل پاشا کی ضد کی نذر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن کی ڈور یک دم امیرش را شور کے تصور نے پھینچی۔ وہ چلی، بلا کی حسین لڑکی۔ کسی کے بھی دل کی ملکہ نہ سکتی تھی لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا، جہاں ماحور نے اپنی ریح کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ وہ دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے دل کو ماحور کی خوب صورتی نے نہیں بلکہ اس کی ہنسی نے جکڑا تھا۔ اس نے اتنی مدھر ہنسی بھی نہیں سنی تھی۔ ماحور کا وجود حائل نہ ہوتا تو اسے عادل پاشا کی بات ماننے میں چنداں دشواری نہ ہوتی۔ بس دل کو ملال سا تھا عادل پاشا کی ناراضی کا۔ اس نے بھی ان سے ایسے طریقے سے بات نہیں کی تھی، تب بھی نہیں جب اسے ان کی دوسری شادی کا پتا چلا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں غلطان اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہا تھا جب دروازے پر مدھم ساناٹ کر کے اس کی سیکرٹری زرش اندر داخل ہوئی۔

”سر آپ کا آج کا شیڈول۔ آج آپ کی میٹنگ ہے۔“

”کینسل کر دیں۔“ وہ بند آنکھوں سے اس کی بات کاٹ کر بے نیازی سے بولا۔

”لیکن سر۔ سر پاشا یہاں نہیں ہیں اور یہ میٹنگ آپ ہی نے۔“

”میں نے کہا تھا۔ کینسل کر دیں زرش۔ میں آج کوئی میٹنگ اینڈ نہیں کروں گا نا ہی کوئی کال مجھے ٹرانسفر کی جائے۔ گاٹ اٹ۔“ اب اس کا لہجہ بے لک تھا۔ سیکرٹری نے بے چاری دیک کے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ یہ میٹنگ سراسر ساک کے کہنے پر ہی ارجح کی گئی تھی۔ ایک آخری کوشش کے طور پر اس نے واپس مڑنے سے پہلے ہلکی آواز میں منمناتے ہوئے کہا۔

”اچھا ٹلی سر۔ سر منصور کی دو دفعہ کال آچکی ہے۔ وہ آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔ اوکے! میں

کینسل کرواتی ہوں۔“ وہ مایوسی سے کہہ کر واپس ہونے لگی تھی لیکن سالک پاشا نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

”یو مین منصور آشور؟“ اس نے پورا نام لے کر کفر کیا۔

”جی۔ جی سر۔ وہی۔ بٹ ڈونٹ یوری سر۔ میں کینسل کروا دیتی ہوں۔“

”کس نے کہا آپ سے؟“ وہ اپنے فولڈڈ کف سیدھے کرتے ہوئے لاپرواہی سے بولا تو وہ بے چاری حیران پریشان اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”مینگ آج ہی ہوگی۔ آپ مسٹر مومن کو بھیجیے اندر۔ ان سے کہیے گا کہ ”راٹھور اینڈ کو“ کی فائل جی ساتھ لیتے آئیں۔“

وہ تیزی سے اپنے بلکے محورے بالوں میں ہاتھ چلا کر انہیں سیٹ کرنے لگا۔ ذہن میں پھم سے ماحور کی جھپٹ اتر آئی تھی۔ کتنی تیزی سے یہ لڑکی دل پر قابض ہوئی تھی کہ اب دل چاہتا تھا کہ دوریاں پاٹ دے قربت کو دہائی لکس عطا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی پیاری مسکان مل گئی۔

”سے آئی کم ان سر۔“ مومن نے دروازہ ناک کرتے ہوئے اجازت چاہی تو اس کا دھیان بٹ گیا۔ اس نے خوش گواریت سے اثبات میں سر ہلایا تو مومن اندر داخل ہوا۔ بہت کم وقت میں اس نے سالک پاشا کا ناصر ف اعتماد حاصل کیا تھا بلکہ دونوں کے درمیان خاصی بے تکلفی بھی ہو چکی تھی۔ اس کی ایک وجہ مومن کے بابا اور عادل پاشا کا ماضی میں رہ چکا دوستانہ تعلق بھی تھا۔ کوکہ ابھی تک عادل پاشا مومن کا فیملی بیک گراؤ نہیں جانتے تھے، ان کی ایک آدھ بار اس سے اگر بات چیت ہوئی تھی تو ایز این ایسپلائی ہی ہوئی تھی، پرانے واسطے اور تعلق دھرانے کی نوبت نہیں آسکتی تھی۔

فیل کے پاس پہنچ کر اس نے فائل سالک کے آگے رکھی تو اس نے ہاتھ ہلا کے مومن کو بیٹھنے کا کہا۔

”سر یہ اچانک مینگ؟ خیریت۔“ اس نے اچھی سے پوچھا حالانکہ دل اس کا بھی بلیوں اچھل رہا تھا ماحور سے ملاقات کی خوشی میں۔ آج دو دن تو ہوئی گئے تھے اسے دیکھے۔

”ہمم۔۔۔۔۔۔ ہاں! یار کہا تو تھا ایک سٹنگ ابھی کرنی پڑے گی ان کے ساتھ۔ کچھ امپورٹنٹ ایٹوز ہیں جن پر ان کے مہم کے لیے ہمارا دھن کر رہے ہیں۔“ اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔ مومن ٹھک گیا۔ اسے کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ مزید کیسے استفسار کرے، بھلے بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی مگر سامنے باس تھا۔ اسے اس سب کے پیچھے کوئی اور دلائل محسوس ہو رہا تھا۔ سالک پاشا کے انداز میں کچھ نیپن تھا اور وہ بلا جواز نہیں تھا۔

اس نے گلا کھٹکھٹاتے ہوئے ایک نظر انداز سالک پاشا کے فریش چہرے کو دیکھا اور لفظوں کا چٹاؤ کرتے ہوئے مخاطبہ میں بولا۔

”سر۔ سب کچھ ٹھیک تو ہے۔ آپ آج اسے مناسب سمجھیں تو مجھ سے بھیج کر سکتے ہیں۔“

اس نے دونوں ہاتھ کھڑے کئے اور پھر گویا ہوا۔

”باقی میں ریڈی ہوں۔ آپ کہیں گے تو مومن تراب اس ساری ذیل میں سے ستر کٹرے نکال کر ان کی ٹیبل پر سجادے گا کہ لو بھی! پہلے انہیں مارو پھر دیکھیں گے۔“ اس کے سے ساختہ کہنے پر ایک جاندار قہقہہ سالک پاشا کے حلق سے آزاد ہوا۔ وہ جواباً ذرا سا آگے جھٹکتے ہوئے دوستانہ انداز میں گویا ہوا۔

”اتنے ہی غلط ہو تو سمجھ جاؤ نا۔ کسی کسی ایک عبارت پوری تحریروں کا رد ہوتی ہے۔ مومن تراب اور مومن تراب چند پل سالک پاشا کی فائل دیکھتا رہا اور پھر بالکل اسی کے انداز میں ذرا سا آگے جھکا اور بولا۔

”اب کیا مومن تراب آپ کو یہ کہہ کہ وہ ٹیز دیکھ کر ہی پوری قلم کی اسٹوری جان لیتا ہے، تب آپ

کو میرے گلس پر یقین آئے گا۔“

”آں۔ ہاں۔! خالصے چالاک ہو مومن تراب۔“ سالک پاشا کی آنکھوں میں شرارت سی دوڑ گئی۔

”خاصا کمینہ کیسے سر۔ دادا مجھے یہی کہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“

اس نے دو دیوار سے ٹکرایا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سالک پاشا کی گاڑی میں جا رہے تھے۔ دونوں کی سوچوں کا محور و مرکز اس وقت صرف ایک ہی تھی مگر لیکن دونوں ہی اس بات سے انجان تھے۔ مومن تراب، سالک پاشا کی خوشی کی وجہ ایرش راٹھور کو سمجھ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جس لڑکی کو وہ تمام تر شدتوں سے چاہنے لگا ہے، وہ بندھنی میں سے ریت کی مانند اس کی زندگی سے نکلنے والی ہے۔

☆☆☆

”اب بس کرو مامی۔ چھوڑ دو اس لپ ٹاپ کا بیچنا۔ انہوں کو اپنے جتنا رکھا ہے جیسے گود لے رکھا۔“

”ایرش نے زاویت کے عروج پر تھی۔ آفس ورک تو کیا خاک کرتی تھی، سارا وقت موبائل تھاے وہ مختلف سائینس کھیلے آرڈرز پلین کرواتی رہتی تھی۔ ماحور نے ایک مصروف سی نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ لیکن ہونٹوں پر ذہنی مسکراہٹ ضرور کھیل گئی۔ کوئی جواب نہ پا کر ایرش نے چکر ٹیبل سے فائل اٹھا کر اس کی لپ ٹاپ اسکرین پر دے ماری۔ ماحور کو پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا، مسکون سے فائل پکڑ کر سائڈ پر دھری۔ ایرش ایک طویل سانس بھرتے ہوئے بولی۔

”ایک تو یہاں شادی کا کوئی اتنا پتا نہیں، اوپر سے روز پایا آفس میں بلا کر خبر گیری کرتے ہیں، وہ بھی اسٹاف کے سامنے۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا مامی تمہارا۔ پایا کو صاف پتا چل جاتا ہے کہ کون سا کام تم نے کیا اور کون سا میں نے۔ ہونہر، کل بھی مجھے

صاف بول رہے تھے۔“ بیٹا جی! پرفیکشن ہوتی ہے اسی لیے ماحور کا کام بول اٹھتا ہے۔“

”لو بتاؤ بھلا۔ یہ سب تمہارا قصور ہے مامی۔ تمہیں اپنے کام کی زبان کاٹ کر آگے پاس کرنا چاہیے تاکہ یہ شور نہ مچا سکے۔“

”تم شور نہ مچانے کا کیا لوگی ایرش؟“ ماحور زچ ہوتے ہوئے پوچھ ہی بیٹھی۔

”ہائے خالم۔ کیا پوچھ ڈالا۔ ہم۔۔۔۔۔۔ زیادہ کچھ نہیں۔ بس ذرا سے سالک پاشا سے ہی کام چل جائے گا میرا۔“ اس نے ٹھی ٹھوڑی کے نیچے جھاتے ہوئے حسرت سے کہا۔ جواباً ماحور اسے کن آنکھوں سے دیکھتی بے نیازی سے بولی۔

”اچھا۔۔۔۔۔۔ تو پھر ذرا سا سالک پاشا اس وقت سر منصور کے پاس آفس میں بیٹھا ہے۔ جا کے لے لو۔“

ایرش کو چند لمحے اس کی بات کی سمجھ ہی نہیں آئی اور جب آئی تو لگا کہ ماحور کا داغ چل گیا ہے جو ایسا مذاق کر رہی ہے۔ لیکن اس کے چہرے سے بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ”مسخر اپن“ ہے۔ اگلے ہی پل ایرش زوردار چیخ مارتی سیٹ سے اچھل کر کھڑی ہو چکی تھی۔

”مامی کی پکی۔ تم غدار۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ تم نے میری دکھی رگ کو کھینچ کر گٹار کا تار بنا ڈالا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”زیادہ دورا ایکٹنگ نا کرو یار۔ اس میں بھی پرفیکشن نہیں اور زیادہ دیر نہیں ہوئی اسے آئے ہوئے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے عیر صاحب نے بتایا تھا مجھے جب میں ان کے آفس گئی تھی، کہہ رہے تھے سالک پاشا آئے ہیں چندر منٹ پہلے اور سران کے ساتھ بڑی ہیں۔“ ماحور نے ہنستے ہوئے اسے تفصیل بتائی تو وہ جارحانہ انداز میں دونوں ہاتھ زور سے میز کی سطح پر مارتے ہوئے بولی۔

”آدھا گھنٹہ اور چندر منٹ ملا کر پون گھنٹہ بنتا ہے مامی۔ اب تو وہ کھڑکس جانے والا ہوگا۔ مامی

کرن 82 فروری 2019

چلے پورا اترتے ہیں جن کے سر میں عشق کا سودا سا جائے۔

☆☆☆

صاف سحرے، دھلے دھلائے محن میں کرسی ڈالے دادا نظر کی ٹینک لگائے دائیں ہاتھ میں پتلی تھامے موبائل کی سم کتر رہے تھے جب مومن نیند سے جاگ کر سست سا چلتا ہوا باہر آیا۔ دھپ سے ان کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھا اور مسلسل جمائی پہ جمائی لیتے اس نے نیم مندی آنکھوں سے دادا کا جائزہ لیا اور نگاہیں چہرے سے ہوتی ہوئی ہاتھوں پر اُنٹھہریں۔ ایک ہاتھ میں پتلی کی توخیر تھی لیکن سم دیکھ کر وہ یوں اچھلا کر کھول پانی سر پر اڑا دیا گیا ہو۔ اس نے آنکھیں مل کر تھوڑا آگے کو جھک کر یقین دہانی کی اور حیرت سے چلتا ہوا بولا۔

”دادا۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”تیری نڈ کر رہا ہوں۔“ دادا نے بے زاری سے جواب دیا۔ دیکھ نہیں رہا م کاٹ رہا ہوں۔ خود ہی تو کہا تھا کہ سنے موبائل میں ڈالنے کے لیے سم چھوٹی کرنی پڑے گی۔“

”تو دادا ایسے تھوڑی نا ہوتی ہے۔ میں لے جاتا اور ماکرو والا لاتا۔“ وہ بے بسی سے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ دادا نے اچھی سے ہاتھ روک کر ٹینک کے اوپر سے اسے دیکھا اور پتلی کا سرا اس کی طرف لہراتے ہوئے بولے۔

”تو حال آدمی میں اسے کاٹ کر خود ہی اندر کچن میں مانیکور میں پھیر لیتا ہوں۔ مگر تجھے تو پیسے لگانے کی پڑی رہتی ہے بس۔“

”اف.....! آپ کو سمجھانا بھی بے حد مشکل ہے۔ لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ یہ سم آپ کے کسی کام کی نہیں رہی۔ ضائع کر دی آپ نے۔ اب جانے دیں اسے کل نئی ٹکڑا کر لا دوں گا۔“

”جانے کیوں دوں اسے۔ شادیز کو دوں گا۔ وہ ایسا خبیث ہے اسے بھی کسی کام میں لے آئے۔“

گا۔

دادا نے کئی پھٹی سم کو بازو پھیلا کر چہرے کے سامنے اونچا کرتے ہوئے، ایک آنکھ دبا کر دوسری سے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ چند پل دیکھتے رہے پھر ایک دم چونک کر کسی پتچے ہوئے بابے کے انداز میں بولے۔

”بڑے بڑے حادثے دیکھے ہیں مگر کبھی نہیں سوچا تھا کہ اتنی ہی کم عمر کے بچے کے شادی بیاہی بر قاتی ریچھ، ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لیے باہر نکلتے آئے گا۔“

”دوسری آنکھ بھی کھول لیں دادا۔ شادیز اس سم میں سے نہیں، اس کے پس منظر میں جو کھٹ ہے، وہاں سے نمودار ہوا ہے۔“

دادا نے آنکھ کھولی تو شادیز کا تپا تپا سا منہ مزید قریب آچکا تھا۔ یقیناً وہ خود کو بر قاتی ریچھ کہے جانے پر رمان گیا تھا۔

”کیا لایا ہے، میرے ڈونلڈ ڈک۔“ مومن نے لہجے میں محاسن بھر کر پوچھا تو شادیز نے ٹرے چھوٹی میز پر رکھی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے نروٹھے لہجے میں بولا۔

”حلوہ پوری بنائی تھی بھابی نے۔ میاں جی نے کہا آپ کو بھی دے آؤں۔“

اس کی بات پر مومن نے بے اختیار موبائل پر وقت دیکھا۔ ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ یہ بھلا کون سا وقت تھا حلوہ پوری کا۔

”تم لوگوں نے دوپہر کو ناشتا کرنا شروع کر دیا ہے کیا؟“ دادا نے ٹینک اتار کر آنکھیں ملیں تاکہ حلوہ پوری پر گماڑ سکیں۔

”نہیں ہم نے تو صبح سات بجے ہی کیا تھا۔“

”تو پھر یہ کیا ہے؟“

”ناشتا۔! اڑ کر لیا۔“

”کس کا کہنے؟“

”آپ کا اور مں کا دادا۔“

”تجھے مں نے کہا کہ ہم ایک بجے ناشتا کرتے

ہیں۔“

”ایک نہیں۔ پونے ایک۔ اور بھابی نے صبح سے ہی الگ کر کے رکھی تھی ٹرے۔ میاں جی نے لانے نہیں دی کہ فضل (دادا) نے پوتے کی نوکری کی مٹائی بھی باسی بھیجی تھی اور پھل بھی اپنے منہ کی طرح پلپلا۔ اس لیے ٹھنڈا کر کے لے کے جانا۔“

شادیز نے اپنے دادا کو بوریان حرف بہ حرف سناتے ہوئے دلی تسکین حاصل کی تھی۔

”مومن کوں نے یہ کچھ کرنا ہی پر۔ جب سے بڑھاو کھنے لگا ہے، میری جوانی سے سڑ سڑ کر سواہ ہوئے جا رہا ہے۔ اب اس میں بھی میرا قصور ہے بھلا۔ ہاں اگر میں آج بھی اپنے پوتے کا بڑا بھائی لگتا ہوں۔ چلو! ایا ہی سہی۔“ انہوں نے مومن اور شادیز دونوں کی مشترکہ کھوری پر اپنی عمر میں تھوڑا اضافہ کیا۔ ”تو پکڑو سارے میرا گلا۔ ڈال دو پھندا اس جرم پر۔“ ان کے جذباتی بیان پر شادیز اور مومن نے محض آنکھیں پٹپٹانے پر اکتفا کیا۔ دادا ان کے سپاٹ چہرے دیکھتے ہوئے غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور شادیز کے ہاتھ سے ٹرے تقریباً جھٹکتے ہوئے اندر لے گئے۔ ان کے دوپہر کے کھانے کا یہ منظر مومن کو گھبراہٹ میں

”مومن کی قسمت کہ اس میں سے وہ اس کے لیے کیا جاتے۔“

شادیز نے سکون سے سر ہکا کر مینٹی مسکراہٹ کے ساتھ مومن کو دیکھا۔ ایک بار دوبار اور تیسری بار پر مومن غرغ کے بولا۔

”ابنی گندی نظر میں ہٹا مجھ پر سے۔ گھر میں دادا اور بھابی نہیں ہیں کیا؟“

”ہیں تو سہی مگر تجھے سا نہیں دیکھا۔“ تھوڑی سیلالتے ہوئے محض اسے پڑانے کی غرض سے بکواس کرتا وہ اسے زہر سے بھی زہریلا لگا۔ دادا کی چھڑی پاس پڑی تھی وہی تمام کر اسے لکار تے ہوئے بولا۔

”کھینے۔ تجھے شرم نہیں آتی مجھ پر بری نظر رکھتے۔ میں کسی کی امانت ہوں۔ بے شرم۔“ ساتھ

ہی رکھ کر پنڈلی پر چھڑی برساتی۔ شادیز بلبلا اٹھا۔ ”میں تو مذاق کر رہا تھا یارا! تو تو سیریس ہی ہو گیا۔“

”استادوں کے ساتھ استادی۔ اچھا جی۔ شکل دیکھی ہے اپنی تو نے طوہ کدو۔“ مومن نے گھر کا۔ ”روز دیکھتا ہوں۔ مومن جیسی لگتی ہے۔“ اس کی تشبیہ پر مومن کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”بہت بڑا چول ہے تو۔ باتیں بنانا سیکھ ہی گیا ہے۔“

”ہاں! تمہاری صحبت کا اثر ہے پیارے۔“

ایسے ہی مجھے اپنے زیر سایہ رکھتا کہ تمہاری طرح کوئی لڑکی مجھے بھی لفٹ کرائے اور میں بھی شادی کروا کے تمہیں چار پانچ بچوں کا چاچو بننے کا اعزاز بخش سکوں۔“ وہ اس قدر رساں سے بولا کہ مومن بابیاں ابرو اچکا کر بس اسے دیکھ کر کہہ گیا۔

”سوت ناکپاس، جولا ہے سے لٹھم لٹھے والی مثال مجھے آج سمجھ میں آئی ہے۔ لڑکی کا دور روز دیک سے لکھ جاتا نہیں اور تو نے چار بجے بھی پیدا کر لیے۔ اٹھنے والی اٹھنے۔ اتنا تو فاسٹ اینڈ یورٹس۔“

”مومن۔ دیکھ لیتا۔ حقیر یہ میرے پہلو میں بھی ایک حسین و جمیل سی لڑکی ہوگی جس سے میں رومانس بگھا رہا ہوں گا۔“ شادیز کا لہجہ خواب ناک اور آنکھیں نیم مندی ہوئی تھیں۔

”بیٹا۔ ذرا رومانس کے چچے تو کر۔ بڑا آیا رومانس جھاڑنے والا۔ تو بس اپنی پلکوں کی خشکی جھاڑا کر۔ یہ دل لگی تیرے بس کا روگ نہیں۔“ مومن نے اس کے ارمانوں کو فریز کرنے کی کوشش کی۔ جواباً شادیز ایک دم اپنی کرسی سے اچھلا اور مومن کے دونوں ہاتھ جکڑتے ہوئے بولا۔

”تم سکھا دو نا مجھے۔ تمہارا ہاتھ میرے سر پر رہا تو بہت جلد میں کنگ آف رومانس کہلو آؤں گا۔“ ”جی۔“ وہ مومن کا ہاتھ اپنے تیل سے چڑے بالوں پر رکھتے ہوئے عقیدت سے بولا۔ مومن نے ہاتھ واپس کھینچا، اس پر لگی بے تحاشا چکنائی کو کلفت سے

گھورا، دوسرے ہاتھ سے شاویز کا گریبان تھام کر اپنی جانب کھینچا اور تیل والا ہاتھ اس کی سفید شرٹ سے پونچھ دیا۔ وہ بے چارہ اس حرکت پر شخص صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

”مجھ سے کیا امید لگائے بیٹھا ہے رے بیگے۔ مجھے تو خود ابھی تک ایسی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ حق بات تیری ہونے والی بھابھی بڑی خرافات ہے رے۔“ اس کی نظروں کے سامنے ماحور کے جارجانہ تیوروں والا چہرہ گھوم گیا۔

شاویز نے دوبارہ اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور کھکھکاتے ہوئے بولا۔

”میں ہوں نا۔ مجھے بھابھی ہی سمجھ۔ میرا مطلب ہے کہ تم مجھے بھابھی سمجھ کے پریکٹس کر سکتے ہو۔“

”غصیٹ! تجھے دیکھ کر تو ویسے ہی اختلاف ہونے لگتا ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ میں تیری صورت میں ماحور کو دیکھوں۔ ابھی ایسے برسے دن نہیں آئے میرے۔“

”میرے بھائی یار۔ تم سمجھو میں تمہاری ”وہ“ ہوں۔ ہم دونوں اس وقت سنسان دوپہر میں گھر میں بالکل اکیلے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اور نظریے نظر ملائے بیٹھے ہیں۔ ایسے میں تم مجھ سے کیا کہنا پسند کرو گے۔“ شاویز نے ایک عدد زنانہ ہوکا بھرتے ہوئے مومکھ سے پوچھا تو چند لمحوں کو مومن کے سامنے سے ہر منظر تحلیل ہو کر ماحور کے روشن سراپے میں ڈھل گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ماحور سے ایسے دل کی بات کہنے ہی لگا تھا کہ ایک دم ساروں کی ٹوٹ گیا اور دادا کی دھاڑ سنائی دی۔ دونوں بری طرح ہڑبڑائے۔

”اوجھ آؤ بے غیر تو۔ میں مانتا ہوں تم دونوں کو دل لگی کے ایک سو ایک اصول۔ آج تم دونوں بچو میرے ہاتھ سے۔ ایک ایک بڑی بلی توڑ کے رکھ دوں گا۔ میرے گھر کو بھر خانہ بنائے چلے ہو۔ دادا بالکل وہی سمجھتے تھے جیسا کہ اس گھڑی یہ منظر دکھائی کر رہا تھا سو

خوب تلملاتے ہوئے دونوں کے پیچھے حسب استطاعت دوڑے۔ مگر ان کے قریب آنے سے پہلے ہی مومن گیٹ کے بجائے، بیرونی کئی کی دیوار پھلانگ کے باہر کود گیا تھا۔ شاویز سدا سے اس کے متاثرین میں شامل رہا تھا لہذا اسی دیکھا دیکھی دیوار پر چڑھ تو گیا مگر دوسری طرف چھانکتے ہی اس کے چنگے چھوٹ گئے۔ دیوار خاصی اونچی تھی اور وہ بھاری بھرے اس نے چھڑی پکڑے قریب آئے دادا کو دھک کر حساب لگایا کہ

کود جانے میں کم چوٹ آئے گی یا دادا کا مارے۔ اس نے سینے پر ہاتھ مارتے اونچا سا نعرہ مارا اور کود گیا۔ لیکن نعرہ اس کے زوردار آواز کے ساتھ

گرتے ہی ہائے وائے کے دواہے میں بدل گیا۔ وہ بڑے شاندار طریقے سے چوٹ لگوا کے سرخرو ہو چکا تھا اور اندر دادا دو تین موتی موتی لگائیاں پدیرہ کرنے کے بعد اب اطمینان سے صحن کے بیچوں بیچ چار پانی پر حلوہ پوری ہضم کرنے کے لیے لیٹ چکے تھے۔

☆☆☆

”ریان! میں مارکیٹ کے لیے نکل رہی ہوں۔ چلو میرے ساتھ، تم ٹیوشن والے گھر چلے جانا، میں آگے نکل جاؤں گی۔“ وہ والٹ میں سے گھن کر رکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں ریان کو آواز دے کر بلارہی تھی۔ ریان نے دو ماہ پہلے ایک گھر میں ٹیوشن پڑھانی شروع کی تھی۔ اچھی فیس دے رہے تھے وہ لوگ مگر بے چارہ بابا کے ہتھے چڑھ جاتا تھا۔ دوسرا ماہ تھا وہ اس سے پوری ٹیوشن فیس ہتھ لیتے تھے اور نتیجتاً وہ خالی ہاتھ رہ جاتا تھا۔ ماحور ایک مخصوص رقم دیتی تھی عقل مغفل کو مگر جیسے کی بات انہیں کم پر راضی ہی نہیں رہنے دیتی تھی۔ ابھی بھی آئے دن گھر کی کوئی نہ کوئی چیز غائب ہوتی جاتی تھی۔

”آج بھی جاؤ ریان۔ دیر ہو رہی ہے۔“

اس نے ریان کو تک سک سے تیار قریب آئے دیکھ کر پکارا۔

”وہ..... ایسا! آپ چلی جائیں نا۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ اصل میں مجھے راتے میں ایک دوست کو

ملنا ہے۔ تھوڑا وقت لگ جائے گا۔ اس لیے آپ چلی جائیں، خواہ مخواہ انتظار کرنا پڑے گا آپ کو۔“ وہ کچھ گھبراہٹ سے ماحور اپنے ہینڈ بیگ میں گھسی اس لیے توجہ نہیں دی اور اسی مصروف انداز میں بولی۔

”چلو، جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن جلدی گھر آ جانا۔ ٹیوشن پڑھا کر ادھر ادھر مت نکل جانا۔ تمہیں پتا ہے نا کہ اس کام کی اجازت میں نے تمہیں اسی

”مجھے یاد ہے ایسا۔ میں کوئی بچہ تو نہیں کہ لا پرواہی کروں گا۔“ وہ ذرا چڑکے بولا تو ماحور نے نظر اٹھا کر بغور اس کو دیکھا۔ ریان کے چہرے پر چھائی

بے زاری نے ماحور کو خشکا دیا لیکن اس نے سمجھ کو نادرل رکھتے ہوئے اسے کہا۔

”مجھے پتا ہے کہ تم بڑے بھی ہو گئے ہو اور سامنے بھی۔“ وہ ذرا سا مسکرائی پھر واپس خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگی۔

پندرہ بیس منٹ لگ جائیں گے گھر سے نکلتے۔ سوچ رہی ہوں کہ سیف کا بیٹ کر لوں ورنہ بے چارہ آئے ہی سرخانا پیدا آئی کے گھر جانے کا چاہیوں نے تم کو۔ شاہاش۔“

”اوکے۔ اوکے! میں چلتا ہوں۔ مجھے ویسے بھی دیر ہو رہی ہے۔ ٹیوشن والے بچے بہت منہ پھٹ ہیں، ذرا سی دیر ہو جائے تو سنا دیتے ہیں۔“ ریان ایک دم سے ریلیکس ہو گیا تھا۔ اس کا لہجہ بھی فریش تھا اور اب وہ نکلنے کی بھی جلدی میں تھا۔ ماحور سے نظر ملائے بغیر وہ ٹافٹ باہر نکلتا چلا گیا۔ گیٹ بند ہونے کا کھٹکا ہوا تو ماحور پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ جیکٹ پہن کر اسٹبل لیٹا اور بند شوز پہنتی ریان کے پیچھے نکلی۔ گیٹ لاک کرنے کے بعد چاہیوں گھر کے باہر بنی باڑھ میں ایک اینٹ کے نیچے چھپائیں۔ (سیف کو اگر نامید آئی کے گھر سے چاہیوں نہ دیکھیں تو اسے معلوم ہوتا تھا کہ ماحور چاہیوں یہاں رکھ کر جاتی تھی۔)

ریان اسے چوک کر اس کرتے ہی تیز تیز قدموں سے چلتا دکھائی دے گیا تھا۔ وہ چونکا تھا اور ارد گرد نگاہیں گھماتے کسی کو ڈھونڈ بھی رہا تھا۔ ماحور خاصا فاصلہ رکھے اس کے ہی پیچھے تھی۔ کچھ آگے جا کر ایک ہیوی بائیک ریان کے پاس آ کر رکی۔ خاصا ماڈرن اور می ڈیڑی سا سائز کا اس پر بیٹھا جالوں کی طرح چیونٹ چارہا تھا۔ بائیک روک کر اس نے دایاں ہاتھ باہر کر ریان کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر مارا اور بلاوجہ تہقہ بھی لگایا۔ ریان گردن اکڑاتا اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور اگلے ہی پل وہ لڑکا ہیوی بائیک اڑاتا لے گیا تھا۔

ماحور کے لیے یہ خاموشی اچھی کی بات تھی کہ ریان کی اتنے ویل آف فیل کی لڑکے سے اتنی قریبی دوستی تھی۔ اس نے ریان سے اس بابت پوچھنے کا ارادہ باندھا اور مارکیٹ کا رخ کیا۔ اسے کچھ گھر کی ضروری سامان کی اشد ضرورت تھی۔ خریداری کے دوران بھی اس کا دھیان مسلسل ریان کی طرف لگا تھا اور پھر ہوتے ہوتے دھیان کی ڈور مومن پر آ کر انک گئی تو یوں پرے ساختہ مسکراہٹ کھیل گئی۔ اسے کل کہنے میں بیٹھ کر اس کا نرم نکائی سے نکلتا اور سب کی نگاہ بچا کر شرارت سے آنکھ مارنا یاد آتا تو کانوں کی لودیوں تک سرخ ہو گئیں۔ پہلے جوب شخص مسکرا رہے تھے اب وہاں بے آواز لمبی ٹھیل رہی تھی۔ وہ نچلاب دانتوں میں سمیٹے ہاتھوں میں شاہزائے گرومیری اسٹور سے باہر نکلی۔ روڈ کراس کر کے وہ فٹ پاتھ پر ہو گئی۔ اسی لمحے کوئی زوردار آواز سے یاد کرتا اس کے عین سامنے کودا۔ وہ جوائے دھیان میں کم تھی اس افتاد پر حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سامنے مومن کھڑا دانت کوس رہا تھا چونکہ ہاتھ میں شاہزائے تھے اس لیے اس نے غلطی دکھانے کے لیے باؤں کی ٹھوکراں کی پینڈی پر ماری۔ مگر اسے چنداں فرق نہیں پڑا تھا۔ مومن نے اس کے اتھوں سے شاہزائے لیے اور شرارت سے اس کے پتھر کے قریب جھکتے ہوئے بولا۔

”لو اب تمہارے ہاتھ خالی ہیں۔ ان کا استعمال کرو نا۔“

”ان کا استعمال میں تمہارے چہرے پر کروں گی۔ سمجھے۔“

”واللہ! میں روکوں تو گولی مار دیتا۔ لو کرو۔“ اس نے اپنا چہرہ اس کے آگے کیا اور بولا۔ ”کرو بھی۔“

”مومن تم انتہائی بے شرم ہو۔“ وہ اپنی اتھل پتھل دھڑکنوں کو سنبھالتی ڈپٹ کر بولی۔

”اب جیسا بھی ہوں تمہارا ہوں۔ برداشت کرو میری بے شرمیاں۔“

”کیوں۔ میں کیوں برداشت کروں، میں نے ٹھیک کیا ہے کیا۔“

”ہاں تو اور کیا۔ کانٹریکٹ سائن کیا ہے تم نے۔ تاحیات، بنیوی ہواب تم مجھ سے۔ میرا دل، جگر، دماغ، پیچھے رہے، جی، گردہ سب تمہارا۔“ وہ ہاتھوں کو شاپرز سمیت دائیں بائیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

”تویر۔ مومن تمہیں بھی رومانس کرنا نہیں آئے گا۔ لکھ کے رکھ لو۔“

”لکھنے کی کیا ضرورت۔ ابھی گھر سے نکلنے سے پہلے رومانس کی پریکٹس فلاپ ہوئی میری۔ دادا نے چھاپا مار دیا۔“ وہ سر جھکتے ہوئے بولا تو ماحور پوری آنکھیں پھاڑ کر چلائی۔

”تم..... یعنی کس قسم کی اور کے ساتھ پھوڑے اڑا رہے تھے اور تمہارے دادا نے تمہیں پکڑ لیا۔“

”ہاں۔ وہ جارحانہ تیوروں سے دیکھتی کر پر ہاتھ دکائی ہوئی بولی تو مومن نے زبان دانٹوں تلے کی اور ایک آنکھ میچ کر بولا۔

”اؤ نہیں اونے۔ وہ تو شاویز کا دماغ الٹ گیا تھا اور مجھے دلیپ کمار بنا کر خود کو بالائے بننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ دادا ایک دم چلے آئے، وہ نہ جانے کیا سمجھے کہ ہم دونوں کو گھر سے بھاگنا پڑا۔ ورنہ دادا کی چٹری جھٹ کی طرح بالکل اندھی ہے۔ آسا پاسا کچھ نہیں دیکھتی بس سینک کر رکھ دیتی ہے۔“

”تو ایسی مشکوک حرکتیں ہی کیوں کرتے ہو۔“ وہ ساری بات سن کر محل کے سکرانی۔ مومن اس کی گھرے آنکھوں کی چمک دیکھ کر کہہ گیا۔

”ویسے یہاں کیا کر رہے ہو۔ میرا پیچھا کرتے رہتے ہو کیا؟“ ماحور نے اس کی گہری نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”دادا کی سم لٹکوانے آیا تھا۔ اچھی بھلی سم کو پیچھی سے کتر کر رکھ دیا۔“

”وہ دونوں فٹ پاتھ کے کنارے کنارے چل رہے تھے اور یہ روٹ ماحور کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ ماحور کا دل یہ سب دیکھ کر تڑپا رہا تھا۔ پروا کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا اور لطف یہ تھا کہ وہ جتنائے یہ سب کرتا تھا۔“

”مائی۔ دادا تمہارے گھر آنا چاہتے ہیں۔“

”کب۔ کیوں۔ وجہ؟“ اس کے چہرے پر یک دم ہوائیاں اڑنے لگیں۔ آواز میں پریشانی چمک رہی تھی۔ مومن نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سیا پا ڈالیں گے آکر اور کیا حد ہوئی بار۔“

”رشتہ ڈالنے آنا ہے انہوں نے۔ بات کریں گے۔“

”تمہارے بابا سے۔“

”بابا بابا۔“ وہ استہزائیہ ہنسی۔ ”بابا سے رشتے کی بات کرنی ہے انہوں نے، جنہیں ہم بہن بھائیوں کے نام تک باؤ نہیں رہتے۔ واہ۔ کمال بات کی۔“

”بے فکر ہو۔ میں ہوں نا۔ میں تمہارے بابا کو تمہارا نام اور بائیو ڈیٹا سب یاد دلادوں گا۔ اور ویسے بھی تم میرے دادا کو جانتی نہیں، وہ ان کا سارا نقشہ ہرن کر دیں گے۔ تم بس دن بھر ہم کس دن آئیں۔“ مومن نے اس کی فکر کو چکیوں میں اڑا دیا تھا۔ وہ متاسف تھی اس وقت شہرت سے اسے اپنی ماں یا دادی تھی۔ سر جھٹک کر وہ دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنی آنکھیں میچنے میں جب مرضی۔ میں ایک آدھ دن میں عاقب بھائی کی امی سے بات کرتی ہوں، وہ اس دن جائیں گی۔ بانی رائنہ اور عاقب بھائی تو ہیں ہی۔“

”بس پھر ٹھیک ہے۔ تم تیاریاں کر لو۔ ہم آ رہے ہیں ااا۔“ وہ لوگ ماحور کے گھر سے نزدیک پہنچ چکے تھے اور مومن نے جوش میں دوپٹن سڑک پر چھلانگ لگاتے ہوئے آدمی دنیا کو اپنے

آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ چند آدھ گرونیس مڑیں تو ماحور نے فوراً مومن کے بازو پر زوردار چٹکی بھری اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”بقیہ چند قدموں کا فاصلہ مومن نے بھی شرافت سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے ہوئے طے کیا۔ ماحور نے گیٹ پر پہنچ کر اسے واپس جانے کا کہا تو اس نے یونہی انگلی سمیت نفی میں سر ہلادیا۔ وہ اس کے اندر جانے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ مومن نے اپنی سانس پھوڑتے ہوئے تیل دی۔ چند لمحوں بعد قفل مغل کے دروازہ کھولنے پر اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ پرستی سے وہ کچھ ہوش و حواس میں بھی لگ رہے تھے۔ انہوں نے مومن کو گھر سے پیر تک گھورا اور کمپنی کی سکرانٹ چہرے پر جانتے ہوئے ماحور سے بولے۔

”مجھے بھی پرگ مجھے ذلیل۔ عقل مغل کی ہانک کے نیچے چیل رہی ہے۔ بے حیا۔“

”ماحور کا دل جا ہا کر وہ ہمیں جا کر ڈوب مرے۔ مومن کے سامنے ایسی نے عربی کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، مومن پھرتی سے آگے بڑھ چکا تھا۔

”ہیلا ام علیکم اگل۔ میرا نام مومن ہے۔“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”تو ہم نے کب نہیں کا فر کیا۔ وہ تو زمانہ ہمیں کہتا ہے۔“ عقل مغل نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”ارے واہ اگل۔ آپ تو بڑے بذلہ رخ ہیں۔“ مومن کی اسے خفا و اُلے ماحول میں ایسے قفل لفظ کی آمیزش نے ماحور کو نہ جانے ہوئے بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ عقل مغل نے ڈولتے سر کو ایک لمحے کے لیے ٹھہرا کر مومن کو گھورا۔ اس کے سنجیدہ تاثرات دیکھ کر عقل مغل نے ایک بیک سینہ پھلایا اور پیچھے دوں کا پورا زور لگا کر ہنستے ہوئے بولے۔

”آخر زندگی میں ایک بندے کا پتر تو ایسا ملا جسے عقل مغل میں کوئی کن نہ دکھائی دیا۔ ورنہ تو ساری عمر اپنی گل ہی گئی کتے لوگوں میں۔“ آخری لفظ

انہوں نے اندر جاتی ماحور کی پشت کو گھورتے ہوئے کہے۔ مومن ان کی اس بات پر بل بھر کو ہنسیا لیکن اگلے ہی بل بڑے دوستانہ انداز میں ان کے کندھے پر بازو پھیلا کر کہنے لگا۔

”پچیس غصہ جانے دیں آپ۔ اب سے میں آپ کی پوری قدر کیا کروں گا۔ آپ ٹینشن ہی نہ لیں بالکل۔“ پیچھے گیٹ کی درز میں سے ماحور کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ مومن نے انکو ٹھانکھا کہ ”سب اوکے“ کا اشارہ دیا تو وہ مطمئن سی وہاں سے ہٹ گئی اور اچھا ہی ہوا و گرنہ اگلا منظر اس کے اعصاب پر خاصا بھاری پڑتا۔

”ٹھیک ہے اگر تم کہتے ہو تو آج سے میری سب فکریں تمہاری۔“ عقل مغل نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ ”لاؤ پھر ذرا دوسروں سے تو نکالو۔ اس کجخت اولاد نے نشہ توڑ دیا میرا۔ لا میرا بچہ۔ مجھے بہت پسند آیا ہے تو۔ کام کا نکلا ہے میرے۔ اب آتے جاتے رہنا اور مجھ سے ملے بنا بھی واپس مت جانا۔ ایک عرصے بعد تو عقل مغل کو اس کے ٹیٹ کا بندہ ملا ہے۔ لاؤ شاہاش۔“

”اور مومن کزوی گولی لگی جیسا منہ بنائے اپنی جینز کی پاکٹ میں سے والٹ نکالتے ہوئے سوچ رہا تھا۔“ لے بیٹا مومن۔ تیری کینٹی ڈل گئی۔“

”یہ پچاس بھی دے دو۔ واپسی پر چورن سپاری لینا آؤں گا۔“

”سو، سو کے دو نوٹ پکڑنے کے بعد اس کے والٹ میں سے پچاس روپے کا نوٹ اٹھتے ہوئے عقل مغل کے چہرے پر بڑی کینٹی مسکراہٹ تھی۔ وہ تو پیسے لے کر چلتے بنے، پیچھے مومن بال سہلانا ہوا سوچ رہا تھا کہ اگر دادا کو یہ سب پتا چلے تو اس کی کبھی درگت بنے۔ اس نے ایک بار پلٹ کر بند گیٹ کو دیکھا اور سینی کی دھن بجاتا اپنی راہ ہو لیا۔ آج بھی راستے میں آئے ہر چھوٹے بڑے پتھر کوہ ٹھوکروں سے اڑاتا آیا تھا۔

☆☆☆

وہ لاؤنج کے ایک طرف رکھے آرائشی جھولے پر

ٹیک لگائے، ایک ٹانگ اوپر رکھے اور دوسری سے ہولے ہولے پاؤں کے زور پر جھول رہی تھی۔ کانوں میں ہینڈ فری لگا رکھا تھا اور موبائل پر کسی تحریر یا شیٹ مودی کا دھماکا دار سین چل رہا تھا جسے دیکھنے میں وہ اس قدر مگن تھی کہ مسز منصور اس کے پاس آ کر بیٹھیں، اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ کچھ دیر اسے گھورتی رہیں پھر زنج ہو کر ایک دھب اس کے گھٹنے پر ماری، وہ جو بری طرح مودی میں منہمک تھی یک دم اس زور سے اچھکی کہ سیل فون ہاتھ سے پھلتا ہوا فرش پر بچہ ریز ہو گیا۔ وہ ”ہا“ کی زوردار آواز نکال کر متاسف سی اپنے سیل کو دیکھ رہی تھی، امید کی کہ وہ یقیناً ڈنچ ہو چکا ہوگا مگر اسے اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، وہ اس منہمک کی مجروح شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

یہ پچھلے تین ماہ میں اس کا تیسرا سیل فون تھا اور مزے کی بات کہ وہ ہر بار سیل فون اپنے بھائی سے منگوائی تھی جو اپنی چوتھی بہن کو اس کی فرمائش پر لیٹ ماڈل کا موبائل سڈنی سے بھیج دیتا تھا۔ لیکن جب سے منصور رٹھور کو چٹا چٹا، انہوں نے اسے وارننگ دے دی تھی کہ اب اگر اس کے موبائل کو کچھ ہوا تو وہ اسے دوبارہ لینے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ”کیا ماما، یہ کیا کر دیا آپ نے۔ آپ کو چٹا ہے نا کہ پاپانے مجھے وارن کیا تھا کہ اب اسے کچھ ہوا تو آئندہ گے لیے چھٹی“ وہ شکوہ کنال انداز میں ماں سے مخاطب تھی۔

”تو کیوں اتنا مگن ہو جاتی ہو کہ کسی کے آواز دینے پر ہی اس بری طرح چوکتی ہو کہ ہاتھ سے گرا کے نقصان کر لیتی ہو۔“

مسز رٹھور نے اسے گھر کا اور خود بھی فکر مند ہوتے ہوئے موبائل اٹھایا۔ صد شکر کہ بچت ہو گئی تھی۔ لا کر اس کی گود میں چٹا اور اس کے قریب ہی جھولے پر بیٹھ کر بات کرنے کے لیے الفاظ کا چناؤ کرنے لگیں۔

”ابرش۔ بچے تمہارے پاپا آج کل تمہاری شادی کی فکر میں ہیں۔“

رہ گئی۔ ابرش اتنی ایکساٹینڈ ہوئی کہ آگے ہو کر ماں کے گال چوم ڈالے۔

”تو یہ ہے۔ کتنی بے شرم بیٹی ہے میری۔ کسی بچے کو کیا کہے ابرش؟“ مسز منصور نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے گھر کا مگر ابرش کو برابری نہیں پڑا۔ چپکتے ہوئے ماں سے بولی۔

”ماما۔ کسی کو بچے چلے گا تو کچھ نہیں کہے گا۔ کیونکہ لڑکیاں اپنے بچے کو بچا کر لے جاتی ہیں۔ ایک میں بے چاری سسرال پہنچ جائے گی تو کیا آفت آجائے گی ماما۔“

مسز منصور اس کی بات پر کھل کر ہنس دیں۔ آگے جبکہ کر اس کی پیشانی چوئی اور ہنستا سے چہرے لہجے میں بولیں۔

”کوئی آفت نہیں آتی۔ بھلا تمہارے ہوتے ہی کسی کو آفت کی طلب ہو سکتی ہے۔ تم تو جس کے لیے بندھو کی وہ صبح شام ہمیں دعاؤں دے گا کہ کیا خوب طریقے سے اپنی بلا میرے گلے ڈالی انہوں نے۔“

”نہیں ماما۔ سالک پاشا بدترین ضرور ہے مگر اسے نہیں۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اگلے ہی بل زبان دانتوں میں دبائی۔ مسز منصور نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”سالک پاشا۔ آں۔ اچھا۔ لیکن تمہارے پاپا سوچ رہے تھے گرد بڑی صاحب کے بیٹے کے لیے اور میرا جی تھا بیگم اسماعیل کے نواسے کی طرف۔“

پر سوچ انداز میں بولی ساتھ ساتھ ان کیوں سے ابرش کا جائزہ بھی لے رہی تھیں، جس کا رنگ ان کی بات سننے ہی قہقہے ہو گیا تھا۔ وہ فوراً سے پیش تر بول اٹھی۔

”مجھے کہیں نہیں کرنی ماما۔ آج سے میں تو یہ کرتی ہوں اپنی خواہش کے لیے۔ لیکن مجھے نہ گرد بڑی انکل کے ہاں شادی کروانے میں اثرش ہے نا بیگم اسماعیل کے اس رویہ کو نواسے میں۔ بس۔ اتر گیا میرا شوق شادی کروانے کا۔ اب تو سوچ رہی ہوں کہ ایسا ہی اسی سے فسلک ہو کر ساری عمر علق خدا کی خدمت میں گزار دوں۔“ وہ روہائی

ہوتی اس طرح بول رہی تھی جیسے خود پر ترس آ رہا ہو۔ مسز منصور نے اس کے گال پر ہانگی سے چپت لگائی اور اس کی شعلہ بیانی پر بند باندھا۔

”زیادہ اور مت ہو میری چندا۔ جتنے کے قابل آپ ہیں نا اتنا ہی لمبا لمبا چھوڑیں۔ اب آ جاؤ اصل بات پر۔ عادل صاحب نے تمہارے پاپا سے اشارے کئے ہیں رشتے کی بات کی ہے۔ گراچی ہے۔ دل سے پوچھا ہے کہ رشتہ کی بات کی ہے۔ تمہارے پاپا کو تو سالک بے حد پسند ہے۔ پھر ہے کچھ کم سے کچھ پوچھ لوں۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ میری بیٹی اتنی اناکولی ہے کہ خود ہی بچوت پڑے گی۔“

”او ماما۔ آئی لو یو۔ سیر سیلی۔“ پورے انہماک سے سنی ابرش بات ختم ہوتے ہی ماں کے گلے لگ گئی۔ اسے بالکل امید نہیں تھی کہ اس کی دعا میں یوں رنگ لے آئیں گی۔ جسے دن رات اللہ سے مانگی تھی وہ ہیرا اس کے سر کا تاج بن جائے گا۔ مسز منصور نے بیٹی کو بڑی محبت سے سمجھ لیا۔ وہ انہیں بے حد پیاری تھی اور اس کی مرضی کا انہیں کچھ اندازہ تھا۔ اسی لیے وہ پہلے ہی منصور صاحب کو اد کے کاسٹل کے چلی تھیں۔ تو ابرش کی ایک بک بننے کا شوق تھا انہیں جو اس کے پاس آ بیٹھیں۔ لیکن اب بچھتا رہی تھیں کیونکہ اس کی زبان کی گاڑی پڑی پر چڑھ گئی تھی اور ایندھن کی ابرش کی پاس کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ مسز منصور پہلے سے ایک اچھی سمجھتی تھیں مگر ابرش کی بے پرہیزی کی سننا بھی ایک آرٹ تھا۔

☆☆☆

وہ نیم گرم کمرے میں گرم گرم کافی انجوائے کرتا، فریج وچ دیکے قریب کھڑا تھا۔ بند کھڑکی کے پار رات کا ساں اور اڑتی دھند اس کی نظر کے پردے پر ماحور کے دل پر نقوش ابھار رہی تھی۔ وہ اب ہر وقت اس کے حواسوں پر سوار رہا کرتی تھی۔ وہ چہرے پر اور سرد تاثرات والا مرد مانا جاتا تھا۔ اگر وہ ایمان داری سے اپنا تجربہ کرتا تو وہ لاشعور کی طور پر اسٹینڈرڈ کانسپس رہا تھا۔ کالج لیول پر اس کے ساتھ جو لڑکیاں پڑھتی تھیں، وہ

انہیں کبھی بھی اس قابل نہیں سمجھا کہ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا اور مزید اسٹڈیز کے لیے جب وہ فارن گیا تب وہاں پر اس کی ایک دو لڑکیوں سے علیک سلیک ہوئی تھی جن میں سے ایک لبنان کی تھی اور دوسری کا تعلق اٹلی سے تھا۔ مگر ان دونوں کی اپنے طور پر بھرپور کوششوں کے باوجود وہ متعین کردہ حد سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ اس زمانے میں وہ آدم بے زار زیادہ رہا کرتا تھا اور اب ایک طویل مدت بعد جب کہ وہ ابی کے ساتھ پرنس میں ویل ٹرن آؤٹ دے رہا تھا تو اسے پسند بھی آئی تو کون۔ ماحور مل!

ایک بد ماغ، یک چڑھی حسینہ جو منصور رٹھور کی کمپنی کی ایک معمولی ایپلائی تھی۔ کافی کا ایک طویل سب لیتے ہوئے وہ وہاں بیٹھ کر جانب آیا۔ اپنے بیڈ پر بیٹھ کر کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے اپنے لٹواری بیڈروم کا جائزہ لیا۔ ہر طرف جیسے اسے ماحور چلتی پھرتی دکھائی دی۔ کیسا دل کشین احساس تھا یہ۔ اسی اثناء میں سائینڈ ٹیبل پر رکھے اس کے موبائل کی بپ ہوئی۔ کافی کانگ رکھ کر اس نے ٹیبل سے سیل فون ہاتھ میں لیا اور آنے والا پیج اوپن کیا۔ کسی دوست کی طرف سے بھیجی گئی ہلکی ہلکی شقیہ نظم تھی۔ اس نے پوری توجہ سے پڑھی اور پڑھتے ساتھ ہی نہ جانے کس خیال کے زیر اثر اس نے وہ نظم ماحور کے نمبر پر سینڈ کر دی۔ یہ غیر ارادی فعل تھا جو اس سے سرزد ہوا تھا لیکن دل کی دھڑکن تیز ضرور ہوئی تھی۔ وہ ایک طویل سانس کھینچ کر ریتھلائی کا انتظار کرنے لگا۔

دوسری جانب ماحور سب بچوں کو سلا کر خود فرصت سے جنت کے سائیں ہوم ورک کی ڈائیکٹراز بن رہی تھی۔ چھوٹے سے بیڈ کو وہ اور جنت دونوں شیئر کرتی تھیں۔ وہ اس کی غنیمت کے خیال سے بہت محتاطی کنارے پر ہو کر کام میں مگن تھی جب اس کے سائینڈ موبائل پر واٹر مارک ہوئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آیا۔ مکمل خاموشی اور ایسے میں سیل کی مخصوص تھر تھر اہٹ۔ اسے یقین تھا کہ بے وقت کال اور پیج کا دورہ مومن کے علاوہ کسی کو نہیں

روشن راتے منزل کے

<https://www.urdutubes.com/>



URDU TUBES
* VIKER ENTERTAINMENT *
www.urdutubes.com

بعد بھی میں یہیں ملوں گی۔ آخر اتار پانا حساب کتاب کرنا ہے۔ آدھے گھنٹے میں تھوڑی نہ ہو جانا ہے۔“ سیف اور ماحور ایک دوسرے کو سختی خیزی سے دیکھتے باہر نکلنے لگے جب ایک بار پھر اماں جی کی آواز سنائی دی۔ ”اور اب خبردار جو مجھے اماں جی کہا ہو تو۔ وادی کی ہوں میں تمہاری۔ وادی۔ تمہارے باپ کی چاچی ہوں۔ اسے گودوں کھلا ہوا ہے۔ وادی بلانا مجھے حساب کیا میں اس کی آپ کو وادی بلادوں؟“ رانی نے کہا۔ مسکیت سے پوچھا تھا۔ جواب اماں جی ہرگز کر پوئیں۔ ”جب کر میٹھ کی۔ بڑی آئی۔ وادی بلادوں“ انہوں نے اس کی نقل اتاری اور پھر گھر کئے ہوئے بولیں۔ ”اچھا چل پہلے ایک کپ چائے بنا کے لا۔ اس کے بعد بتائی ہوں کیا بلانا ہے۔“ میٹ سے باہر نکلے ہوئے ماحور کے کانوں میں ان کی آواز پڑی۔ اسے رائے کی حالت پر بھی آگئی۔ بے چاری بری چھٹی تھی۔ اس کا موڈ یک دم بہت اچھا ہو گیا تھا۔ وہ بار بار زبان سے زریب وادی کی گردان کرتی جا رہی تھی۔ ان بہن بھائیوں کے بھلاک کوئی رشتہ دیکھا تھا۔ وادی تانی والے رشتہ کی چاشنی کی انہیں خبر ہی کہاں تھی۔ آفس جانا اس کی چھوری نہ ہوتی تو وہ آج کی چھٹی کر رہی۔ دل میں تجس ہلکورے لے رہا تھا کہ یہ وادی آج سے کہاں تھیں اور عقل مغل نے بھی ان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا تھا۔ شاید ان میں اور ان کی اولاد میں لافانی کی جو بیج حاکم تھی اس نے بھی ایسی نویت ہی نہیں آنے دی تھی کہ وہ لوگ آپس میں نارمل انداز میں گپ شب کر سکتے۔ حالات نے مزاجوں میں ایسی تیخیاں بھر دی تھیں کہ رشتے اپنے مقام اور معیار سے نیچے گر گئے تھے۔ جنہیں چھٹنا اور درخت بنا چاہے تھا وہ ایسی خود رو جھاڑیاں بنے جنہیں نہ تلف کیا جاسکا نہ سیچا جاسکا۔

☆ ☆
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

جھپٹ لیا تھا مگر موافق دے گیا۔ اسے بولو باہر آئے اور میری ایک ایک چرائی ہوئی چیز کا حساب دے۔“ بات خاصی پریشان کن تھی۔ سیف اور ماحور دونوں انہیں نہیں جانتے تھے۔ چلے سے وہ ٹھیک ٹھاک لگتی تھیں، غلط بیانی کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ سیف نے جھل کر پوچھا۔ ”آپ ہیں کون اماں جی؟“ ”میں عقل مغل کی سگی چاچی ہوں اور یہ منوس پچھلے کئی سالوں سے میرے بند پڑے گھر میں سے چیزیں چرا چا کے بیچ چکا ہے۔ سمجھے؟“ وہ دونوں بک دگر رہ گئے۔ بھلا بابا کی چاچی ہوں اور انہیں پتا نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سیف اور ماحور نے فوراً پلٹ کر چالی والے دروازے سے جھانک کر باپ کو دیکھنے کی کوشش کی تو وہ یکدم دھب کی آواز کے ساتھ لاؤنچ کے بوسیدہ قالین پر جت لٹ چکے تھے۔ یعنی دال میں واقعی کچھ کالا تھا۔ عقل مغل انہیں جانتے تھے اور جو یہ کہہ رہی تھیں، اس کی چاچی کا اندازہ عقل مغل کے استرا از سے صاف ہو گیا تھا۔ وہ آواز پر سن کر سوئے بن گئے تھے۔ ماحور نے آگے بڑھ کر اماں جی کے ہاتھ تھامے اور عقل سے بولی۔ ”اماں جی۔ بابا اس وقت نئے کی حالت میں اندر لاؤنچ میں پڑے ہیں۔ آپ کو ان کے اٹھنے کا انتظار کرنا ہو گا۔ تب تک آپ چاہیں تو یہیں بیٹھ کر انتظار کر لیں ورنہ دوبارہ آجائیے گا۔“ ”ہونہ۔ ہرگز نہیں۔“ وہ اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولیں۔ ”میں یہیں رکوں گی اور اس کے اٹھنے کا انتظار کروں گی۔ آج میں اپنی ایک ایک پانی کا حساب لوں گی اس سے۔“ ماحور نے قدرے بے بسی سے رائے کو دیکھا تو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لہلہ دیتے ہوئے کہا۔ ”تم جاؤ۔ میں ہوں یہاں۔ جب تک عقل اٹھ نہیں جاتے، میں اماں جی کے پاس ہی ہوں۔“ ”ہاں۔ ہاں۔ اس میٹھ کی کوچھوڑ جاؤ میرے پاس۔ اور بے فکر ہو کر جاؤ۔ تم لوگوں کی واپسی کے

طویل راہ داری کے دائیں بائیں لوگوں کا جم غفیر ساتھ ساتھ، صاحب نے عائشہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما ہوا تھا، وہ دونوں لوگوں کے درمیان میں سے جگہ بنائی ہوئی ہال میں داخل ہوئیں۔

کونسل کا اجلاس زور و شور سے جاری و ساری تھا۔ مختلف شہروں سے آئے این جی اوز کے کارکن اس اجلاس میں شامل تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا سب سے بڑا اجلاس تھا جو ایک فائبرسٹار ہول میں ہو رہا تھا اور ان پانچ سالوں میں پہلی بار صاحب اس طرح کے کسی اجلاس میں شرکت کر رہے تھے، ورنہ مختلف پروڈیوسرز کے لیے تنگ و تاریک سیڑھیوں سے گزر کر دو، تین کمروں پر مشتمل فاریں ورث کرنا جہاں دیوار گیر الماریوں سے جھانکتی فائلیں اور دوسری جانب قریب قریب رکھی کرسیوں پر براجمان خواتین و حضرات فائلوں میں سر دیے دکھائی دیتے، دھوپ کے ٹھنڈوں اور طویل مسافت کو پیدل طے کر کے جھنجھٹائے اعصاب اس پرستیز اولوگوں کے سرد اور ترش رویے اس کے رے سے اوسان بھی خطا کر دیتے، ان حضرات کے لبوں کی تراش میں چھپے استہزائیہ الفاظ چہروں کی بناوٹ سے چٹکی کھاتے طنزیہ تاثرات صاحب اس کی حیثیت عیاں کر دیتے، لیکن وہ بھی کمال مہارت سے خود پر بے نیازی کا بورڈ چسپاں کیے دل ہی دل میں ان کو ہزار ہا گالیوں سے نوازی، فائلیں دھڑا دھڑان کے آگے کھینچتے۔

”مختصر یہ تو رجسٹرار کا کام ہے، جو آپ ہمارے پاس لے آئی ہیں۔“ کسی بھی پروڈیوسر کی منظوری کے تمام مراحل سے مکمل آگاہی رکھنے کے باوجود صاحب اس وقت اتنی کوری نظر آتی یا نظر آنے کی کوشش کرتی، جیسے پہلی بار اس فیلڈ اور اس کے قواعد و ضوابط سے آشنائی حاصل کرنے جا رہی ہو۔

”سر پریز آپ اپروو کر دیں، تاکہ میں آگے

ہیڈ اور کر سکوں۔“

”رجسٹرار تک فائل پہنچانا تو اتھارٹی کا کام ہے، ہمارا کام تو صرف ریسرچ کرنا ہے۔“ وہ منتوں

ترلوں پر اتر آتی، سامنے بیٹھا ہوا شخص اگر کوئی مرد ہوتا تو اس کی اس ادا پر جھینپ سا جاتا، اس کی آنکھوں سے عیاں ہوتی دو چند روشنی اور صاحب دیکھنے کا انداز صاحب کے اندر خطرے کا سنگل پر دیتا، لیکن بظاہر وہ پرسکون اور بے نیازی موصوف کی حرکات و سکنات کو اس وقت تک برداشت کرتی جب تک فائل اوکے نہ ہو جاتی اور فائل اوکے ہونے کے بعد وہ اسی لاپرواہی سے ہال کے باہر نکلتی۔

”مس وہ آپ کا نمبر؟“ کیا ہم کہیں باہر مل سکتے ہیں؟“ مطالبہ انتہائی محسوس پیرائے میں کیا جا رہا تھا کہ صاحب دل ہی دل میں دانت پکچا کر رہ جاتی، اس سرعت سے اپنی خود اعتمادی کی لگاموں کو تھامے ہوئے انتہائی مہارت سے وہ نمبر دیتی جس کو سرے سے جانتی نہ ہوتی، یا تو وہ بند ملتا پھر غلط ہو جاتا اب اتنی بڑی سچ پرانی نے کے بعد اس کے دل

میں یہ خواہش سر اٹھانے لگی کہ اس کو کوئی ایک پروڈیوسر ملنا چاہیے، مہتر ستارہ یا پھر روشنی زخمی کا..... لیکن وہ اپنی اس خواہش کا برملا اظہار انتہائی نیازی کے سامنے نہیں کر پاتی تھی، اجلاس اختتام پائی ہوا، صاحب لوگوں کے درمیان میں سے راستہ بناتی ہوئی اسٹیج پر کھڑے پانچ این جی اوز کے مالکان رجسٹرار اور دوسرے پروڈیوسرز کے اتھارٹی ممبران کے پاس پہنچی، اس نے باقی لوگوں کی طرح اپنی فائل اتھارٹی ممبران کی بیک میشری (جو کہ سب افراد فائلیں جمع کرنے پر مامور تھیں) کو چھانی۔

”آپ مس صاحبہ غلام علی ہیں؟“ اس سے قریب سے خالصتا مردانہ بھاری بھر کم آواز ابھری اس نے سر اٹھا کر مخاطب کو دیکھا اور اس کو لگا جیسے اس کے ذہن کے ساتھ اس کی نگاہیں بھی پھرا کر سناکت ہو گئی ہوں۔

”کہتے ہیں دنیا میں جس انسان سے سب سے زیادہ نفرت کی جائے یا محبت کی جائے، وہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر آکر ملتا ہے۔ آپ کا اس بارے

میں کیا خیال ہے مس صاحبہ، غلام علی صاحبہ.....!“ وہ اس کا نام دانتوں تلے یوں چبا چبا کر لے رہا تھا جیسے اس کی ہستی کو بھی نگل جائے گا، اس کے چہرے سے چھلکتی خفارت اور الفاظ کی ادائی نے صاحبہ کو اپنی جگہ ساکت کر دیا، لیکن اگلے ہی پل اس نے خود میں اتنی ہمت پیدا کی کہ خود کو اس منظر سے غائب کر سکے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی، لوگوں کے ہجوم کو چیرتی

گئی، وہ اپنے منہ سے نکلتے ہوئے الفاظ کو اس کا پیچھا کرے گا اور اب اس کی اطمینان جان لینے کے بعد وہ کسی طور چین سے نہیں بیٹھے گا۔ ہال کے آخری کونے پر بھی عائشہ نیازی کو اس نے دور سے دیکھ لیا، وہ کسی لڑکی کے ساتھ جو گفتگو بھی۔ اس کے قریب آنے پر اس نے استہزائیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔“ عائشہ نیازی نے کلائی پر بندھی گھڑی کو سرسری انداز میں دیکھا۔

”لیکن ابھی تو.....“ عائشہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی اس کی مضبوط گرفت اپنے ہاتھ پر محسوس کرتے ہی چھپ ہوئی۔ وہ اس کا ہاتھ سچ کر اسی شد و مد سے واپس لے لے جا رہی تھی، جس طرح سے لے کر آئی تھی۔

”ابھی اجلاس ختم نہیں ہوا ہے صاحبہ۔“ بارنگ میں آتے ساتھ ہی وہ پھٹ پڑی۔ اے سی کی ٹھنڈی ہواؤں سے نکل کر اب لو کے پیچروں کو برداشت کرنا اور اشتہا انگیز کھانے (جو سرد ہونے والے تھے) چھوڑ دینے کا قلق بار بار اس کو آرزوہ کر رہا تھا۔

”جانی ہوں مجھے بھی یہ سب چھوڑ، چھاڑ کر یہاں گرمی میں سڑنا پسند نہیں ہے، لیکن مجھے صمیم عالم مل گیا تھا اچانک۔“ صاحبہ نے جلدی جلدی کہہ کر قریب سے گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا، دو تین منٹ کھڑے ہو کر بھاؤ تاؤ میں صرف کیے اور ٹیکسی ڈرائیور کے مطلوبہ پیسوں پر سر چینی، کرنی

کیا نہ کرتی کے مصداق دونوں ٹیکسی میں سوار ہو گئیں۔ ☆☆☆

”صمیم عالم کون ہے صاحبہ۔“ تنگ و تاریک راہ داری کے بعد اب وہ دونوں خرد و طی اشکال میں تعمیر سیڑھیوں پر چل رہی تھیں۔ صاحبہ کی نگاہیں سیڑھیوں کے دائیں بائیں بکھرے کوزے میں الجھی ہوئی تھیں، جبکہ اس کی سوچیں ابھی بھی صمیم عالم کی متوش و حیران نگاہوں کے سامنے مقید تھیں۔ ”بتایا نہیں تم نے۔“ عائشہ نیازی نے ایک ٹھوٹی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس نے چونک کر ہنکارا ابھرا، اس کی جانب دیکھا اور پھر ہونٹوں پر پچیس کی مسکراہٹ سجا کر بولی۔

”مہتر ستارہ والا۔“

”کیا..... سچی!“ عائشہ نیازی نے کچھ حیرانی اور پر جوش انداز میں اس کی جانب دیکھا، صاحبہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

سیڑھیوں ختم ہونے کے بعد ہوٹل کا اندرونی حصہ شروع ہو گیا تھا، یہاں چہل پہل مقنود تھی، وجہ اس بیتی دو پہر میں پیشتر لڑکیاں یا تو سوری ہوئی تھیں یا زیادہ تر لڑکیاں اپنے دفاتر سے لوٹی ہی نہیں ہوئی تھیں۔ روم نمبر 412 تک پہنچتے پہنچتے گرمی اور جس نے ان دونوں کا براشر کر ڈالا۔ صاحبہ کے کپڑے لینے سے شرابور ہو چکے تھے اور پورامنے بھی دھل گیا تھا کم و بیش یہی حال عائشہ کا بھی تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے چادر اتار کر کمرے میں پڑی چار پائی پر رکھی کمرے میں ایک چار پائی اور دو بیڈ تھے، صاحبہ کو بیڈ پر بیٹھ نہیں آتی تھی، اس لیے اس نے اپنے لیے چار پائی ڈالی ہوئی تھی۔ بان کی چار پائی پر لیتے ہی اس کو اباجی کی یاد آنے لگی جو سردیوں اور گرمیوں میں سفید اور نیلی دھاریوں سے بنی اسٹیک کی چار پائی پر دری پر بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے نظر آتے تھے، بھی لینے دینے سو جاتے۔

ان کو کتنی ہی بار صاحبہ نے کہا۔ ”اباجی! کمرے میں بیڈ کیوں رکھا ہوا ہے، جب آپ سوتے بھی نہیں

ہیں۔“ وہ کسی بچے کی طرح مسکرا کر بولتے۔

”وہی رانی ایہ بیٹو تیری ماں کا شوق ہے، ورنہ یہ بڑھا تو ابھی بھی خود کو اپنے پنڈ کی گلیوں میں گھومتا پھر تانکھیتوں میں واڑی کرتا اور پینل کے پنڈ کے نیچے بان کی چار بائی پر سوتا ہوا محسوس کرتا ہے، حق ہا، اباجی نے بد دعا دی تھی کہ اب پنڈ چھوڑ کر جا رہا ہے، غلام علی تو جہاں پھر واپس نہیں آئے گا تو۔ میری زمین اپنی محبت سے تجھے عاق کر دے گی اور دیکھ یہاں اتنا عرصہ رہنے کے بعد پنڈ صرف دوبار ہی جا رہا ہوں، ایک بار اباجی کی وفات پر دوسرا جب اباجی کی حویلی کے حصے ہو رہے تھے۔ اب یقیناً آ گیا، مٹی کی محبت کا جواب محبت سے نہ دو تو زمین عاق کر دیتی ہے، محبت سے بھی اور اسے وجود سے بھی۔“

”کہاں گھوٹی ہو؟“ عائشہ نیازی نے اس کے آگے چلکی بھائی، اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ عائشہ نے پھر مٹی سے نہ صرف جوس بنالیا، بلکہ کولہ بھی بھر چکی تھی۔ اس نے ایک گلاس صاحبہ کو دیا اور دوسرا اپنے لبوں سے لگالیا۔

”تمہارے گھر سے فون نہیں آیا صاحبہ کافی دن ہو گئے ہیں۔“

”ہاں، میں آج خود ہی اماں جی کو فون کروں گی۔“ اس نے گلاس خالی کر کے چار بائی کے ایک جانب رکھی، چھوٹی سی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆
صاحبہ کو اسپتال پہنچے بمشکل آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ چپڑا سی بلانے آ گیا۔
”صاحبہ بی بی آپ سے ملنے کوئی آیا ہے، میں نے نیچے والے وینک روم میں بٹھا دیا ہے۔“ اس کے کہنے پر صاحبہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک خوشی کی لہر اس کے رگ و جال میں سرایت کرنے لگی۔ شاید وہ پروڈیکٹ مل گیا ہو۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے مسکرائی، ورنہ تو آج کوفت اور جھنجھلاہٹ سے اس کے چہرے پر بارہا ہی بچے ہوئے تھے۔
”اب کی بار اماں جی کو زیادہ پیسے بھیج دوں گی

اور کہوں گی اور پکا پورشن بنوالیں اور بھائی صفدر سے کہوں گی رانی کو کسی اچھے اسکول میں داخل کرادیں۔ اور اب کی بار صائمہ کو دس کے بجائے پندرہ ہزار بھیجوں گی۔ تاکہ وہ خود پر توجہ دے۔“ وہ پروڈیکٹ سے ملنے والی رقم کا مصرف سوچتے ہوئے وینک روم میں داخل ہوئی، لیکن مقابل پر نظر پڑتے ہی صاحبہ اپنی جگہ سے ایسے اچھل جیسے سامنے پھنکارتا ہوا سانپ دیکھ لیا ہو۔
”تنت تم۔۔۔۔۔ تم یہاں۔۔۔۔۔ کیوں آئے ہو۔ صاحبہ کی زبان اور حواس اس لمحے اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اگلے دن ہی یوں آن وارڈ ہوگا۔

”جی میں! مس صاحبہ غلام علی کہے، کیا حال چال ہے۔“ وہ اس کے عین سامنے آ کر بولا اور صاحبہ کا اس لمحے دل چاہ رہا تھا کہ زمین میں ڈھس جائے۔ ”اوہ آئی ایم سوری! میں بھول گیا ڈاکٹر صاحبہ غلام علی۔“ وہ دانت کچا کچا کر بولا۔ اس کے لمحے میں پھلکتی بے زاری اور استہزائیہ پن نے صاحبہ کی پیشانی عرق آلود کر دی۔ ”اگر میں چاہتا ہوں صاحبہ غلام علی تو ایک فون اپنی کزن کو کھڑکا تا، اس کو منٹ بھی نہ لگتے اور آپ کی اصلیت سب کو بتاتے ہوئے، لیکن میں اتنا کم ظرف اور کمینہ پرور واقع نہیں ہوا صاحبہ۔ آپ کے گھر والوں نے میرا شہ نہ ٹھکرایا کہ میں ہنرستارہ میں معمولی سی نوکری کرتا ہوں اور آپ ڈاکٹر ہیں اور عفریب سرجن بن جائیں گی، میں اس پر بھی خاموش رہا، اپنی خواہش دل کے نہاں خانوں میں دفن کر دی۔ لیکن میں ایک بات ابھی تک نہیں جان پایا آپ ڈاکٹر ہیں، یہ سب کو بتا ہے، لیکن آپ ڈاکٹر نہیں ہیں، یہ بات کس کس کو معلوم ہے، آپ کی اماں کو بہن، بھائیوں کو؟“ وہ استہزیائے نگاہوں سے اس کو دیکھنے لگا، ایسے جیسے پتھر اس کی جانب اچھال رہا ہو، ان سنگ ریزوں کی زد میں صاحبہ غلام علی کا وجود کہیں نیچے پاتال میں اترتا جا رہا تھا۔
”بہر حال آپ کو سن کر بہت دکھ ہوگا کہ جو

پروڈیکٹ آپ کو ملا ہے اس میں آپ میری ماتحت ہوں گی ڈاکٹر صاحبہ غلام علی۔“ بڑی بے دھیانی میں صغیم عالم نے فائل اس کی جانب بڑھائی، جو کہ صاحبہ کے قدموں میں گر گئی۔ وہ اپنی جگہ سے دو قدم پیچھے ہٹتی۔ وہ جانتی تھی صغیم عالم اس کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ بے شک اس کی ضروریات نے اس کو یہ پروڈیکٹ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔
”میں آپ کے ساتھ یہ پروڈیکٹ نہیں کروں گی صغیم عالم بہتر ہے آپ یہ پروڈیکٹ کسی اور کو دے دیں۔“ اس نے فائل پیچھے سے اٹھائی اور میز پر رکھ کر بولی، اس کے ساتھ ہی اس نے قدم آگے کی جانب بڑھا دیے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆
پروڈیکٹ آپ کو مل چکا ہے، اس کو نہ لینے کا نواب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یا میں یہ سمجھوں کہ مجھ سے جان چھڑانے کے سبب حربے ہیں یہ۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆
اس کا مضحکہ اڑاتا ہوا لہجہ چیلنج کرتا ہوا انداز کہ وہ کس صاحبہ ایک بار تمہارے گھر والوں نے مجھے پروڈیکٹ کر دی، لیکن تم مجھے رنجیک نہیں کر سکو گی میری بارشخصیت نہیں میری جانب ہائل کر دے گی۔
صغیم عالم کی چیلنج کرنی آنکھوں سے وہ نظریں چمکراتی اس کے پہلو سے نکل جانا چاہتی تھی۔ لیکن زندگی میں لڑنا اور ہر آزمائش کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہی تو صاحبہ غلام علی نے سیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆
اباجی کہتے تھے۔ ”پتر جینا یہ نہیں کہ سمندر کی لہروں کے ساتھ تیرا جائے، ہر آبی حیات سمندر کی لہروں کے ساتھ آگے بڑھتی ہے، بلکہ پتر جینا تو یہ ہے سمندر کی مخالف لہروں سے معرکہ آرائی کر کے ان کو زیر کر کے آگے بڑھا جائے۔“ اس نے اباجی کی یہ بات اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لی تھی۔
”ٹھیک ہے صغیم عالم، میں کل آپ کے آفس آ جاؤں گی۔“ صاحبہ نے فائل میز سے اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ یہ دیکھتے بغیر اس کے فیصلے

<https://www.urdu-tubes.com/>

سے صغیم عالم کی آنکھوں کی چمک دو چند ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
مولوی غلام علی کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ صاحبہ تیسرے نمبر کی تھی، جبکہ صاحبہ سے دو بڑی بہنیں بیاہی جا چکی تھیں۔ صاحبہ گوشتی اور آصف پڑھ رہے تھے، صفدر بھائی، اباجی کے ساتھ درکشاپ پر ہوتے۔ زندگی کے دن عیش و عشرت میں گزر رہے تھے۔ اباجی کا کاروبار روز بروز ترقی کرتا جا رہا تھا، جس کی وجہ سے گھر میں سکون ہی سکون تھا۔ صاحبہ کو شروع سے ہی پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ میٹرک میں صاحبہ نے اپنے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔ اس لیے اباجی کی خواہش پر صاحبہ نے ایف ایس سی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایف ایس سی امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد اس نے دو، تین اکیڈمیوں سے انٹری ٹیسٹ کی تیاری کی، لیکن ناکام رہی، صاحبہ کے حوصلے بلند تھے، جب ہی دوسری بار سلیکٹ ہو کر اس کا داخلہ لاہور میڈیکل کالج میں ہو گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆
اباجی نے اس کی رہائش ہوٹل میں کرا دی۔ ابھی ڈاکٹری کا پہلا سال ہی تھا کہ کسی نے جادو کی چمڑی سے جیسے سارے حالات ہی بدل دیے، آنا فانا اباجی بیمار ہو گئے اور صفدر بھائی ان کا کب کا جما جمایا کاروبار سنبھال نہ سکے۔ اباجی کی وفات کے بعد صفدر بھائی بھی گھر آ بیٹھے، قرض داروں کے تقاضوں کی وجہ سے صفدر بھائی نے درکشاپ بیچ دی اور خود وہ کسی اور کی درکشاپ میں کام کرنے لگے۔ گھر میں قانون کی نوبت تھی اور کوئی ایسا نہیں رہا تھا جو صاحبہ کی مہنگی فیس ادا کرتا۔ اس نے عائشہ نیازی سے مشورہ کیا، ان دنوں عائشہ نیازی گورنمنٹ کی جانب سے نرسنگ کا کورس کر رہی تھی۔ اس نے صاحبہ کو اپلائی کرنے کو کہا یوں نرسنگ کرنے کے ساتھ صاحبہ کو گورنمنٹ کی طرف سے بیس ہزار ملنے لگے جو وہ گھر بھیج دیتی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆
چار سال مکمل ہونے کے بعد مختلف اسپتالوں

میں کام کرنے کے ساتھ وہ دیگر پروجیکٹ بھی کرتی رہی، جس میں مینے کے حساب سے جو رقم ملتی وہ اپنے گھر بھیج دیتی۔ گھر کے حالات بہتر ہو گئے، ایسا محسوس ہونے لگا جیسے پہلے کا وقت لوٹ آیا ہو۔ البتہ اس پہلے سے وقت لوٹ آنے، میں پانچ سال کا طویل عرصہ لگا، جس میں صاحبہ کے ڈاکٹر بننے کا ارمان سب پیچھے رہ گیا۔ خاندان بھر میں سب صاحبہ کو ڈاکٹر صاحبہ کہہ کر بلاتے، اس کے لیے جو رشتہ بھی آتا، بھائی صفدر اور اماں جان مانع کر دیتے کہ صاحبہ کی شادی ڈاکٹر سے ہی ہوگی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب صاحبہ گھر آئی ہوئی تھی۔ بھائی کی بہن کی شادی تھی، اماں کے اصرار پر وہ بھی شادی میں شریک ہوئی، یہیں ضمیمہ عالم نے جو اس کی بھابی کا کزن تھا۔ صاحبہ کو دیکھا اور پسند کر کے رشتہ بھیج دیا، لیکن اماں اور صفدر بھائی نے سنتے ہی انکار کر دیا۔ ضمیمہ عالم باز نہیں آیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو، تین بار اپنی ماں، بہنوں کو صاحبہ کے گھر رشتے کے لیے بھیجا، لیکن ہر بار اماں اور صفدر بھائی مانع کر دیتے، اماں نے تو دبی دبی زبان میں گوشتی کے لیے کہہ دیا، لیکن ضمیمہ کی ماں، بہنوں نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ سا مدھکی اور اب ایک سال کے بعد وہ کسی اسب کی طرح اس کے ساتھ نہ صرف آچھا تھا، بلکہ اس کی اصلیت بھی جان گیا تھا۔ وہ جو اتنے سالوں سے ڈاکٹر صاحبہ غلام علی کی زندگی جی رہی تھی، ان چند دنوں میں ہی خوف سے ادھ موٹی ہونے لگی کہ اگر خاندان والوں کو پتا چل گیا تو اس کی ماں، بہنیں رشتہ داروں کا سامنا کیسے کریں گی۔ اتنا عرصہ خود کو مشقت کی بھٹی میں جمبھیک کر اس نے اپنے لیے پہل اور تن آسان راستوں کا انتخاب نہیں کیا تھا، خود کو صوب میں جلا یا، یہودی گری کی تپش سے بے بہرہ ہو کر گھر والوں کی آسودگی اور آرام کے لیے خود کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ اپنے احساسات اور جذبات کی قربانی دے کر صاحبہ نے ایک مرد کی زندگی جی لی۔

”محترمہ چلنا نہیں ہے کیا؟“ عائشہ نے اس کو سوچوں میں گم صم بیٹھے دیکھا تو ٹھوکا دیا، اس نے چونک کر عائشہ کی جانب دیکھا جو تیار شیار اس کے سامنے کھڑی تھی۔ عائشہ اور اس کی کہانی مختلف نہ نہیں تھی، بس فرق اتنا تھا کہ عائشہ سب کچھ اپنے شوہر کے لیے کر رہی تھی جو کینسر جیسے موذی مرض سے لڑنے کے ساتھ ساتھ کام میں چلے بھی کر رہا تھا اور اپنے اور اس کے گھر والوں کی دیکھ بھال بھی کر رہا تھا۔ ان حالات میں بھی عائشہ کے چہرے پر تفکرات کی پرچھائیاں صاحبہ نے بھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ عائشہ جیسی بننا چاہتی تھی، لیکن اس کی ہمت اور حوصلے عائشہ جیسے مضبوط نہیں تھے، ہر رات خود کو توڑ کر صبح بے وار ہونے تک اس کے چہرے پر کئی گزشتہ رات کی کہانی سب بڑھتے، جبکہ عائشہ نے اندرونی حالات سے صرف عائشہ ہی واقف تھی۔ اس نے کھڑنے کھڑے بالوں کو کپ میں مقید کیا۔ چادر اور جھمی، پرس اور فائل اٹھائی، کمرے لاک کے اور عائشہ کے ساتھ چل پڑی۔

”یہ بیس دن کا پروجیکٹ ہے، دس بلاک بیس دنوں میں کور کرنے ہیں۔ اس حساب سے کم دس گھروں کا ایک دن میں سروے کرنا ہوگا۔ تین فائلیں ہیں، ایک میں ان خواتین کی لسٹ دینا کرنا ہوگی جو خود لفیل ہیں یا کسی پروفیشنل منسوب ہیں۔ دوسری فائل میں گھریلو خواتین بچوں کی تعداد اور تیسری فائل میں مرد حضرات سے متعلق معلومات اکٹھی کرنی، دن کی اس پروجیکٹ مکمل کرنے کے بعد پانچ دن میں آپ کو پتہ چیک مل جائے گا۔ سبز ستارہ کی ادویات خواتین کو مہیا کی جائیں گی۔“ دائیں پائین میں قظاروں میں رہی کر سٹیوں پر براجمان خواتین کے عین سامنے کرسی پر ضمیمہ عالم بیٹھا تھا، اس کے دائیں جانب ایک لڑکی کھڑی تھی اور بائیں جانب ایک لڑکا تھا۔ ضمیمہ عالم نے جیب سے لسٹ نکالی اور لڑکی کو تھما دی، لڑکی نام

بڑھنے کے ساتھ ساتھ فائلیں تقسیم کرتی جا رہی تھی۔ ضمیمہ عالم کھڑا ہوا اور بولا۔ ”اس پروجیکٹ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ہماری این جی او ایک اور پروجیکٹ لانچ کرے گی، جو کوئی بھی وہ پروجیکٹ کرنا چاہتا ہے۔ پانچ دن میں میری سیکرٹری کو اپنا نام لکھوا دے۔“ یہ کہتے کے ساتھ ہی وہ رکنا نہیں۔ صاحبہ غلام علی کی جانب دیکھتا تو درکنار وہ اس کے وجود سے بھی

”سوچاوت ہوا صاحبہ غلام علی اماں کی بلند وبالا گھری کو اٹھائے اٹھائے تم صحرانوردی کی خاک یوں ہی چھاتی رہی ہو، ضمیمہ عالم نے تو محض یوں ہی نہیں دیکھ کر رشتہ بھیج دیا اور کیا خبر یہ رشتہ صاحبہ کے لیے نہیں، بلکہ ڈاکٹر صاحبہ کے لیے بھیجا گیا ہو۔ نرس صاحبہ تو شاید ہی اس کے معیار پر پورا اترتی ہو۔“ اپنی فائل اٹھانے کے بعد وہ عائشہ نیازی کے ساتھ باہر نکلی، کوریڈر کو عبور کرتے ہوئے اس کے قدموں میں لڑکشی آتی۔ ایک دم سے پیدا ہونے والے احساس کمتری نے اس کو خود سے نگاہیں ملانے کے قابل بھی نہ چھوڑا تھا۔

”میں صاحبہ آپ ایک منٹ میرے آفس آئیں۔“ وہ بول کے جن کی طرح دائیں طرف سے آنے والا ہوا۔ اس کو اپنے سامنے آچانک باکر صاحبہ ایک لمبے کو حیران رہ گئی اور اگلے ہی پل عائشہ کو فائلز تھما کر وہ کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل پڑی۔ بائیں جانب پر شکوہ آفس میں داخل ہوتے ہی صاحبہ کو یہ احساس شدت سے ہوا کہ کسی بھی انسان کی ظاہری سادگی اور وضع قطع سے اس کے رہن سہن کا اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔

”میں صاحبہ میری اطلاع کے مطابق آپ ایک پرائیویٹ اسپتال میں بطور نرس کام کر رہی ہیں، نرسنگ کے ساتھ آپ یہ پروجیکٹ کر لیں گی۔“ صاحبہ کو اس کے لب و لہجے پر حیرت ہوئی، کسی بھی قسم کی جان پہچان سے عاری انداز خالصتا پریشانی لہجے

نے اس کو حق دق کر دیا۔ ”میں رات کی ڈیوٹی لگوا لوں گی، اس طرح صبح سروے کرنے کا نام مل جائے گا۔“ ”میں صاحبہ آپ یہ پروجیکٹ کر لیں گی، میں جانتا ہوں، آپ کی آپچی ہے، تو کیا ضروری ہے خود کو یوں بلکان اور خوار کیا جائے۔“ ضمیمہ عالم اس کے حالات سے مکمل آشنائی رکھتا تھا، لیکن اس کے منہ سے سننا چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر کی واحد لفیل تھی جو کبھی عرصے سے ان کو سپورٹ کر رہی تھی۔ صاحبہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، وہ ماتھے پر ان گنت شکنوں کو سجا کر بولی۔

”محترمہ انسان کی ضروریات ہی اس سے کام کرواتا ہیں اور میں یہاں اپنے مسائل ڈھسک کرنے کے لیے نہیں بیٹھی۔“ اب وہ کیا بتاتی کہ کچھ ہی دنوں میں اماں گوشتی اور آصف کی شادی کر رہی ہیں۔ ان کی شادیوں کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ صفدر بھائی اوپر والا پورشن دوبارہ تیسر کر رہے ہیں۔ ضروریات منہ بھارے کھڑی تھیں اور صاحبہ بالکل بے بس تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس کا آپ کو برا لگے، لیکن اگر کچھ ایسا کہہ بیٹھا ہوں تو معافی مانگتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی انتہائی بے تکلفی سے دروازہ کھول کر ایک نازک اندام حسینہ اندر داخل ہو گئی۔ اس کے ناتواں کندھے پر جھولتا پرس ہاتھ میں پٹا ہوا لاکھ روپے کا سیل فون اور اس کا لباس اس کی امارت کا چچ چچ کر پتا دے رہا تھا۔

”ہم تو بچ پر جانے والے تھے ضمیمہ!“ اس نے کسی غیر اہم فالتوشے کی طرح صاحبہ کو نظر انداز کیا۔ اس کا مخاطب ضمیمہ عالم تھا جو اس لمحے صاحبہ کی ناراضی کے خیال سے ہی گھلا جا رہا تھا۔ ”رافعہ یہ مس صاحبہ غلام علی ہیں۔“ ضمیمہ نے اس کا تعارف کرایا۔ ”اس نے“ بیلو“ کہا اور پھر سے ضمیمہ کی جانب

متوجہ ہوئی۔ رابعہ کے پاس غیر اہم چیزوں اور غیر اہم شخصیات کو اہمیت دینے کا نہ تو نام تھا اور نہ ہی اسلیمنا۔ رافعہ کے ماتھے پر بل پر گئے کہ صمیم کیوں ایک غیر اہم معمولی سی لڑکی کو اہمیت دے رہا ہے۔
”میں چلتی ہوں۔“ صاحبہ سرعت سے باہر کی جانب بڑھ گئی۔ ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچی تھی صمیم نے جلدی سے اپنی جیب سے کارڈ نکالا اور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

”مس صاحبہ کسی بھی شے کی ضرورت ہو، آپ مجھے اس نمبر پر کالینک کر سکتی ہیں۔“ صاحبہ نے اثبات میں سر ہلادیا اور آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆☆☆

تیس دن کا یہ پروجیکٹ صاحبہ نے جاں فشانی سے مکمل کر دیا۔ اس پروجیکٹ سے ملنے والے پیسے اور اپنی خواہ اس نے اماں کو بھیج دی۔ ان کا اصرار تھا کہ صاحبہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر آجائے۔ آصف اور گوئی کی شادی میں شخص ہفتہ بھر ہی رہ گیا تھا۔ صاحبہ ایک اور پروجیکٹ کرنا چاہتی تھی، لیکن اماں کے اصرار پر اس نے آنے کی باہی بھری۔ اس نے یہ بات عائشہ کو بتائی تو کچھ بل وہ خاموشی سے پرسوج نگاہیں صاحبہ کے چہرے پر گاڑے رہی۔

”کیا دیکھ رہی ہو۔“ صاحبہ کو اس کی ان نگاہوں سے الجھن ہونے لگی۔

”صاحبہ گوئی تم سے تین سال چھوٹی ہے اور آصف پانچ سال تمہاری اماں ان دونوں کی شادیاں کر رہی ہیں۔ حالانکہ ان کو تمہارے متعلق سوچنا چاہیے۔“

”میرے لیے رشتے تو بہت آتے ہیں، لیکن وہی رٹا رہا جواب اس کو بھی دیا جو وہ سب کو یاد کرتی تھی۔ لیکن شاید اس سوال کا جواب عائشہ نیازی کو دینا خود کو دھوکا دینے کے مترادف تھا۔ اس جواب میں کتنا بچ اور کتنا جھوٹ تھا، یہ خود صاحبہ کے علاوہ عائشہ نیازی بھی جانتی تھی۔

”اگر میں ایک بات کہوں جو تمہیں اچھی نہ لے تو پلیر انگو کر دینا، لیکن اتنا حرصہ تمہارے ساتھ رہ کر میں یہ ہی جان پاتی ہوں دوسروں کے لیے جینا خاص طور پر اپنے سے وابستہ لوگوں کے لیے جینا ضروری ہے، لیکن اتنا بھی نہیں کہ اپنی ذات کو اندھروں میں دھکیل دیا جائے۔ اگر کہیں سے روشنی چھونے کی امید ہو تو ایسی امید کوٹھنی میں مقبکہ کر لو ہوں آسانی سے اس کو جانے نہ دو۔“

”کیا مطلب میں سمجھ نہیں؟“ صاحبہ کے لیے سے زیادہ اس کی آنکھوں میں تیر کی لہریں ٹھانیں رہی تھیں۔

”مطلب یہ کہ صمیم عالم بہت اچھا انسان ہے۔ اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت کی جگہ اتنی روشن اور واضح ہے کہ کوئی بھی پڑھ سکتا ہے، جس پوسٹ پر کام کر رہا ہے، اس کی خواہ اور حیثیت خود ہی دیکھ چکی ہو۔ اگر تمہارے لیے ڈاکٹر کا رشتہ نہ آیا تو تمہارے بھائی اور اماں تمہیں یوں ہی بٹھائے رکھیں گے۔“ عائشہ کہہ کر رکی نہیں تھی اور اس کے جانے کے بعد صاحبہ چھت پر جھومتے اس کے منہ والے پتے میں اپنی قسمت کی لکیروں کو کھوجنے لگی۔

☆☆☆

گوئی اور آصف کی شادی یہ خوبی سر انجام پائی۔ صاحبہ کو سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گوئی کی والدہ دن اس کو صمیم عالم کی والدہ ملیں۔ صاحبہ کو انہماکی شفیق اور ملنسار خاتون لکیں۔ صمیم کی چھوٹی بہن گزیا بے تابی سے اس کی جانب بڑھی، اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”آپ بہت خوب صورت ہیں صاحبہ آپ کی سب سے بڑھ کر آپ کا دل، آپ کا اخلاق خوب صورت ہے۔ آپ نے جس محنت اور جانفشانی سے اپنے گھر والوں کو سپورٹ کیا ہے وہ تحریف کے قابل ہے۔ بھائی اکثر آپ کے متعلق مجھے بتاتے ہیں، کہتے ہیں پڑھائی پر توجہ دو، تاکہ صاحبہ کی طرح ڈاکٹر بن سکو۔“ اس کے آخری لفظوں سے صاحبہ پر گھڑوں

یابی بڑ گیا۔ انم بھابھی کے پکارنے پر وہ آگے بڑھ گئی۔ گوئی کی رخصتی کے بعد تینوں بہنیں اماں کے پاس بیٹھی تھیں۔ تب صائمہ آئی نے تذکرہ چھیڑ دیا۔
”اماں صمیم عالم کی ماں آپ سے کیا کہہ رہی تھی رخصتی کے وقت۔“ چھوٹے سنان کو دودھ پلاتے ہوئے دھبائی میں شروع کی گئی بات اماں کو سخت ناگوار گزری۔ کھانا کھاتے ہوئے ایک لمحے کو اس کا لہجہ بدل گیا۔
”دیں، لیکن موقع محل ایسا نہ تھا، اس لیے بات کو نالتے ہوئے بولیں۔“

”کہنا کیا ہے اپنے بچے کے لیے صاحبہ کا ہاتھ مانگ رہی تھیں۔ میں نے کہہ دیا اس کی شادی ہم ڈاکٹر سے کام کرنے ہیں۔ آصف کا کاروبار سیٹ کرنا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں اپنے کمرے میں اے سی لکوالوں اور ویلے بھی ابھی کون سی اس کی عمرنگی جارہی ہے۔ لوگ جہاں کماؤ لڑکیاں دیکھتے ہیں، اپنے بچے کے لیے چلا آتے ہیں۔“ ان کے زہر خند لمحے کے شکر صاحبہ کو اپنے دل میں اترتے محسوس ہوئے۔ لیکن سب کشائی کی اس میں نہ تو ہمت تھی اور نہ اس کا مزاج ایسا تھا۔

”اماں خیر یہ بات تو نہ کہو تو اس کی کافی ہے۔ میری ساس، ننندیں تو مذاق اڑاتی ہیں، کہتی ہیں تمہاری ماں نہیں کرے گی صاحبہ کی شادی۔“ پلوٹہ آئی نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ اماں کا منہ سرخ پڑ گیا۔ وہ کھانا ایک طرف۔ رکھتے ہوئے بولیں۔

”جی جی ہیں تیری ساس، ننندیں میری صاحبہ سے کسی کماؤ پوٹ کی طرح گھر چلا رہی ہے، جبکہ تیری سنانندی ننندیں مان، باوا کے سینے پر مونگ دل رہی ہیں اور خبردار جو آئندہ اس طرح کی بے سرو پا باتیں کی ہوں۔ میری اولاد ہے۔ جب دل چاہے گا، جس سے چاہے گا شادی کروں گی۔“ اماں کی کمراری آواز نے ان دونوں کی یوتی بند کردی اور شاید بولتی تو صاحبہ کی بھی بند ہوئی تھی۔ دل میں اٹھنے والے

سوالات تھپڑوں کی بوچھاڑ سے خاموش ہو گئے تھے۔
”میری بیٹی ڈاکٹر ہے، کوئی معمولی لڑکی نہیں جو یوں ردی کی ٹوکری میں ڈال دوں۔“

”اماں میں ڈاکٹر نہیں ہوں، جاتی ہوں یہ بات۔“ صاحبہ کی آواز پر اماں کو سوپ سوکھ گیا۔

”ہمارے لیے تو ڈاکٹر ہی ہونا اور ویسے بھی پورا خاندان جانتا ہے صاحبہ ڈاکٹر ہے۔“ پلوٹہ آئی نے اپنی بہن کے تیر ملاحظہ کرتے ہوئے کہا، جو کسی طور بھی ان کے لیے اچھا شگن پیش نہیں کر رہے تھے۔ اس کی آواز سے عیاں ہوئی بغاوت اماں نے بھی بھانپ لی تھی۔ اس لیے آنکھوں ہی آنکھوں میں صائمہ اور پلوٹہ کو خاموش رہنے کا عندیہ دیا۔

☆☆☆☆☆

واپس آ کر صاحبہ اپنے کام میں مگن ہو گئی، البتہ دن بے کیف اور اراتیں مٹی ہوتی گئیں۔ اس نے دو، تین پروجیکٹ حاصل کر لیے۔ خود کو مصروف کرنے کی تنگ دو میں اکثر گھر والوں سے رابطہ بھی نہ کر پائی۔ اتوار کا دن تھا وہ کسلندی سے چارپائی پر چت مٹی سوچوں کے سمندر میں الجھی ہوئی تھی کہ یکایک اماں کے غیر متوقع فون نے اس کی سوچوں کے گرداب میں کنکرا اچھال دیے۔ فون آن ہوتے ہی اماں نے اس کو باتیں سنانا شروع کر دیں۔ بے حیا سے لے کر نافرمان تک کے لقب اس کے گردار پر دیے مارے۔ وہ یک دیکھو لے کی سعی میں ہلکان ہوئی، ان سے پوچھتی رہی کہ آخر اس کا قصور کیا ہے۔ اپنی منانے کے بعد انہوں نے آخر میں اتنا سا کنکرا اس کی جانب اچھالا۔

”تم صمیم عالم سے شادی کر رہی ہو۔ کل ہی اس بدذات نے فون کر کے بتایا ہے اور اگر تم ایسا کر رہی ہو تو میرے گھر کبھی نہ آنا، میں تم جیسی نافرمان اولاد کے لیے مر گئی ہوں۔“

”اماں..... اماں..... یہ سب کسی نے کہا ہے آپ سے.....!“ وہ ان کی فرمائے بھری زبان کے درمیان بمشکل بول پائی۔

”اس صغیم نے فون کیا ہے صاحبہ تو اتنی خود غرض نکلے گی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”اماں اگر میں ایسا کر رہی ہوں تو گناہ تو نہیں کر رہی، جو آپ مجھے یوں بے نقط سناے جارہی ہیں۔“ اس نے غصے میں کہہ دیا۔

پہلی بار منہ سے نکلے اس طرح کے الفاظ نے اماں کے پیروں تلے سے زمین سرکا دی تھی۔ انہوں نے فون بند کر دیا۔ ان کے فون بند کرنے کے ساتھ ہی صاحبہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے بارہا ان کو فون کیا، لیکن نہ تو اس کی کال ریسپونڈ گئی اور نہ ہی دوبارہ فون آیا۔

اگلے ہی دن ڈیوٹی سے وہ سیدھی صغیم کے آفس جا پہنچی۔ میننگ میں ہونے کی وجہ سے پینشنسٹ نے اس کو بینکنگ روم میں انتظار کرنے کو کہا اور جیسے ہی اس کو بلایا گیا وہ آندھی طوفان کی طرح صغیم کے کمرے میں داخل ہوئی، لیکن وہاں موجود رافعہ کو زار و قطار روٹا دیکھ کر صاحبہ ہٹا کر کمرے کے دروازے میں ہی بیٹھا رہ گئی۔ یہ صورت حال تو یقیناً رافعہ کے لیے بھی خوش کن نہیں تھی۔ اس نے تھکے چوتھوں سے صاحبہ کو گھورا، جیسے اس کا سر پھاڑ دینے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اس کی اینگلیک بام عروج پر تھی اور منزل بے حد قریب جب اس دو ٹکے کی لڑکی نے انٹری دے کر سارے دردناک سین کو ایک دھکوکے اور ڈرامے میں تبدیل کر دیا تھا۔ صغیم عالم کا ہاتھ اس کے کندھے پر دبوکی کے لیے بڑے والا تھا۔ صغیم عالم کے بازو میں بھر جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ صغیم عالم صرعت سے بولا۔

”رافعہ میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میں اور صاحبہ شادی کر رہے ہیں، تم کوشش کرو تو اپنے اوپر بار کے درمیان تمام معاملات باہمی گفت و شنید سے حل کر سکتی ہو، وہ شرمندہ ہے، بلکہ.....“ صغیم عالم نے توقف سے اپنا سیل دیکھا، جس پر دھڑا دھڑا ایں ایم ایں آرہے تھے۔ ”وہ باہر آیا ہوا ہے، میں نے ہی

اس کو بلایا تھا۔ تم اس سے بات کر لو۔“ صغیم عالم کے اس طرح کہنے پر رافعہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے اس کو گھورا، لیکن وہ صاحبہ کے چہرے پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا۔ وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جارہی ہو رافعہ۔“ صغیم نے دھتے لچے میں پوچھا۔

”بابر سے ملنے۔“ سر دوسیاٹ لچے میں کہہ کر وہ رک نہیں، اس کے جانے کے ساتھ ہی صغیم عالم کے سر کرسی کی پشت سے ٹکیا اور اس کو جھٹکا۔

”یہ پیپر ویٹ پڑا ہے اور سامنے ہی میرا سر ہے، آپ بے حد شوق پھاڑ سکتی ہیں۔“

”کیا بکواس کی ہے آپ نے میری ماں سے.....؟“ وہ بھوک شیرینی کی طرح آگے بڑھی۔ اگر درمیان میں وسیع و عریض میز نہ ہوتی تو یقیناً اس کی جھپٹ ہی پڑتی۔

”میں نے ان سے صرف اتنا کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، تمہارے ساتھ ہی کام کرنا ہوں اور یہ بھی کہا کہ اگر میں ڈاکٹر نہیں ہوں تو آپ کی بیٹی کو نئی ڈاکٹر ہے اور مس صاحبہ غلام علی

یہ سنتے ہی آؤٹ آف کنٹرول ہو گئیں۔ میرے باپ سے لے کر ماں تک کے خاندان، بلکہ پورا بھروسہ کوہی بد معاش اور جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ اس پر میں نے سکون سے کہا کہ ہم دونوں کورٹ میرج کر لیں گے۔ اگر آپ نہ مانیں، تو انہوں نے شرط عائد کی کہ میں اپنا گھر آپ کے نام کروں، میں نے کہا، منظور ہے، پھر بویں، آپ کو میں پسند ہی نہیں ہوں۔ میں نے کہا بیٹی سے پوچھ لیں۔ ہو سکتا ہے میرا خیال ان کے سکون میں دراڑیں ڈالتا ہو۔ وہ اپنی بات کہہ کر ایسے پرسکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے وہ اس کی کسی اور کی رام کھانا کراب پوچھ رہا ہو، بتاؤ کیسی لگی کہانی تمہیں۔

”میں آپ سے شادی نہیں کروں گی، سنا آپ نے۔“ وہ پھر بولی۔

”صاحبہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے قدر ہے تمہاری، لیکن یہ سوچو اپنی زندگی کے دس قیمتی سال دینے کے بعد بھی اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اپنے لیے اسٹینڈ لینا خود غرضی ہے تو پھر تمہیں نن بن جانا چاہیے، یا پھر مدرزیا، کیونکہ اپنے گھر والوں کے بعد باقی لوگوں کو بھی فیض یاب کرو، ان کے حقوق کی جنگ کرنا تمہارا اولین مقصد ہونا چاہیے، یہ جو رافعہ روٹی ہوئی گئی ہے نا

صاحبہ نے ایک نگاہ غلط اس پر ڈالی اور پلٹنے کو کہی، جب سر عرت سے صغیم عالم اپنی نشست چھوڑ کر اس کے راسے میں آ گیا اور اس کا بازو پکڑ کر بولا۔

”میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں، میں داماد نہیں، بیٹا بنوں گا۔ ہر طرح سے مدد کروں گا، جیسے تمہارے گھر والے چاہیں چاہو تو اسٹامپ پر لکھوا لو۔ لیکن پلیز یوں ناراض ہو کر نہ جاؤ۔“ صاحبہ نے روٹی روٹی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور جھٹکے سے اپنا بازو پکڑ لیا۔

”پلیز صاحبہ، معافی کا ایک لفظ مجھے عنایت کرو، وعدہ کرتا ہوں تمہارے انکار کے بعد تمہیں بھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ کچھ کہو تو سہی۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا، لیکن صاحبہ نے قدم آگے بڑھائے جو کھٹ پر رک کر مڑے بغیر بولی۔

”میں کل جارہی ہوں اماں کو منانے، ہو سکے تو دو دن بعد اپنی والدہ کو دوبارہ بھیج دینا، ڈاکٹر صاحبہ غلام علی کو صغیم عالم صبر آف ہیز ستارہ کا رشتہ قبول ہے۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں، وہ جو دکھ میں گرفتار پشیمانی سے بھر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ پر اپنی جگہ سے اچھل ہی پڑا۔ اس کے پیچھے لپکا، جبکہ وہ دھڑا دھڑا میڑھیاں اتر رہی تھی۔

”تمت..... تم سچ کہہ رہی ہو۔ ڈاکٹر صاحبہ غلام

علی نے مجھے قبول کر لیا ہے۔“ وہ رینگ سے جھانکتے ہوئے چلایا۔ صاحبہ نے رک کر ایک لمحے کو اس کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

”سچ کہہ رہی ہوں۔“ رونے کے بعد اچانک مسکرا دینے سے صاحبہ کے چہرے پر قوس دوزخ کے رنگ بکھر گئے تھے۔ اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑے صغیم عالم مہوت رہ گیا، جبکہ وہ اس کے آگے چلکی جا کر بولی۔ ”اب دیر نہ کرنا، صغیم۔“ اور صغیم نے بے ساختہ لٹی میں سر ہلادیا۔ صغیم کو پہلی بار ایسا لگا جیسے صاحبہ کے اقرار نے اس کی ذات کی جانب بڑھنے والے اندھیروں کو ختم کر دیا ہو، اپنے مستقبل کے متعلق سوچ کر ہی ایک گہری مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی اور وہ کل کر مسکرا دیا۔ آگے کے تمام راستے روشن اور واضح تھے۔

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

لیکھی شال

دخسانہ نگار خان

مکمل ناول کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

منگوانے کا پتہ:

ملکیتہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

قیمت - 500 روپے

خاتونِ گدا

پہلی اقساط کا خلاصہ:

بین کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ بین کا باپ قطب الدین چوہنے کا کام کرتا ہے اور ماں چکی چلاتی ہے۔ بین کو ان دونوں کاموں سے سخت چڑ ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اگر بابا زندگی بھر اسی کام سے نہ جڑے رہتے تو ان کی زندگی بھی آسانئوں سے پر ہو سکتی تھی۔ وہ آتے جاتے بابا اور ماں پر بوٹی ہے۔ چوہنے کی گرد اور خوشبو سے اسے نفرت ہے۔ جبکہ بابا کے لیے بین اس قدر مقدس ہے کہ وہ چوہنے کو الماس برادہ کہتے ہیں۔ اماں اس کی ناراضی کے ڈر سے کھانا روٹی ساتھ والوں کے گھر جا کر بناتی ہیں۔ اماں ابادوئوں مل اسے خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن گھر کے مسائل، ادھوری خواہشات، نامکمل آرزوئیں، چھوٹی بہن زویا کی خراب دماغی حالت، ماں کی بیماری، بابا کی کمزوری..... یہ سب بین کو دل بدن چڑھاتا رہتے ہیں۔

پھر ایک روز ماں کا انتقال ہو جاتا ہے اور ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بین ناپسندیدگی کے باوجود اپنے چچا زاد رشید سے نکاح کر لیتی ہے۔ جبکہ اس کے دل میں میران ہے۔ (جس سے بین کی بس ایک بار ملاقات ہوئی ہے)۔ ماں کے انتقال کے بعد بین کے لیے زندگی اور مشکل تر ثابت ہوتی ہے۔ رخصتی سے چند روز پہلے تانی رشید کے نام گھر لگانے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ لیکن گھر پہلے سے ہی بک چکا ہے جس کا کسی کو غم نہیں۔ تانی کو یہ بات مہندی والے دن بیان ہوتی ہے اور وہ اسی وقت رشید کے منہ سے بین کو طلاق دلوادیتی ہیں۔ بین جل کر کوئلہ ہو جاتی ہے۔ ساری رات رونے کے بعد وہ اپنی زندگی کو بدل لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ اس نے چوہنے کے برادے کو الماس (ہیرے) میں کیسے بدل کر رہنا ہے۔

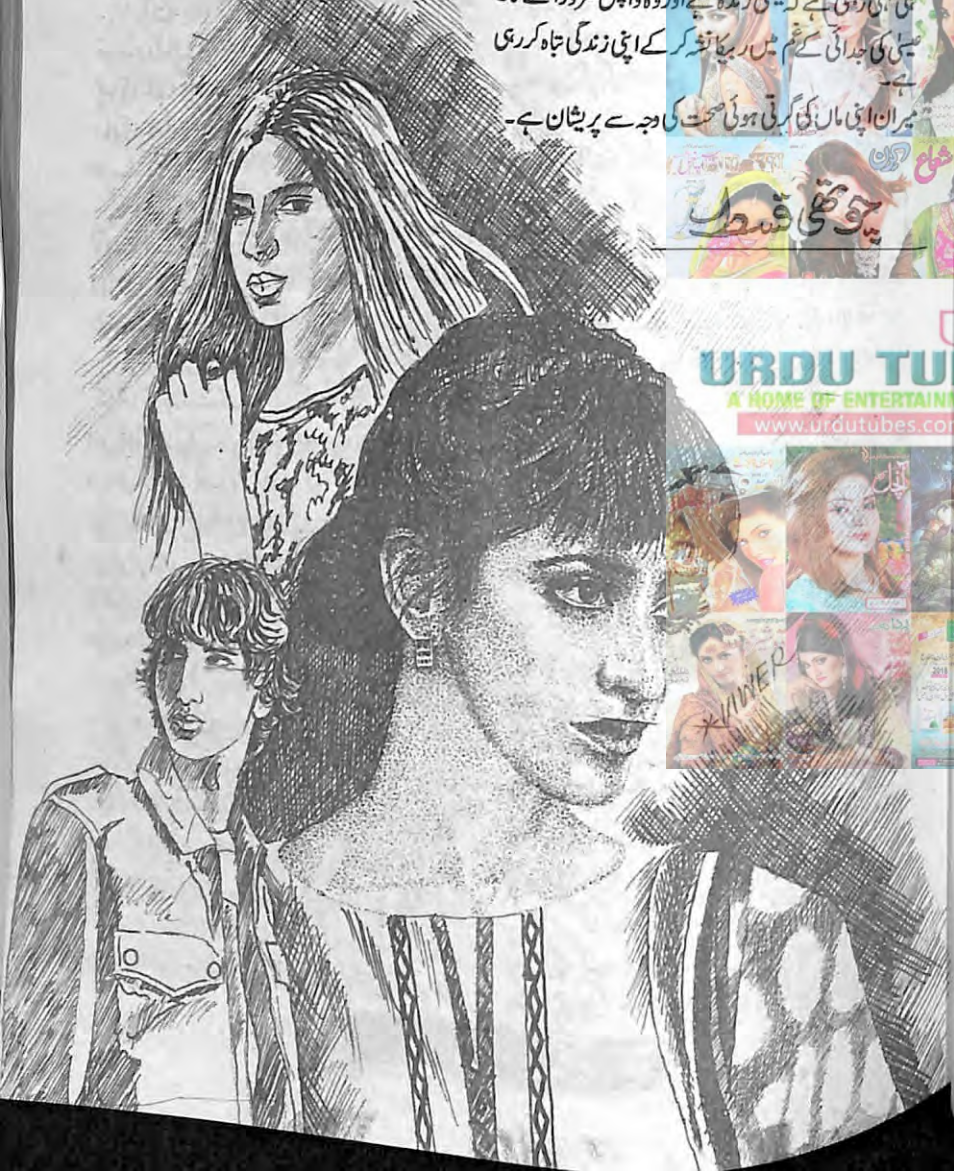
ڈان پیٹرسن دوا لگ شناخت کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ پیٹرسن کے نام سے وہ ایک جرائم پیشہ گروپ کا ڈان ہے اور ایڈم رائل کے نام سے وہ ایک مذہبی آدمی بن کر لوگوں کو بہت اچھے سے بے وقوف بنا رہا ہے۔ پیٹرسن امریکا میں ہوتے بہت سے جرائم کا سرغنہ ہے۔ اب اس کے گروہ کی جڑیں دوسرے ممالک تک بھی پھیلنے لگی ہیں۔ جہاں سے وہ نشہ آور منوعہ اشیاء کو امریکا میں سہولت سے کرواتے ہیں۔

بین چوہنے سے بنے ڈیکوریشن پیش کے ذریعے اسی گروہ کے لیے منوعہ اشیاء اسمگل کرنے جا رہی ہے۔ امریکا میں چیری کے باغات میں کام کرنے والی ریکا کو پاکستان سے آئے ایک خوب رو جوان عیسیٰ سے محبت ہو جاتی ہے۔ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ دونوں کے گھر ایک بیٹے میران کی ولادت ہوتی ہے۔ بڑھتے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لیے عیسیٰ نے ریکا کو پاکستان بھیج دیا۔ ریکا نے اپنے گھر کے مسائل کو حل کرنے کے لیے پاکستان چلا گیا۔

قیل کر وادیتا ہے۔ خوش قسمتی سے ریکا اور میران فوج جاتے ہیں۔ لیکن ریکا عیسیٰ کی موت کا یقین ہی نہیں کرتی۔ وہ ہر دم یہی کہتی ہے کہ میران زندہ ہے۔ اور وہ واپس ضرور آئے گا۔ عیسیٰ کی جدائی کے غم میں ریکا نشہ کر کے اپنی زندگی تباہ کر رہی ہے۔ میران اپنی ماں کی گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے پریشان ہے۔

یہ تھی قسمت

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com



گہری دھند نے سارے شہر کو اپنے لمبا
تلی چھپا رکھا تھا۔ دھوپ جو پچھلے کانی دنوں سے گھر
نکھر کر جون پر آ رہی ہے پھر سے کسی غار میں جا
چھپی تھی۔ منظر نظروں تلے ایسے چھپن چھپائی کھیل
رہے تھے جیسے انسانوں کے سامنے آکر برہنہ نہ ہونا
چاہتے ہوں۔ میران نے باہر دیکھتے ہوئے افسردگی
سے آنکھیں موند لیں۔ پھر کھڑکی کے پردے برابر
کیے اور اپنے کمرے میں آکر چھوٹے سے بیک میں
اپنے کپڑے رکھنے لگا۔

آج اس کا فائل میچ تھا۔ اسے جلدی کلب جانا
تھا اور وہ کہاں جانے کی تیاری کر رہا تھا؟ دھند جو باہر
چھائی تھی اچھل کر کمرے میں آئی اور ساری کی
ساری میران کی آنکھوں میں بھر گئی۔ بیٹائی رکھتے
ہوئے بھی وہ جیسے اندھا ہو گیا۔

”تمہیں اپنی والدہ کا ایسے خیال رکھنا ہے جیسے
لوگ خزانے کا رکھتے ہیں۔ ہر وقت چوکنے ہو کر۔“
ڈاکٹر الیگزینڈر نے میران سے کہا تھا۔ میران
تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

عینی جو کل رات ربیکا کے لیے آکس کریم لینے
گیا تھا تو وہ رات میں واپس نہیں لوٹا تھا۔ میران
ذہنی طور پر ربیکا کے ہنگامے کے لیے تیار تھا۔ ہر بار
ایسا ہی تو ہوتا تھا۔ وہ روٹی تھی، چینی تھی، گہری
چیزیں توڑتی تھی، خود کو نوچتی تھی۔ ربیکا خود کے ساتھ
بہت عرصے سے جو ڈھونگ کھیل رہی تھی تو اس
ڈھونگ پر دیوانوں کی طرح تالیاں بجانے والی بھی
وہ خود ہی تھی۔ وہ آج کی وہ اداکارہ تھی جو کردار کو
اپنے اوپر اس طرح حاوی کر لیتی ہے کہ اس کردار کو
اسے ساتھ گھر بھی لے کر چلی جاتی ہے اور اس کردار
کی نفسی بیک ایج کرنے کے بجائے نگین بازاروں
میں کرنی پھرتی ہے۔

اپنے خود کے پیدا کردہ عینی کے وجود پر وہ اتنی
شدت سے ایمان لے آئی تھی کہ اسے اس کے اصل
میں نہ ہونے کی سوچ بھی نہ گزرتی تھی۔ ایک میز پر دو
جانوں کا کھانا لگا نا، رات میں تکیوں کو عینی سمجھ کر ان

سے لپٹ کر سونا، عینی کے لیے کپڑے خریدنا، انہیں
اسٹری کرنا، یہ وہ سچے لیے تھا جس کے پردے کرنے
میں نہیں آ رہے تھے اور مسلسل اداکاری نے اسے
خوشی کے بجائے اذیت دی تھی۔

میران نے صبح اپنے اور ربیکا کے لیے ناشتا
بنایا، پھر سوئی ہوئی ربیکا کو اٹھانے اس کے کمرے
میں چلا گیا۔ آگے جو منظر تھا اس کی اسے ہرگز توقع
نہیں تھی۔ نہ تو کمرے کی چیزیں گڑبگڑ کی حالت
میں تھیں، رور ہی تھی اور ہی خود کو نوچ رہی
تھی۔

بیڈ سے نیچے گری ہوئی ربیکا آدھی ترچھی سی
فرش پر پڑی تھی اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی
تھی۔

میران کے پیروں تلے سارا ”سن شائن“ نکل
گیا اور بنا سن شائن کے اس نے خود کو رات کے
اندھیرے میں گم پایا۔

اس نے فوراً ڈاکٹر الیگزینڈر کو بلایا۔ ناشتا
کر کے وہ جلدی سے کلب کے لیے نکلے والا تھا مگر
پر پڑا پڑا اسی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مارڈی کے فون پر دن
رہے تھے۔ وہ یقیناً اسے میچ کے لیے بلا رہے
تھے۔ اور اب ڈاکٹر الیگزینڈر اسے کہہ رہے تھے کہ
سے ربیکا کی حفاظت ایسے کرنی ہے جیسے لوگ خزانے
کی کرتے ہیں۔ ہر وقت چوکنے رہ کر۔ اور ہر
وقت پہرہ داری کرتے ہوئے۔

”مجھے بتائیے ڈاکٹر الیگزینڈر میں کیا کروں؟“
”ربیکا پہلے بھی کافی دفعہ میرے پاس علاج
کے لیے آچکی ہے۔ اب کافی عرصے سے نہیں آ رہی
تھی۔ مجھے لگا کہ یہ ٹھیک ہو چکی ہے لیکن میں غلط تھا۔
یہ تو مزید بیمار ہو چکی ہے۔“ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا۔
میران کون کر عجیب لگا تھا۔ ربیکا ڈاکٹر الیگزینڈر کے
پاس علاج کروانے جاتی رہی تھی؟ کیوں؟ کیا وہ خود
کو بیمار سمجھتی تھی۔ عینی کے نام کے تاریک ڈھونگ
کے پیچھے کہیں سچ کی طرح کاری بھی پوشیدہ تھی یا ڈاکٹر
کے پاس جا کر علاج کروانا بھی کسی ذہنی اختراع ہے

ہوئے اسکرپٹ کا حصہ تھا جس پر ربیکا بڑی اچھی
اداکاری کر رہی تھی۔

لیکن پھر اب کیا ہوا تھا؟ تھیکڑی روشنی سے نکل
کر باہر کی دنیا کا سامنا کرنے اسے ہرنگ پڑا تھا جو وہ
بیڈ سے بے ہوش ہو کر گر گئی تھی یا وہ آج سے بیک آج
چلی گئی تھی۔ تاریکی سے مزید تاریکی میں.....

”خیر اس مسئلے کو چھوڑ کر ہمیں وقت بے وقت
رہنا چاہیے۔ جو مہارے مرحوم والد کے منہ سے ہے۔
ہمیں جلد از جلد اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔“

ڈاکٹر الیگزینڈر کے منہ سے عینی کے لیے
”مرحوم“ کا لفظ سن کر میران کو دل ڈکھ ہوا تھا۔ وہ
اگرچہ ربیکا کی طرح یہ تو نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے والد
زندہ ہیں لیکن اندر ہی اندر اسے بھی ایک آس سی
تھی کہ ایک دن اس کے والد واقعی میں آجائیں
گے۔ ربیکا کی آس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اس کے لیے وہ
بھی منتظر تھا یا شاید ربیکا کا ٹھوڑا سا اثر اس نے بھی
لے لیا تھا۔

”تم انہیں کسی صحت افزا مقام پر لے
جائو۔ جہاں ساتھ ساتھ ان کا علاج بھی ہو۔۔۔۔۔
مجھے کسی سنی ٹوریم وغیرہ۔۔۔۔۔ ربیکا کو جسمانی ہی
نہیں ذہنی علاج کی بھی سخت ضرورت ہے۔ انہوں
نے مہارے والد کے غم کو سینے سے نہیں لگایا۔ روح کا
حصہ بنا لیا ہے۔ بہتر ہے کہ جلد کچھ بہتر کیا جائے۔
میں ایک سنی ٹوریم کے بارے میں جانتا ہوں۔
وہاں میرا ایک دوست تعینات ہے۔ اگر تم وہاں ربیکا
کو لے جاؤ گے تو یہ ربیکا کے لیے بہتر ہوگا اور
تمہارے لیے بھی۔۔۔۔۔ میرے دوست کی وجہ سے
ڈاکٹر الیگزینڈر میں بھی کافی چھوٹ مل جائے گی۔“
ڈاکٹر الیگزینڈر ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ شاید
قیافہ شناس بھی تھے۔ انہوں نے میران کے چہرے
سے اس کی ساری معاشی حالت کا حساب کتاب لگا
لیا تھا۔

آنے والی بہار سے جھومتے صنوبر کے دیو
قامت درخت نظروں کے سامنے سے اتنی تیزی

سے گزر رہے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ ایک دوسرے
کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ ہوائیں جھوم جھوم کر
پھولوں کی خوشبوؤں کو پھیلا رہی تھیں اور پرندے
چمک چمک کر اپنے گھونسلے بنا رہے تھے۔ میران کے
لے اتنی خوش کن باتوں میں سے کسی ایک میں بھی
خوشی نہیں تھی۔

یہ ڈاکٹر الیگزینڈر کی ہی ہدایت تھی کو وہ ربیکا کو
سنی ٹوریم لے کر جا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے
مطابق ہی ایسا اس کی بے ہوشی میں ہوا تھا۔ کیونکہ وہ
ہوش مندی میں اس جگہ کو نہیں چھوڑ سکتی تھی جہاں اس
کے ساتھ ہر وقت عینی موجود ہوتا تھا۔ ایک ایسی جگہ
پر جانے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی جہاں کا عینی کو
نہ پتا ہو اور وہ خود بھی وہاں اپنا تخیلاتی عینی پیدا
کرنے سے قاصر ہو۔

فارم فل کر کے وہ ربیکا کے پاس آیا تھا۔ یہ
الوداعی ملاقات تھی۔ سنی ٹوریم میں کم از کم ربیکا کو چھ
ماہ رہنا تھا اور یہ مدت مکمل صحت مندی تک بڑھ کر
ایک سال سے دو سال تک بھی ہو سکتی تھی۔ پیسوں کا
انتظام بہت مشکل سے ہوا تھا لیکن اسے یہ سب کرنا
تھا۔ ربیکا کے لیے، اپنے لیے.....

”آپ کو پتا ہے نا کہ میں آپ کو یہاں کیوں
لایا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں۔ میرے علاج سے بہتر تھا
کہ تم عینی کو کہیں سے ڈھونڈ لاتے۔۔۔۔۔“ اس کی
آنکھیں بھر گئیں۔ اس کا بیٹا اسے اتنی دُور لے آیا تھا
جس جگہ کا عینی کو علم ہی نہیں تھا۔ ربیکا نے اپنے
اندرا تسی سسکیاں دہالی تھیں کہ وہ مرا پانچ بن گئی تھی۔
”آپ کو کم از کم اب یہاں چھ ماہ رہنا ہے۔“

”عینی گھر میں آیا اور میں وہاں نہ ہوئی تو وہ
مجھے کہاں تلاش کرے گا۔ تم بھی گھر پر نہ ہوئے
تو.....؟“ وہ اپنی کبی جا رہا تھا اور ربیکا اپنی.....
دونوں میں سے کوئی بھی ایک دو بجے کی بات نہیں سن
رہا تھا۔

”مجھے ایک ایک ماہ کے وقفے سے آپ سے

ملنے کی اجازت ہے۔

”تم گھر پر ہی رہنا۔۔۔۔۔ بہت ضروری ہو تو گھر سے باہر نکلتا۔“

”میں ایک ایک ماہ بعد آ کر آپ سے مل لیا کروں گا۔“

”عینی کو ہرگز مت بتانا کہ میں بیمار ہوں۔“
”مجھے اجازت دیں۔ میں چلتا ہوں۔“ اس نے ربیکا کو گلے لگایا اور باہر نکل گیا تھا۔ اس کے باہر نکلنے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بھی باہر نکل آئے تھے۔

باہر شام کی کنوئیں کا روپ دھار چکی تھی۔ بیک وقت مدد بھی اور۔۔۔۔۔ بیجا تک بھی۔۔۔۔۔

☆☆☆

ایر پورٹ پر حسب معمول رش تھا۔ جن لوگوں کی فلائٹ کا وقت قریب تھا وہ غلٹ میں ڈیپارچر لاؤنچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کچھ مفصل انداز میں اپنے پیاروں سے الوداعی ملاقات کر رہے تھے۔ جانے والے خوش تھے۔ پیچھے رہ جانے والے افسردہ۔ کہیں خوشی تھی تو کہیں غم۔ کہیں اداس چہرے تھے تو کہیں مسکرائیں۔۔۔۔۔ ہر طرف ایک افرا تفری کا عالم تھا۔ غیر میلا لک جانے والوں میں صرف ایک شاید سین ہی ایسی تھی کہ جس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ سین کا دل گھبرانے لگا تھا۔ اپنے اکیلے پن سے۔۔۔۔۔ وہ گھر والوں سے دور جاری تھی اور پہلی بار جاری تھی۔ اور سب سے بڑی بات۔۔۔۔۔ وہ کیا کرنے جاری تھی۔ بالٹی کے ساتھ ساتھ وہ ڈنٹی طور پر بھی تھا۔

بلکے آسمانی سے رنگ کے اسکارف کو اس نے سر پر مزید اچھی طرح لپیٹا، سائیٹیجے تفراری پر قابو پانے کی بے اعتدالی کوشش تھی۔ ہاتھ میں پکڑی سفید موتیوں کی چمک دار شیخ جس کے دانے ایک کے بعد ایک بڑے ہی منظم انداز سے ایک کے اوپر ایک کر کے گر رہے تھے، اس کے وجود کے ساتھ ساتھ کانپ رہی تھی۔ سفید ابلے بے محسن لباس، سیاہ

فرشی جوتوں، کانوں میں ہیرے جیسے بندوں اور گلے سے میک اپ کے ساتھ وہ اس وقت کوئی موی گڑیا لگ رہی تھی۔ مسلم موی گڑیا۔

اس نے ایک دین دار عالمہ کا سا پیر بن اودھ رکھا تھا۔ یہ سب کرنے کو اسے ڈینی نے کہا تھا۔ وہ غلطی کی کوئی منجائش نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس گم کو بہت اچھی طرح کھیل رہا تھا اور کارزل کی نظر میں ”مقام“ کی ”برتری“ چاہتا تھا۔ اس کے بوجھ میں بتایا تھا وہ سب نہ صرف اس کے ذہن میں بلکہ حقیقت میں بھی ایسا ہونے والا تھا کہ کسی کو کانوں کا خبر بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ مصمم نظر آنے والی، دین دار عالمہ کا بہروپ اپنانے یہ لڑکی اصل میں لوہا قرآنی کے طفرے کی آڑ میں ”حشیش“ سمگل کر رہی ہے۔

سین کا دل بری طرح سے گھبرانے لگا تھا۔ وحشت اس سے گھٹ گھٹ کر اپنے گلی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی یا بے خوفی سے یہ سب کر کے اپنی قسمت کوئی بدلہ لے رہی تھی؟ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی اس کیفیت کو کیا نام دے۔۔۔۔۔ جسکے خیال کو وہ سے دور کرنے کے لیے اس نے نظریں گھما دی ہوئے وہاں ڈینی کو تلاش کیا تھا۔ ڈینی اسے وہاں ہی ملا تھا جہاں کا اس نے کہا تھا۔ گرین طرکی اسے لی ایم مشین کے پاس۔۔۔۔۔ سین کی نظریں اس سے ملیں تو وہ جو وہاں بنانے کب سے کھڑا تھا منہ میں پھنسی تھی کہ دائیں بائیں کرتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔

”تمہیں تو میں پہچان ہی نہیں سکا۔۔۔۔۔“ اس نے ایک نظر اس کے سر ابلے کی طرف ڈالے ہوئے کہا تھا۔ سین کچھ نہیں بول سکی اور ڈینی کے سر کی گدی ہو چکی سولا ہیٹ کو دیکھنے لگی۔ الفاظ اس کے منہ میں پریشانی کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔

”سب کام ٹھیک ہے؟“
”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ بمشکل ہی یہ لفظ بھی ادا کر رہی تھی۔

”سب سمجھا دیا ہے میں نے تمہیں۔۔۔۔۔ ان

شکلوں کو یاد رکھنا جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ غلطی سے بھی غلطی مت کر بیٹھنا۔“
”ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔“

”اس ماڈل کی حفاظت خود سے بھی زیادہ کرنا۔۔۔۔۔“ ڈینی نے ہاتھ میں پکڑے ماڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ پھر اس نے ایک سبز رنگ کا ربین اس کے پیچھے کے ساتھ لٹکا دیا۔
”بریک۔۔۔۔۔“ وہ خود ہی ہنستا تھا۔ سین کی غلطی ہوئی تھی۔ ”لاہور ایر پورٹ پر زیادہ دشواری نہیں ہوگی تمہیں لیکن آگے خیال رکھنا۔ بے حد احتیاط کے ساتھ کام کرنا۔“
”تم نے تو کہا تھا کہ یہ کوئی ایسا بھی مشکل کام نہیں ہے۔“ وہ گھبراہٹ سے گھبراہٹ سے بولی۔

”مشکل کام تو سبزی کاٹنا بھی نہیں ہے۔ لیکن نادان لوگ اسی چھری سے اپنی انگلی کاٹ بیٹھے ہیں۔“
”مجھے ایسا ہی کام ہے۔ بے وقوف بنو گی تو بے وقوف ملاؤ گی۔۔۔۔۔“ وہ کسی ہی لگو جیسا تہہ دارا حلیہ ہے۔ ایک براطیمیان اور براعتا عالمہ کا۔۔۔۔۔ جس کا دل ہیرے کی طرح شفاف ہے اور وہ کوئی گناہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتی۔
”وہ ایک ٹک ڈینی کی باتیں ہی رہی تھی۔“
”اب سمجھ گئی ہو گی کہ میں نے تمہیں یہ حلیہ اختیار کرنے کو کیوں کہا ہے۔“
”سین نے اپنے سر ابلے کی طرف دیکھتے ہوئے اختیار کر لیا تھا۔

”کاش مجھے واپسی پر سپر مل جائیں گے؟“ وہ نیچا مار کر تلی کر کے جانا چاہتی تھی۔ اگر ڈینی ہر چیز کی تلی کر رہا تھا تو بہتر تھا کہ وہ بھی کر لیتی۔ ڈینی اس کے سوال پر مسکرایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت سین دانتوں میں پھنسی چسپ کیا کیا چل سکتا ہے۔ اس کے پر باہر آنے کو لپٹی تھی۔ سین نے اپنی ابکانی کو بمشکل روکا تھا۔

”میں مزید بھی جاؤں گا تو تمہیں تمہارے پیسے مل

جائیں گے لڑکی۔۔۔۔۔ یہ کام ایسا شفاف ہے۔“ زبان دینے کی اہمیت کیا ہوتی ہے وہ میں نے اسی کاروبار سے سکھی ہے۔ تمہیں بھی میں ”زبان“ دے چکا ہوں۔ بالکل فکر مت کرو۔ لوگوں نے تو اس کام کو ایسے ہی بدنام کر رکھا ہے۔ بھلا کوئی چیز ایک ملک سے دوسرے ملک لے کر جانا ایسا کون سا گناہ ہے۔ یسوع پوچھے ان قانون بنانے والے کم عقلوں سے۔۔۔۔۔ سین ان کم عقلوں پر کچھ سننے موڈ میں نہیں تھی۔

”لیکن پیسے اسی شرط پر ملیں گے جو تم نے مجھ سے طے کی ہے۔ تمہیں کم از کم دس بار ہمارے کہنے پر وہاں وہاں جانا ہوگا۔ جہاں جہاں ہم کہیں گے۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گی۔ چاہو تو کام کرو۔۔۔۔۔ چاہو تو نہ کرو۔۔۔۔۔ اور تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔“
ڈینی نے آنکھ ماری۔ ”لوگ ہمیں چھوڑ کر نہیں جاتے۔ بلکہ کچھ لڑکے لڑکیاں تو اپنی شناخت بدلنے کے لیے پلاسٹک سرجری تک کروا لیتے ہیں۔“ وہ رکا، سین جلدی سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ پھر سے بول اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا پوچھنے والی ہے۔

”لیکن اس ایک چکر کے جتنے پیسے طے ہیں اس کا چوتھا حصہ تمہیں مل جائے گا اور تم جانتی ہو کہ وہ چوتھا حصہ بھی کس قدر زیادہ ہے۔ تمہارے سارے غم دور کر دے گا۔“ ڈینی نے ”سارے“ کو کھینچتے ہوئے کہا تو سین کانپ کر رہ گئی۔ ڈینی کیا کیا جانتا تھا؟

”اب جاؤ۔۔۔۔۔“ رواں دواںی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ڈیپارچر لاؤنچ میں لگی دیو بھل گھڑی اور پھر فلائٹس کے شیڈول کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ڈینی کے حکم پر سین کی ٹرانس کی سی کیفیت میں آگے بڑھی تھی۔

”اور سنو۔۔۔۔۔“ اس کی پیکار پر سین پھر سے رکی۔ جیسے وہ یہ ہی تو چاہتی تھی کہ کوئی اسے روک لے، آگے بڑھنے سے۔۔۔۔۔ اور بلا لے۔ واپس پیچھے کے راستوں پر۔۔۔۔۔

”تمہیں بیلا ڈونا کا نام دیا گیا ہے۔

وہاں سب تمہیں اسی نام سے پکار رہے گے۔“

”اس نے نام کی کیا ضرورت تھی؟“

”بس کا رزل کے کام میں سب..... یاد رکھنا..... بیلا ڈونا“ ڈینی نے پھر سے نام کے بھوں پر زور دے کر کہا۔

”لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟“ جاتے جاتے وہ ایسے ہی پوچھ بیٹھی۔ ڈینی کے ہونٹوں پر بے اختیاری مسکراہٹ چلی گئی۔

”زیر ہلا بھول.....“

ڈینی کے منہ سے مطلب جان کر سین کے چہرے کے رنگ اڑ گئے تھے۔

☆☆☆

ریکا کو سنی ٹوریم بھیجنے کے لیے میران کو بہت سی قربانیاں دینی پڑی تھیں۔ اس نے والی بال کو خیر باد کہہ دیا تھا اور ایک ساتھ دو دو جاہز کرنے لگا تھا۔ دن کے وقت وہ ایک فیکٹنگ فیکٹری میں کام کرتا تھا اور رات میں ایک کلب میں بار ٹینڈر کی جاب، جہاں اسے رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ وہاں سے گھر آکر وہ سو جاتا تھا۔ پھر صبح جلدی اٹھ کر خود ناشتا بنا تا تھا۔ وہ والا ناشتا جو ریڈی میڈ ہوتا تھا اور جسے جلدی میں رہنے والے لوگوں کے لیے ہی فیکٹریز میں بنا کر بیچا جاتا تھا۔ یہ روکھا پیکا ناشتا اس وقت اور بد مزہ ہو جاتا تھا جب اسے اکیلے بیٹھ کر کھانا پڑتا تھا۔

یہ سب بہت عجیب تھا۔ تھکا دینے والا..... اور اس سے بھی زیادہ زلا دینے والا.....

وہ لاؤنج میں پڑی اس راک چیئر کو اکثر ہی دیکھتا رہتا تھا جس پر ریکا شام میں بیٹھ کر اس کے باپ کو تفصیل سے یاد کیا کرتی تھی۔

”تمہیں پتا ہے میران..... میری گرینی ہوا کرتی تھی۔ کیہ تھریں..... وہ بہت اچھی خاتون تھیں۔ وہ اکثر دکھایا کرتی تھیں کہ حضرت عیسیٰ کی آمد ان کی زندگی میں ہو جائے، وہ عیسیٰ کا دیدار کریں، ان سے باتیں کریں۔ مجھے سلاتے ہوئے بچتے ہوئے ان

کے لبوں پر ہمیشہ یہی دعا ہوا کرتی تھی۔ پتا نہیں ان کی یہ دعا کیسے میری بھی آرزو بن گئی۔ تم تو جانتے ہو نا کہ بچپن کے خواب، دن اور باتیں انسان کے شعور میں کیسے چٹانوں کی طرح سیرا کر لیتی ہیں۔

پھر جب میں پہلی بار عیسیٰ سے ٹکرائی اور میں نے عیسیٰ کو دیکھا تو مجھے ایسے لگا کہ گرینی کی ساری دعائیں وہ میری آرزو بن گئیں۔ وہ اتنا سادہ، اتنا جب، اتنا روشن تھا کہ اس بات سے انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی کہ اس لوگ کی ہستی میں وہ کوئی فرشتہ بن کر نہیں اتر رہا ہے۔“

ریکا اسے بتاتی تھی کیونکہ اس کے پاس میران کے علاوہ سننے والا اور کوئی نہیں تھا۔ سوسائٹی میں ریکا کی کوئی سہیلی نہیں تھی۔ اس کے سوتیلے بہن بھائی بھی عرصہ ہوا اسے نفسیاتی مریضہ کا خطاب دے کر چھوڑ چکے تھے۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ ایسے میں صرف میران ہی بچتا تھا اور میران نے یہ سب اپنی بار آورائی جزئیات کے ساتھ سنا تھا کہ اب سب اس کے سامنے کسی رتی رٹائی فلم کی طرح چلتا تھا۔

”کوئی ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ وہ پاکستان کی کوئی شہزادہ نہیں ہے۔ وہ باہر گاڑوں میں صفائی کرتا ہوتا تھا تو بڑوں کی عموٹوں کو بھی تب ہی باہر کام پڑتے تھے۔ آتش دان کی لکڑیاں کاٹنے وقت تو مجھے

باقاعدہ اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ اسے عادت نہیں تھی نا کام کرتے ہوئے شرت مینے کی..... میری پڑوسنوں نے تو وہ دن بھی یاد کر رکھے تھے جب وہ آتش دان کے لیے لکڑیاں چھوٹی کرنا تھا۔ میں باہر گی تاروں پر چادریں ہی تاتی رہتی تھی کہ میرے علاوہ کوئی عیسیٰ کو اس حالت میں نہ دیکھے۔“

کرتے ہوئے ہتے ہوئے بتاتی تھی اور سب بتاتے پتاتے ایک دم سے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی۔

میران کے لیے سب اعصاب شکن تھا۔ لیکن اب ریکا اس گھر میں نہیں تھی۔ اسے اس کے باپ کے بارے میں بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی غالی

گھر میں جیسے ربیکا کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ وہ ٹی وی کی آواز اوجھی کر دیتا تھا۔ پھر بھی اسے لگتا راک چیئر پر کوئی بیٹھا رو رہا ہے۔ رو نہیں رہا تو اس طرح ہنس رہا ہے کہ سننے والے کا رونا نکل رہا ہے۔ ربیکا کی غیر موجودگی کے یہ دن اس کے ساتھ سے زیادہ اذیت ناک تھے۔

ایک ماہ کے بعد وہ پہلی بار ربیکا سے ملنے گیا تھا۔ اس دوران اس کا جینا بھی علانی ہو چکا تھا اس کا کوئی بھی واضح فرق اسے محسوس نہیں ہوا تھا۔ ہسپتال والوں کی طرف سے شکایت ملی تھی کہ ربیکا علاج کرانے میں تعاون نہیں کر رہی ہے۔ وہ ربیکا کے پاس گیا تھا۔ اس نے ربیکا کو بھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ علاج کے سلسلے میں ڈاکٹر ز کا ساتھ دے۔ ان کی باتیں ماننے والے ان کے ساتھ تعاون کرے۔ کیونکہ اسے ہسپتال کے اخراجات چکانے میں بہت زیادہ محنت کرنی پڑ رہی تھی۔

”تم بہت قرض چڑھ رہا ہے مہی.....“

”تم فکر نہ کرو..... عیسیٰ کی جانیداد بک جانے دو، ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اس کے چچا

گھر سے ملے گی مہی۔ ربیکا ابھی بھی وہاں ہی تھی۔

”میں پاکستان گیا تھا مہی.....“ بالآخر ایک دن اس نے ربیکا کو بتا دیا تھا۔ جو وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

”میں نے وہاں پایا کو تلاش کیا۔“

”پھر.....“ ایک ذرا سا لفظ اس نے کس قدر سیر قزاقی اور یونانی سے کہا تھا میران جانتا تھا۔ یہ عورت اگر اس کی ماں نہ تھی ہوتی تو اس کے لیے اس کے پاس ترس ہی ترس تھا۔ اس سے تو بہت اچھا تھا کہ اس کا باپ اس سے اس قدر محبت کرنے کے بجائے بے وفائی کر جاتا، اسے دھوکا دے جاتا۔ اس طرح اسے قرار تو آ جاتا۔

”ان میں سے اب کوئی بھی نہیں بچا مہی..... سب کو خدا نے ان کے کیے کی سزا دے دی ہے۔“

”عیسیٰ جیسے فرشتے پر گولی چلائی تھی انہوں نے..... ایسا تو ہوتا ہی تھا ان کے ساتھ.....“ ہمہ تن گوش ربیکا بڑبڑاتی تھی۔ میران اسے اگلے رد عمل کا انتظار کرنے لگا تھا۔ کیا یہ بہتری کی طرف پہلا قدم تھا۔

”اور اگر عیسیٰ کو تب کچھ ہو جاتا تو تم دیکھتے کہ وہ لوگ دنیا میں ہی کیسے جہنم میں جلتے۔“

میران نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ تو یعنی اس کی کسی بھی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی آگے ہونے والا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ کوئی کسی کو اتنی ایمان داری سے کیسے چاہ سکتا ہے۔ کوئی محبت میں ایسا با وفا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کی محبت کی جدائی کا یقین نہ کرے۔

وہ وہاں کے ڈاکٹر ز سے ملا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کا مزید بہتر طریقے سے علاج کیا جائے۔ پیسوں کی پروا نہ کرتے ہوئے۔

علاج چھ ماہ سے ایک سال تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی آخری ملاقات ربیکا سے جنوری کے مہینے میں ہوئی تھی۔ تب اس کی حالت کافی بہتر ہو چکی تھی۔ اس کا نفسیاتی علاج بھی ہوا تھا۔ وہ واحد ملاقات تھی جب اس نے میران سے عیسیٰ کی بات نہیں کی تھی اور بس یہی کہے جا رہی تھی کہ وہ اسے واپس نیویارک لے جائے۔

”سب آپ کے علاج کے لیے ہی ہو رہا ہے مہی..... بس کچھ عرصہ اور یہاں رہ لیں۔“

”مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ میں یہاں سے اکتا چکی ہوں میران.....“ سنی ٹوریم میں ہی ربیکا کو اندازہ ہو چکا تھا کہ میران نے بورڈنگ میں اپنی تعلیم کس طرح مکمل کی ہوگی۔ جب وہ اسے ملنے ہی نہیں جاتی تھی۔ بھول ہی گئی تھی کہ اس کا کوئی بچہ بھی ہے۔ جسے توجہ کی ضرورت ہے۔ میران نے اتنے سال کس خاموشی سے گزار دیے تھے۔ وہ اپنے باپ پر گیا تھا۔ جس نے بڑے بڑے دکھ اپنی چپ کے چادر تلے لپیٹ لیے تھے۔

”یہاں کا ماحول کافی دوستانہ ہے۔ بس تھوڑے دن اور..... میری خاطر.....“

”میرا نکلے لیے جاؤ یہاں سے..... ہمارے بچے کے لیے.....“ پچیس سال پہلے کی ایک التجاریکا کے کانوں میں گونجی تھی۔ ربیکا خاموش ہو گئی۔ یہ آدمی کی طرف اشارہ تھا۔

رہے ہیں۔
 ”اٹھو..... اب سوچنے کا وقت گزر گیا ہے۔“
 در کرنے پھر سے کہا تھا۔

آنے کو کہا تھا۔ اس نے کمال مہارت سے اپنی لائن پریل کی تھی اور چیننگ کے لیے اسی لیڈی کے پاس گئی تھی۔

سانس سے اس کا گزرا نہ نہیں ہوا تھا تو وہ تیزی سے مزید سانس لیتے ہوئے کئی دیر تک وہاں ہی کھڑی رہی تھی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ وہ تازہ دم ہو گئی تھی۔ جیسے کالج سے آنے کے بعد اماں کے ہاتھوں کی دم والی چائے پی لینے کے بعد ہو جایا کرتی تھی۔ نیویارک کی ہوا تو ویسے بھی بہت تازہ ہوتی ہے جو لامبور میں کم ہی میسر آتی ہے اور گن پت روڈ والے تیز ٹریفک کے علاقوں میں تو بالکل ہی خال خال..... اسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی پہاڑی بھرنے کے ساتھ ساتھ بنے گی ہو۔

طرف بڑھا تھا۔ جس نے اس کا سامان پکڑ لیا تھا اور اسے دوسری منزل پر موجود ایک کمرے کے اندر پہنچا دیا گیا۔ اسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

سمجھادی تھی لیکن وہ شاید ٹھیک سے سمجھا نہیں۔۔۔۔۔“
 ”کارزل کون ہے؟“ وہ ایسے ہی پوچھ بیٹھی۔
 ”تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔
 ان کاموں میں اتنا ہی شامل ہو جتنی تمہیں ضرورت
 ہے۔“ ڈینی کا لہجہ اگرچہ خراب تھا لیکن وہ ٹھیک کہہ رہا
 تھا۔ سین کو کام اور پیسے کے علاوہ کسی بھی اور بات
 سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے تھا۔

کچی تھی تو ان لمحوں کی ساری گھبراہٹ ایک دم سے اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس کا دل اس بری طرح دھڑکنے لگا تھا کہ اسے لگا یہ سینے سے باہر آ جائے گا اور اس پر ہنسنا شروع کر دے گا۔

چنیوٹ کے پرانے بڈریٹی لیٹی چلاتی تھی۔
 ”اماں بند کر دو چلی“ وہ اور طاقت سے
 چلائی۔ لیکن یہ گن پت روڈ نہیں تھا۔ یہ تو نونا یارک
 تھا۔ چھوٹے گھر کے برعکس کمر اتنا بڑا تھا کہ انسان
 خود کو گم کر لے۔ بڈریٹی کس قدر شاندار تھا۔ پھر اسے
 نیند کیوں نہیں آرہی تھی؟ صرف ایک جگہ چلنے کی آواز
 اسے تنگ کر رہی تھی؟

اس لیے وہ کسی بیکری وغیرہ سے اپنے لیے کچھ ایسا خرید لیتا تھا جسے چلتے ہی کھایا جاسکے۔ آج بھی وہ سستے سے پیٹیز کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چند روز بعد کلب کی "ناؤز" ایک ایکٹیوٹی بھی تھی۔ جس کے لیے کافی زیادہ انرجی چاہیے تھی۔ ان سب کو محض اس کی مشق ہی تھا کہ دیتی تھی۔ نجانے ایکٹیوٹی والے دن کیا حال ہونے والا تھا۔ لیکن میران کو خوشی تھی کہ اس ایکٹیوٹی کے ان سب کو اضافی پیسے بھی ملنے والے تھے جو ایک معقول رقم تھی۔

سیل فون کی بیل بجی تو ایک ہاتھ سے پیٹیز کھاتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے کال پک کر کے فون کان کے ساتھ لگا لیا تھا۔

"میران سیلی؟" استفہامیہ پوچھا گیا تھا۔

"جی....."

"آپ کی والدہ ربیکا سیلی اب مکمل صحت مند ہیں۔ آپ انہیں واپس گھر لے کر جاسکتے ہیں۔"

"کیا؟" میران کو جیسے اس خبر کی صداقت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایک سال کے بعد یہ واحد خوش خبری تھی جس پر وہ دل سے خوش ہو سکتا تھا۔

اگلے ہی دن سے اس نے میری کے ساتھ مل کر ربیکا کا کمرہ تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری ان کی پڑوسی تھی۔ میران کے ساتھ کی حد تک فریگ تھی اور اپنے کان میں فن قیمر کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میران نے کچھ جوتی ہوئی رقم سے گھر کو بھی سناٹا شروع کیا تھا۔ میری لم بجٹ میں اعلا کارکردگی کا ثبوت دینا چاہتی تھی۔ دونوں نے سارے گھر کے وال پیپر تبدیل کیے تھے۔ پرانے فرنیچر کو پالش کیا تھا۔ کچھ چیزیں انہوں نے گھر پر ہی تیار کر لی تھیں۔ جن میں میری ماہر تھی۔ پرانی بوتلوں سے سنٹر بنیل بنانا، میران کی پرانی لی شرٹس سے کٹن، کم خرچ والے فوٹو فریم، گلدان، اور ڈیکوریشن ہیں وغیرہ۔ میری واقعی ایک اچھی آرکیٹیکچر بننے والی تھی۔ اس نے کم بجٹ میں بہت عمدہ کام کیا تھا۔ گھر نے

ایک نئی شکل اپنائی تھی۔

میران بہت خوش تھا ان دنوں..... ربیکا آ رہی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھیک ہو کر آ رہی تھی۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔

کلب میں بھی اس کے خوش کن رویے کو سب نے نوٹ کیا تھا۔

"ایسا تو محبت میں ہوتا ہے ڈیر..... کیا تمہیں محبت ہو چکی ہے۔"

"نہیں..... لیکن مجھے محبت ملنے والی ہے۔ اپنی ماں کی....." اس نے جذباتی ہو کر کہا تھا۔ اپنی والدہ کی زندگی کی تبدیلیوں کو وہ ابھی سے محسوس کرتے رہا تھا۔

فیکٹری اور کلب وہ دونوں جگہوں پر بہت دل لگی سے کام کر رہا تھا۔ کلب میں وہ پورے ایک سال تک بچن میں ہی قید رہا تھا۔ بہت بار اس نے کوشش کی تھی کہ وہ پیٹرز سے بارٹینڈر کا کام سیکھ کر بارٹینڈر بن جائے۔ کیونکہ بارٹینڈر کی خواہ بچن میں کام کرنے والے ورکر کی نسبت زیادہ تھی۔ پیٹرز سے اسے کام کھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن وہ ذہنی طور پر اپنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا کہ وہ اس سال سا کام بھی جلدی سے نہیں سیکھ سکا تھا اور مہینے بھر بعد جب اس نے وہ کام جیسے تیسے کر کے سیکھ لیا تو بھرنے اس کی ایک دن کی کارکردگی کے بعد ہی اسے پھر سے واپس بچن میں بیٹھ دیا تھا۔

"کیا میرے کام میں کوئی خرابی ہے؟"

"خرابی کام میں نہیں میرے دوست تمہاری اداس صورت میں ہے۔ بار میں آنے والا کوئی بھی اداس صورتیں نہیں دیکھنا چاہتا۔ لوگ خوش ہو کر ڈرنک مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں خوش ہو کر ہی ڈرنک پیش کیا جائے۔ تم کام تو سیکھ ہی چکے ہو۔ اب خوش رہنا بھی سیکھ لو تو بہتر ہے۔" فیجمر نے اسے وہ کام کہا تھا جو وہ اپنی پیدائش سے اب تک سیکھنے کی کوشش رہا تھا اور اس میں ایسا کورا ثابت ہوا تھا کہ ٹھیک سے سیکھ ہی نہیں سکا تھا۔

آج بڑے دنوں کے بعد وہ پھر سے بار پر کھڑا ہوا تھا اور فیجمر سمیت اس کے دوست بھی اسے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ وہ لڑکیوں کو ہنسا رہا تھا، گنگنا رہا تھا، بار کا ڈنٹر کی سطح پر مختلف کرتب کر رہا تھا۔ بوتلوں کو مہارت سے اچھال اچھال کر گلاسوں میں انڈیل رہا تھا۔

فیجمر کو اور کیا چاہیے تھا بھلا.....

فیجمر نے اسے رات جانے سے پہلے کہا تھا۔

خوش مزاج خوش قسمتی کی راہیں کیسے کھولتی ہے ریاس نے جب جانا تھا۔

☆☆☆

بلی کے بچوں جیسے صبح بے پاؤں دھرتی پر اپنے قدم جما رہی تھی۔ بنا آواز پیدا کیے..... مکمل خاموشی سے..... اس رازداری میں شرارت بھی ہو سکتی تھی اور چال بازی بھی..... روشن کر نہیں دوسرے کی طرح کی تارکے کی کوچوں میں پھیل کر انہیں روشن کر رہی تھی۔ اس سب میں ایک راگ بھی اپنے سر اٹھا رہا تھا اور صبح کی پہلی ٹھنڈی میں، پھوٹی کڑوں میں، بارکے کو خاموشی میں..... ریاس نے وہ راگ اپنی تمام کڑیوں کی خاموشیوں کے ساتھ دلکش لگ رہا تھا۔

کرکڑی کی آواز آئی تھی۔ پروئے کھسکا کر اس نے باہر ہمارا نکلا تھا۔ بے چواری راگ کی آواز لمحہ بہ لمحہ دور سے نزدیک آ رہی تھی اور جب وہ بالکل سین میں کھڑکی کے سامنے آ گیا تو سین نے دیکھا کہ وہ کوئی نوعمر لڑکا تھا جو اپنی مٹی میں مسرت ماؤتھ آرگن کو منہ سے نکال رہا تھا۔ لڑکے کی شخصیت سے عیاں تھی۔ گندے منہ لے چلیے، پرانے فکری دیکھتے ہوئے سین نے اس پر رشک کیا تھا۔

"کیا دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو ان سب چیزوں سے استغناء کرتے ہیں۔" اس

نے اداسی سے سوچا تھا۔ ایک طرح سے اپنا اور اس لڑکے کا موازنہ کیا تھا۔ پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی تھی کہ اس نے کھڑکی میں پڑے گلدان میں بجے پھولوں میں سے ایک پھول نکال کر نیچے سے گزرتے اس لڑکے کی طرف اچھال دیا تھا۔ لیکن وہ لڑکا اپنے آپ پر کچھ زیادہ ہی نازاں تھا یا شاید حد سے زیادہ عاجز کہ اسے اپنے قریب پھول گرنے کا احساس تک نہیں ہوا تھا اور ماؤتھ آرگن بجانا وہ سین کے چھینکے گئے پھول پر پاؤں رکھتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

سین اس لڑکے کے اس رویے پر مسکراتی ہوئی غسل خانے میں چلی گئی۔

دوپہر کے قریب اسے ڈینی کی کال آئی تھی۔

"نئے ماڈل کو سینٹ جین چرچ دے آؤ....."

ایر پورٹ سے نکل آئی ہو۔ اس کا مطلب نہیں کہ تم اپنا کام کر چکی ہے۔ سیورٹی کیمرہ فوٹج کو پھر سے دیکھا جاتا ہے۔ جنہیں دوسری بار ماہرین دیکھتے ہیں اور وہ ذرا سی بھٹک پڑنے پر تمہاری تلاش کرنا شروع کر دیں گے۔ ان کے لیے تمہارے روم تک پہنچنا کچھ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ اس لیے ماڈل کو جلد از جلد چرچ میں جا کر دے آؤ....."

ڈینی نے اسے تمام ہدایات دی تھیں۔ ڈینی واقعی اس کام کو بہت احتیاط سے کر رہا تھا۔ ایر پورٹ انتظامیہ کیا، خود سین کو بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کیوں۔

نیا ماڈل تیار تھا۔ ریپشن پر کال کر کے اس نے سینٹ جین چرچ کا پتا منگو لیا تھا۔ اس بار اسے ڈرائیور نہیں دیا گیا تھا لیکن ایک اچھی رقم دے دی گئی تھی۔ باقی سب اسے خود ہی کرنا تھا۔ نہا کر، نئے کپڑے پہن کر اور ہلکا سا تیار ہو کر وہ سینٹ جین چرچ چلی گئی تھی۔ اسی چرچ کا نام اس نے ایر پورٹ پر بھی لیا تھا۔

"میں ایک ایسی تنظیم کی رکن ہوں۔ جس کے ذریعے ہم پوری دنیا میں امن کا پیغام پھیلاتے ہیں۔"

ہم مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ان باتوں کی طرف جمع کرتے ہیں جو مشترک ہوتی ہیں۔ قرآنی حروف کا یہ طغرا اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یہ مذہب اسلام کے ماننے والوں کا اپنے عیسائی بہن بھائیوں کے لیے تحفہ ہے۔“

اس نے اپر پورٹ پر بولے جانے والے بیان کو یہاں بھی رٹے رٹائے طوطی کی طرح بولا تھا۔ چرچ کی انتظامیہ اس کی گفتگوں کو متاثر ہوتی تھی اور لوح قرآنی کا نقیصہ دیکھ کر مبہوت..... سین کو وہاں بہت عزت دی گئی تھی۔ اس کے لیے کھانے کا بہ تکلف انتظام کیا گیا تھا اور اس کی تنظیم کے اس ”ٹیک“ کام کو سراہا گیا تھا۔

چرچ سے واپسی پر اس نے ٹیلیسی نہیں لی تھی۔ وہ پیدل ہی چلے گئے تھے۔ اس کا ارادہ نیو یارک شہر کو دیکھنے کا تھا یا شاید اس کے کانوں میں جو رات کی چٹکی کی آواز قید تھی وہ اسے شہر کے شور میں تحلیل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہاں اتنی رونق تھی کہ وہ اپنی تجمانی کو اس میں ضم کر سکتی تھی۔ دن اتنا روشن تھا کہ وہ اپنی ساری تاریک راتیں اس کی جھولی میں ڈال سکتی تھی اور اتنا روشن تھا کہ اس کی سب خاموشیاں نکل سکتی تھیں بلکہ ختم بھی کر سکتا تھا۔

گیندے کے پھول سا زنی، پیچیدہ اور صمد برگ سادہ پوری آب و تاب کے ساتھ ٹھہلا ہوا تھا۔ اسی دن کی مسکراتی خوشبو میں وہ ہر چیز کو حیران ہوتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ کتنا اگلا تھا نیو یارک، لاہور کی نسبت..... وہاں تھا ہی گندے سبچے، گندے مکانات، گندے گلیاں، یہاں..... اس سب کا الٹ، پتھری ہوئی ہوا، خوب صورت مکانات، روشن سیاہ سڑکیں، نقیس پیارے لوگ، اونچی اونچی عمارتیں..... ہر چیز جیسے واشنگٹن مشین میں ڈال کر دھو کر چائی گئی تھی۔

کچھ فاصلے پر اس نے لوگوں کا عجیب و غریب رش سادہ دیکھا تو اپنا بے مقصد راستہ بدل کر وہ بھی اسی

طرف ہو گئی۔

وہاں بہت سے لوگ تھے جنہوں نے ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ٹی شرٹ اور ٹیکر۔ جن کے رنگ بھی ایک جیسے تھے۔ لال اور پیلے۔ اور ان پر کسی کمپنی کے لوگوں کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ سڑ سے سو کے لگ بھگ وہ سارے نوجوان، صحت مند لڑکے تھے۔ جو مسکرا رہے تھے۔ جوش جن کے چہروں سے عیاں تھا اور ان کی دیکھنے سے یہ لگتا تھا جی دو گنا ہجوم وہاں اکٹھا ہو چکا تھا۔ سین کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ لوگ کسی چیز کی تشہیر کرنے والے ہیں۔ تشہیر کرنے کا یہ انداز وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

زمین پر پہلے بارہ لڑکوں نے ایک گول دائرہ بنایا تھا۔ قدرے بڑے سا سائز کا..... اور ایک دو تین کے کندھوں پر اپنے بازو پھیلا کر دائرے کو مضبوط کیا تھا۔ ان بارہ لڑکوں کے کندھوں پر گیارہ لڑکے کھڑے کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے بازو کی طرح کیا تھا۔ اپنے بازو ایک دو تین کے کندھوں پر پھیلائے تھے۔ اور اب گیارہ کے کندھوں کے اوپر دس لوگ چڑھ رہے تھے۔ ان

انداز سے ظاہر تھا کہ انہوں نے اس چیز کی بہت بار مشق کی ہے۔ ارد گرد دیکھنے والے لوگ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے اور اچھی جوش دلا رہے تھے کہ وہ جو کر رہے ہیں کریں اور اچھی طرح کریں۔ عورتیں، مردتالیاں، جانا شروع ہو گئے تھے۔ لڑکے، بچے بیٹیاں بچانے لگے تھے۔ لوگ ان جو خود بھی خوب صورتی میں کسی سے کم نہیں تھے۔ ان خوب صورت نوجوان لڑکوں کو دیکھ کر پاگل ہو رہی تھیں جن کی آدھی ٹیکروں اور آدھی آستینوں سے ان کی جوانیاں اور خوب صورتیاں عیاں تھیں۔ وہ ساری ”ہو ہو“ کرتے ہوئے نعرے بازی کر رہی تھیں۔ سین سب دیکھ کر مسکرا اٹھی تھی۔ یہ سب اس کے لیے نیا تھا اور دلکش بھی..... وہ اس سب سے لطف اندوز ہونے سے خود کو روک نہیں سکتی تھی۔

اب دس کے اوپر نو لوگ چڑھ رہے تھے۔ ٹاور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر نو کے اوپر آٹھ..... اوپر ہوتے ہوتے ٹاور سکڑتا جا رہا تھا۔ آٹھ کے اوپر سات لڑکے، پھر چھ، پانچ، چار، تین اور جب سب سے اوپر دو لڑکے کھڑے ہو گئے تو ٹاور کی اونچائی بہت بڑھ گئی۔ سب گردنیں اوپر کر کے انہیں دیکھنے لگے۔ سین بھی بڑے اشتیاق سے سب دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کے دیکھنے سے یہ لگتا تھا جی دو گنا ہجوم وہاں اکٹھا ہو چکا تھا۔ لگا۔ لوگ انہیں سہرا رہے تھے۔ پھر سین نے دیکھا کہ ایک لڑکا جس کے ہاتھ میں کمپنی کے لوگو والے بہت سے غبارے تھے۔ وہ انہیں اپنی کلائی میں باندھے ہوئے اس ٹاور پر چڑھنے لگا تھا۔ شور مزید بلند ہو گیا تھا۔ لڑکا سب کے کندھوں بازوؤں پر ہاتھ رکھتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں میں وہ سب سے اوپر پہنچ کر دو لڑکوں کے اوپر کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک نظر نیچے کے ہجوم پر ڈالی۔

سین اپنی جگہ کھڑی کھڑی پتھری ہو گئی۔ لڑکے نے اپنی کلائی پر سے کمپنی کے لوگو والے غبارے ہوا میں چھوڑ دیے تھے۔ ایک شور بلند ہوا تھا۔ لوگوں کی طرف سے اور کمپنی کے ورکرز کی طرف سے بھی.....

پھر ٹاور ٹوٹنے میں چند لمحوں ہی لگے۔ اطراف میں کھڑی کمپنی کی گاڑیوں نے شرٹ لٹا دیے اور سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

اب ارد گرد کھڑے لوگوں کو کمپنی کی طرف سے مشروب پلایا جا رہا ہے۔ لوگ خوش خوشی ڈسپوز میل گلاس لے رہے ہیں۔ کچھ شوخ لڑکے تو دو دو گلاس اٹھا رہے تھے۔ بھلا مفت کا مشروب کون چھوڑتا ہے۔ چاہے وہ بد ذائقہ ہی کیوں نہ ہو۔

سین کے پاس بھی ایک ورکر آیا۔ اس کے ہاتھ میں مشروب کا گلاس تھا جو وہ سین کو پیش کر رہا تھا۔ لیکن سین ایک دم سے پرے ہو گئی۔ جیسے وہ کسی خیال سے چوکی تھی۔ وہ اس لڑکے کو تلاش کرنے لگی

جس کے ہاتھ میں غبارے تھے اور جو سب سے اوپر تھا۔ رش اس قدر زیادہ تھا کہ وہ لڑکا اسے نظر ہی نہیں آ رہا۔ ٹاور کے لڑکوں نے ٹوٹ کر رش کو اور بڑھا دیا تھا۔ اسے ہر جگہ ایک ہی رنگ کے لباس نظر آ رہے تھے۔ لال اور پیلے..... اور ایک ہی طرز کے کپڑے..... ٹیکر اور شرٹ..... ایسے میں اس لڑکے کو تلاش کرنا اس کے لیے مشکل تر ہو رہا تھا۔

لڑکوں، لڑکیوں، مردوں اور عورتوں کو کندھوں سے دھکیلتی ایک ایک کو غور سے دیکھتی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ کبھی واپس پیچھے ہوتی تھی۔ سب چہرے اسے ایک جیسے لگ رہے تھے۔ ایک عجیب طرح کی پریشانی نے اس کے گرد احاطہ بنا دیا تھا۔

”اگر وہ لڑکا مجھے نیل سکا تو.....“ وہ مامی بے آب کی طرح تڑپنے لگی تھی۔ اور تب ہی اسے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی تھی۔

”میم“ وہ پلٹی تھی۔ اب کی بار وہی لڑکا ایک گلاس اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ سین لمحے بھر میں جامد ہو گئی۔ جس کی اسے تلاش تھی وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ.....

اس کے خدو خال دیکھتے ہوئے وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں چلی گئی۔ ایک بار پھر سے..... اس کے چہرے کا لالابالی پن بھر پور مردانہ وجاہت میں ڈھل رہا تھا۔ آنکھیں پہلے سے بڑی اور اس قدر روشن ہو چکی تھیں کہ سین ان میں اپنا پورا کس دیکھ سکتی تھی۔ اس نے اپنا آخری اشارہ بدل لیا تھا اور وہ اس پر پہلے سے زیادہ چڑھ رہا تھا۔ اور ہونٹ..... گل مہر کے پھولوں کی طرح دھکتے ہوئے اور نمی والے سرخ..... جیسے وہ آج بھی کوئی مشروب پی کر ہونٹ صاف کرنا بھول گیا ہوں۔

وہ جوان ہو چکا تھا۔ اور اس کا بدن تیار تھا کہ اس کی ذات کی تکمیل بہت تھیں اور حیا دار پس منظر میں ہو چکی ہے۔

”میم“..... لڑکے نے پھر پروفیشنل انداز سے مسکراتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ سین نے گلاس

<https://www.urdutube.com/>

تھام لیا تھا۔ لڑکا اسے دیکھتے ہوئے واپسی کے لیے اٹنے قدم لینے لگا تھا۔

”کیا اس نے اسے نہیں پہچانا۔۔۔“ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے سوچا۔

”میران۔۔۔۔۔ مجھے پہچانو۔۔۔۔۔“ اس کے اندر کوئی چلا کر کہہ رہا تھا اور باہر اس کے ہونٹ ایسے سٹے تھے جیسے وہ زندگی بھر ایک بھی لفظ تو نہ بولی ہو۔ میران اٹنے قدم لیتا ہوا دروازہ جارہا تھا۔ پھر دھند میں کم ہو جانے والے منظر کی طرح وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور سین اسے دیکھتے ہوئے بس یہی بات سوچے جارہی تھی۔

”کیا اس نے مجھے نہیں پہچانا۔۔۔؟ کیا وہ مجھے بھول گیا؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہر گز نہیں۔۔۔۔۔ خدا میں اپنے ساتھ یہ ظلم برداشت نہیں کروں گی۔“

واپس گیسٹ ہاؤس پہنچنے تک وہ یہ سب سوچتے ہوئے الجھ الجھ کر خود سے لڑنے لگی تھی۔

☆☆☆

”کیا ہوا۔۔۔؟“ پیڑ نے مسکراتے ہوئے میران کو دیکھ کر ٹھوکا مارا۔

”کیا؟“ کیلے گلاسوں کو خشک کپڑے سے صاف کرتا ہوا میران چونکا۔

”کس کو سوچ کر مسکرا رہے ہو؟“

”کسی کو بھی نہیں۔۔۔۔۔“

”جب کوئی کہتا ہے کسی کو بھی نہیں۔۔۔۔۔ اصل میں تب ہی کوئی ہوتا ہے۔“

سینٹ جین چرچ۔۔۔۔۔ لیکسنٹن الینو سے واپسی پر میران بہت چپ چاپ انداز میں کام کر رہا تھا۔ اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا اور اپنی خوشی کو چھپا رہا تھا۔ یہ دونوں چیزیں مجید بھری تھیں۔ اس کے دوست پیڑ نے یہ بات نوٹ کی تھی۔

”لگتا ہے آج ٹاؤن کی ایکٹیوٹی نے تمہیں کچھ زیادہ ہی مسرت بخشی ہے۔“ پیڑ کے ساتھ جیکسن بھی آ ملا تھا۔ میران جو ہمیشہ گہری اداسی میں کھویا رہتا

تھا۔ اب اچلی مسکراہٹ میں لگن تھا۔ ایسے میں دونوں کی حیرت فطری تھی۔ دونوں اس کی مسکراہٹ کی اصل وجہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

”میران آج کل اس لیے بھی خوش ہے کہ اس کی والدہ پورے چودہ ماہ کے بعد گھر واپس آ رہی ہیں۔“ جینی نے اعلان کرنے کے سے انداز میں سب کو بتایا۔

”یہ تو واقعی کوئی بڑی بات ہے۔“

”مبارک ہو دوست۔۔۔۔۔“

”شکریہ۔۔۔۔۔ مجھے بدھ کے روز انہیں لینے جایا ہے۔“

وہ بدھ کے روز کو دونوں کے حساب سے نہیں گن رہا تھا۔ بلکہ اس دن میں حاصل سینڈز تک کو ایک ایک کر کے گن رہا تھا۔ ربیکا محنت مند ہو کر گھر آنے والی تھی۔ اس سے بڑی خوشی اس کی زندگی میں بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔ ایسے میں ایک اور چیز نے اسے خوش کر دیا تھا۔ سین کا سامنا ہونے نے۔

اسے کہاں اندازہ تھا کہ نیویارک شہر میں اس کا سامنا کبھی اس لڑکی سے بھی ہو سکتا ہے۔ جس سے وہ لاہور کے ایک نجان بازار میں ملا تھا اور اس نے ان کے تین تاج محل توڑ دیے تھے۔ کیا وہ لڑکی ان تاج محل کی قیمت لینے یہاں تک آگئی تھی؟

”جیکسن کیا تم پائن اپیل اور اورنج جوس بنا کر دو گے۔ ایک ایک گلاس۔۔۔۔۔؟“ میران نے کہا۔

اس کی آنکھوں میں جگنو سے روشن تھے۔

”سیڑ ڈے۔۔۔۔۔ نائٹ ہے میرے دوست۔“

تاہم انہوں کی انٹری بند ہے۔ آج کون جوس کو پوچھنے گا۔“

”بس ہے کوئی۔۔۔۔۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”وہ آج ضرور آئے گی۔“ اور یہ بات اس نے جیکسن سے زیادہ خود سے کہی تھی۔

☆☆☆

کچھ لوگوں سے ہماری شناسائی عالم اردواح میں ہی ہو جاتی ہے۔ ہم وہاں ایک دوسرے سے

بات چیت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ پھر جب وہی روحیں دنیا میں ملتی ہیں تو انہیں پہلی ہی ملاقات میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنم جنم سے ساتھ ہیں۔ ان کے محسوسات حقیقی ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت میں پرانی شناسائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

سین بھی اسی کمرانی شناسائی کے زیر اثر تھا۔ وہ اپنے عام اردواح میں میران سے دنیا میں محبت کرنے کا، وفا بھانے کا وعدہ کر آئی تھی۔ اب بھی وہ وعدے کو پورا کرنے کے لیے بے چین تھا۔ شہر وں ختم ہو چکا تھا اور خالی ڈسپوزبل گلاس بنانے کب سے اس کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں وہ جیکسن کے ہاتھوں کا مس ڈھونڈنے کی لالچ حاصل کر رہی تھی۔

وہ مسکراتا چہرہ اسے کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔ تب سٹے کوئی نہیں جب وہ اپنے کالج میں کم مائیگی کے احساس تلاش کیا کرتی تھی۔ تب بھی نہیں جب وہ گھر کی لڑکی کے کمرے کے کراٹ کالج کے بارغ میں بیٹھے لڑکے کے ساتھ ان کی بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں ان کی طبیعت کی آخری خواہش پر اس نے رشید سے نکاح کر کے ”قبول ہے“ کہا۔ تب بھی نہیں۔۔۔۔۔ اب جب کہ وہ اسی کمرے میں تھی۔ اس کے بے حد قریب کی۔ اب وہ اسے کیسے نہ باقاعدگی سے یاد کرتی۔

جیسے ہی اسے روک کر اس سے کوئی بات کر لیتی تھی۔ ”کیا ہاں۔۔۔۔۔ یقیناً۔۔۔۔۔ پھر اس نے ایسا کیا جسے دیا۔ وہ ایک دم سے چپ کیوں ہو گئی تھی۔ وہ ایسی غائب دماغ تو کبھی نہیں رہی تھی۔ اسے میران کو یاد دلانا چاہیے تھا کہ اس نے پاکستان میں اس کے ان کی قیمت ادا کر سکتا ہے؟ اسے اپنا وقت دے

کر۔۔۔۔۔؟ اسے بتانا چاہیے تھا کہ وہ اس سے اپنی پہلی ملاقات کبھی نہیں بھولی۔ اس کا نام اسے ہمیشہ حفظ رہا۔ جس نے اس کے بدبودار دونوں میں دار چینی جیسی نفیس خوشبو پھیلائی رکھی۔ کم از کم وہ یہ تو کہہ ہی سکتی تھی کہ اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا ہے۔ وہ بھی شاید یاد کرنے کی کوشش کرتا۔۔۔۔۔ اور خدا اگر بین پر مہربان ہوتا تو سین ممکن تھا کہ اسے یاد آ جاتا۔۔۔۔۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میرے خدا تجھے اس کی یادداشت کا ساتھ دینا پڑے گا۔ اسے یاد دلانا پڑے گا کہ وہ صرف مجھ سے لاہور کے شاہ عالم بازار میں ہی نہیں نکرایا۔ بلکہ عالم اردواح میں بھی اس نے میری دہلیزوں کے آگے اپنے نام کے تعویذ دبائے ہیں اور میں نے بھی اس لیے نام کی تسبیحات کی ہیں۔“ بے قراری سے کمرے کے چکر لگاتے ہوئے اس نے خدائے دعا کی بھی۔ یہ دعا ساری کی ساری التجا سے پر تھی۔

ہائے۔۔۔۔۔ لیکن اب وہ کیا کرے؟ اسے نیویارک جیسے بڑے شہر میں کہاں کہاں ڈھونڈے؟ کیا بھی ایک غلطی کر دی تھی اس نے۔۔۔۔۔ وہ ساکت کیوں ہو گئی تھی۔ اور اب اس کی غائب دماغی کا نجانے کیا نتیجہ نکلے والا تھا۔

کمرے کے چکر لگاتے لگاتے اس نے گلاس کو خالی ڈسٹ بن میں ڈالا تھا۔ اور تب ہی اس کی نظر کپڑے پر موجود کمپنی کے ٹیگ پر پڑی تھی۔

”ڈیریم کلب۔۔۔۔۔“ سین کی آنکھوں میں روشنی سی بھرنے لگی تھی۔

دار و دروب کھول کر اس نے اپنے ساتھ لائے ہوئے تمام لباسوں میں سے سب سے بہترین لباس کو چنا تھا۔ پھر لائٹ سامیک اپ کیا تھا۔ اماں کے دیے ہوئے سونے کے جھمکے پہنے تھے۔ گوری کلائیوں میں کالے کانچ کی آدھ درجن چوڑیاں چڑھائی تھیں اور سٹ رنچی چنری کا دوپٹا اوڑھا۔ اس کے محلے کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ جب جب وہ یہ سب تردد کرتی ہے، غضب ڈھاتی ہے۔

آج یہ سب کر کے وہ قیامت برپا کرنا چاہتی تھی۔
اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ روشن کرے گا
چمکتا آئینہ آج جیسے دنپاکے سارے بچ بول رہا تھا۔
سین کی احساس کتری نہیں کھو گئی تھی۔ کم مانگی کا فور
ہو چکی تھی۔ جو گلے سامنے تھا وہ پھولوں کے بستر پر
سوئے والی کسی پری پر کیے ایسی شہزادی کا تھا جو جانتی ہی
نہ تھی کہ کانٹے کا درد کیا ہوتا ہے۔ بڑی دیر تک خود کو
دیکھتے رہنے سے اس کے اندر اعتماد آیا تھا۔ لیکن وہ
اس حالت میں کہاں جا رہی تھی؟

سے..... میرا مطلب کیا نام ہے آپ کا.....“ گارڈ
نے شاید اس شلوار قمیص میں کھڑی لڑکی کی مدد کرنے
کے احساس سے خیال پیش کیا تھا۔
”نہیں..... میں خود ہی جا کر مل لیتی ہوں۔“
کہہ کر وہ کلب کے اندر آگئی تھی۔ جہاں کے بے شکم
شور نے اس کا سواگت کیا تھا۔ دروازے کے اندر کی
دنیا ہی اور تھی۔ تیز میوزک، قہقہے، ہنسی، کان تو بہرے
ہوئی رہے تھے آپس میں کچھ پیلا پھیلانے والے
ہونے لگی تھیں۔ سین کی کھوجتی نظریں وہاں کی ایک
ایک چیز پر کھنے لگی تھیں۔ سناٹے وہ یہاں پر کس
ٹائپ کی جاب کرتا تھا۔ وہ ویسے تھا یا ریٹائرڈ؟ فرنٹ
کاؤنٹر پر کام کرتا تھا یا بیک کچن.....؟
”میراں کہاں ہیں۔ میں نے اسے مشروب
مانے کو کہا تھا۔“ قریب سے گزرتے ایک ویسٹو
روک کر اس نے کہا تھا۔ اور ایسے کہا تھا جیسے وہ میراں
کی بچپن کی دوست ہو۔ ویسٹو نے اسے عجیب کی
نظروں سے دیکھا تھا۔

سیٹ خالی ہوئی تو سین اپنا لباس سنبھالتی ہوئی وہاں جا کر بیٹھ گئی۔

جو آسانی قدیلوں کی طرح تا حد نظر پھیلی ہوئی تھیں۔
سڑک کے اطراف میں اُکی سبز گھاس پر ان جگہوں
کے قافلے ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو رات میں سوتے
نہ تھے بلکہ جیسے کسی بارات کا اہتمام کر رہے تھے۔
وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے نچانے کہاں
جارہے تھے۔ کلب سے تو میرا ان اسی ٹیکسی اسٹینڈ
تک چھوڑنے کے لیے نکلا تھا لیکن اب ایسے چل رہا
تھا جیسے کسی پارک میں پھل رہا ہو جبکہ انہیں کلب میں
ہی کافی رات بیت چکی تھی۔

جسم کی مخصوص خوشبو تھی۔ جو سین سے کبھی دور نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہی خوشبو تھی جو اسے شاہ عالمی کے بازار میں تب محسوس ہوئی تھی جب میران نے اپنی کلاں پر دھری جیکٹ کو کار سے پکڑ کر گھما کر پیچھے اپنے کندھے پر رکھا تھا۔ ایسا کرتے ہی اس کے بدن کی خوشبو اور گلون کی مہک سین تک پہنچی تھی اور وہ..... پرے نہیں ہو پائی تھی۔ آج بھی اسے وہی جانی پہچانی سی خوشبو آ رہی تھی۔ کیا یہ اس کے گلون کی مہک ہی تھی یا اس کی؟ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

”تو تم ان ماڈل کی قیمت لینے یہاں تک آ گئی ہو؟“ میران نے چلتے چلتے کسی فزنی گیند کو ٹھوکر مارتے ہوئے مذاق میں بات چھیڑی تھی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ وہ اس کی سوال پر لا جواب ہوا تھا۔ سین کے ٹھیکے ملے تھے۔ اس نے اس طرح کے فیشن پہلی بار دیکھے تھے اور اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے اب تک جو دیکھا ہے سب بے کار تھا۔ اصل حسن تو اس کے سامنے تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ تم صرف ماڈل کی قیمت لیے بنا نہیں جاؤ گی۔“ اس نے اپنا آپ سین کے سامنے کرتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ قیمت کے علاوہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا تھا سین سمجھ سکتی تھی۔

”مجھ لگتا ہے تمہیں.....“ اس نے اعتراف کر لیا۔ جو عجب کرنے والے پہلی ملاقات میں کریں یا سالوں بعد..... کیا فرق پڑتا ہے

”میں یہاں اپنی زندگی لینے آئی ہوں۔“ کہیں اندر ہی اندر اس نے اداسی سے خود سے بھی کہا تھا۔ کیونکہ میران کے سامنے وہ ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ اندر ہی اندر باتیں کرنے کے سودوں نے اس کی ذات میں ہمیشہ گھانا ہی لکھا تھا۔ لیکن وہ اس واقعہ کھانے کے باوجود بھی اپنے پاس اور کوئی آپشن نہیں رکھتی تھی۔

”شکر کرو تم آ گئی ہو..... ورنہ مجھے آنا پڑتا تھا۔ مگر یہی کہتی ہیں کہ فرض نہیں رکھتے۔“ وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔ سین کے دل کی دھڑکیں آٹھ چوٹی کھینے

لگیں۔

”میں نے کہہ تو دیا تھا کہ اس اوکے.....“

”لیکن مجھے نیو یارک واپس آنے تک دکھ رہا کہ میں نے تمہارا نقصان کر دیا تھا۔ کیا تمہارے بابا نے اسے پھر سے بنالیا تھا۔“

”نہیں..... میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ میرے بابا اسے پھر سے بنالیں گے۔ لیکن چونائوٹ جائے تو پھر اسے جو اسے چاہے گا وہ کرے گا۔ عجز کے سیدھ میں کھڑے رہنے کی بیماری ہے۔ عجز کے

برادے سے یہ قالب میں ڈھل کر بادشاہ بن جاتا ہے اور تم تو جانتے ہو کہ بادشاہ نہ مڑتے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں نہ پھر جڑتے ہیں۔ وہ تو بس مڑتے ہیں یا..... ٹوٹتے ہوتے ہیں۔“ وہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”تو تم بھی اپنے بابا کی طرح اس فن کو سمجھ گئی ہو۔“

”اتنے اچھے طریقے سے کہ اب تو شاید بابا بھی میری کار گیری پر حیران رہ جائیں۔“ وہ دکھ سے سوچ کر رہ گئی۔

”کیا میرا مجسمہ بناؤ گی؟“

”نہیں.....“

”کیوں.....؟“

”میں مجسمہ سازی میں زیادہ ماہر نہیں ہوں۔“

”تمہاری شکل خراب کر دوں گی۔“

”حلے گا۔“

”لیکن میرے لیے نہیں حلے گا۔ تمہاری اس صورت کو میں تصور میں بھی نہیں لگا سکتی۔“

”چلو جب میں دنیا سے چلا جاؤں گا تم بتا دینا.....“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”خدا نہ کرے..... یہ لڑکا کیا اول فول بک رہا ہے۔“ وہ دلی ہی دل میں خدا سے اس کے حصے کی

محافی مانگنے لگی تھی۔

”ایک جگہ ہے سین..... شہر کے مضافات میں..... وہاں بہت سے درخت ہیں، بہت سے

پودے ہیں، پھول تو بے تحاشا ہیں اور ایک جھیل بھی ہے۔ میں نے اپنا بہت سا وقت وہاں گزارا ہے۔ مجھے وہ جگہ دنیا میں سب سے زیادہ پسند ہے۔“

”اچھا.....“ سین سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہ موضوع اسے کچھ بے تکا سا لگا تھا۔ ایک دم سے کی مضافاتی علاقے کی باتیں کرنا شروع کر دیتا۔

”میرا بہت سارا وقت وہاں ہی گزرا ہے۔ حیران کن حد تک..... سارا سال میں اس منظر میں بس ایک کچھ مینے کا فرق پڑتا ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ دنیا کا خوب صورت ترین منظر ہے۔“

”کہہ کر وہ اس کی سستی سے چلتی چال کے سامنے آکر اٹھ اٹھا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ سین کی آنکھوں میں نہ اس کی بے گل بات آئی نہ اس کا عجیب سا انداز.....“

”تو.....؟“

”تم اس منظر سے بھی زیادہ حسین ہو۔“

”جتنوں کے قافلے پھولوں کی ماڈ سے اٹھ کر گلوں کی آنکھوں میں آکر گر کر مارنے لگے تھے۔“

”سین کہاں ہو تم..... تم نے اپنی خیریت کا ایک بھی فون نہیں کیا؟“ بابا کی آواز اس کے کانوں میں بڑی ہی اور اس کی ساری سوئی ہی حسین جاگ گئی تھی۔

”جی ہاں..... میں کراچی پہنچ گئی ہوں۔“

”اب چنچا ہو؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہے تھے۔

”نہیں..... کل صبح..... ٹرین لیٹ ہو گئی تھی۔“

”تو بیٹی سیکینے کے گھر اپنی خیریت کا ایک فون کیا؟“

”بابا شکوہ کر رہے تھے۔“ یا ادھر جا کر

”بہنیں بابا.....“ اس نے ہلکے سے کہا۔ وہ بابا کو کیا بتانی کہ ایک رات تو اسے چچی کے شور کی وجہ

سے نیند نہیں آئی اور دوسری رات میران کے ان الفاظ ”تم اس منظر سے بھی زیادہ حسین ہو۔“ کی گونج سے.....

”یہاں سگنل میں کچھ مسئلہ تھا بابا..... میں نے تو کسی بار کوشش کی تھی سیکینے کے گھر کال کرنے کی۔“

”کھانا ٹھیک سے مل رہا ہے وہاں تمہیں.....“

”کیسی جگہ ہے۔ کمرہ وغیرہ تو ٹھیک ہے ناں.....“ بابا فکر مندی سے پوچھ رہے تھے۔ سین اپنے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے ہنسرانے لگی تھی۔

”جی بابا..... سب بہت ٹھیک ہے۔“ وہ چپک کر بولی تھی۔ پھر بھی بابا کی تسلی کرنے میں اسے پورے پندرہ منٹ لگ گئے تھے۔ پھر فون بند کر کے وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی کیونکہ کل صبح والا سا آج پھر سے اسے سانلی دینے لگا تھا۔

دور سے ایک دھبا قریب ہو رہا تھا۔ تاریکی میں پھیلتی روشنی میں ایک سیاہ سادھہ..... وہ لڑکا آہستہ آہستہ کل والے راستے پر ہی گاڑن آج بھی سین کے گیسٹ ہاؤس کی طرف آتا ہوا اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزرنے والا تھا۔ سین بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی اور بڑی توجہ سے اس کا ساڑھی سننے لگی۔ لڑکا بہت نفیس انداز میں ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔ اس کا راگ بہت نفیس تھا۔ جیسے وہ صرف ماؤتھ آرگن ہی نہیں دنیا کے سارے راگ بجا رہا ہوں۔

سین کو آج سے پہلے اندازہ نہیں تھا کہ ماؤتھ آرگن سے ایک سے زیادہ سربھی نکل سکتے ہیں۔ وہ بیروں کو اتنا نہیں جانتی تھی لیکن جتنا جانتی تھی یاسن سکتی تھی بلا شک وشبہ کہہ سکتی تھی کہ وہ لڑکا کمال کا ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔

آج پھر اس نے کھڑکی میں پڑے گلدستے میں سے ایک پھول نکال کر لڑکے کی طرف سین ان لمحوں میں پھینک دیا تھا جب لڑکا اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ لیکن کل کی ہی طرح آج بھی وہ لڑکا اپنی دھن میں، اپنے ساز میں اتنا مغم تھا کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ دوسری منزل کے کمرے کی

”اوہ گاڈ..... میرا مطلب ٹوکری نہیں لائیں؟“
 ”کس چیز کی.....؟“ وہ نہ سمجھی۔
 ”کھانے پینے کی چیزوں کی بھی..... میں باہر کا اور اپنے ہی ہاتھوں کا بنا ہوا کھانا کھا کر تنگ آ چکا ہوں۔“

”کیا ایسا بھی کچھ اہتمام کرنا تھا مجھے.....؟“
 ”یہ ہی تو اہتمام کرنا تھا تمہیں..... تمہیں یہاں میں نے اسی لیے تو بلایا تھا۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی تمہیں یہاں بلانے کی.....“ میران نے کہا تھا اور لمحے میں سین کے چہرے کے رنگ بدل گئے۔ وہ اس کے لیے پورے دو گھنٹے لگا کر تیار ہوئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے صرف گھر کا کھانا کھانے کے لیے اسے یہاں بلایا ہے۔ اسے اپنی تنگ کا

..... اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ وہاں ہی کھڑی رہ کر میران کا انتظار کرے یا آگے بڑھ جائے۔ پھر جب خاموشی میں کسی کے گٹار چلانے کی مدھم سی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ مسکرا اٹھی اور چلنے پھرنے پر احتیاط سے پاؤں رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ ایسی مہموت کر دینے والی جگہ پر ایسا دلکش کام میران ہی کر سکتا تھا۔

ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ہوئے وہ ایک پرانا، سسٹا گٹار بجا رہا تھا۔ بجانے وہ کون سی دھن بجا رہا تھا۔ مشرقی کہ مشرقی..... اداس کہ خوش..... لیکن وہ جو بھی تھا سین کا دل چاہا کہ وہ اسی طرح گٹار پر اپنی انگلیاں چلاتا رہے اور وہ صدیوں تک وہاں اس کے سامنے بیٹھ کر اسے دیکھتی رہی۔
 میران نے اپنی ہنڈا نکالیں گھڑی تو سامنے سین لپٹا ہوا..... میران مسکرا اٹھا۔

زیادہ حسین ہے ناں.....؟“ اس کا اشارہ گٹار اور گٹار کے طرف تھا۔ سین نے مسکراتے ہوئے اثبات چاروں طرف درخت ہی درخت تھے۔ سر بلبلے اور رنگ برنگ کے پھول..... جن پر تتلیاں اڑ رہی تھیں، اور درختوں کی پھینک پر پرندے چھپا رہے تھے۔ میران نے اس منظر سے ملایا تھا۔ کیا وہ بھی ایسی ہی بحر طاری کر دینے والی خوب صورتی کی مالک تھی؟ اگر تھی تو وہ اب تک خود سے اتنی بے خبر کیوں تھی؟

سین اس منظر کی ابتداء سے ہی محو ہو گئی تھی۔ ابھی اندر نہ جانے کیا کیا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھی تھی۔ لیکن پھر ایک دم سے رک گئی۔ وہ کہاں جاے؟ میران نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے یہاں ہی ملے گا اور اب اسے اس جگہ پر کہیں بھی میران نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیل فون نکال کر اس نے میران کو کال کی، لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ بار ملانے پر بھی نمبر بند

نہیں بھولی تھی آج پھر اس کو اپنی یاد دہانی کروا رہی تھی۔ بیشتر بار اس نے اس آواز کو بے حد اداسی سے یاد کیا تھا۔ اور اب..... وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ کوئی اور اس کے کمرے میں ہوتا تو یقیناً اسے پاگل خیال آتا۔ اسے گمان ہی کہاں تھا کہ وہ بھی اس سے دوبارہ ملے گی۔ اس کے لیے تیار ہوگی۔ بنے گی۔ سنورے گی۔

ساری تیاری کے بعد اس نے وقت بیکار دس بج رہے تھے۔ اسے یاد رہے کہ میران کے پاس پہنچنا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ گیارہ بجے اسے شہر کے مضافات میں ملے گا۔ اس نے آخر ٹوکری کی تھی کہ وہ اسے پک کر لے گا۔ مگر سین اسے یہاں بلانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے کہا تھا کہ وہ خود ہی وہاں پہنچ جائے گی۔

تیار ہو کر وہ نیچے اترتی تھی۔ پھر جیسی کہ میران کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی تھی۔ میران نے کہا تھا کہ وہ، وہ جگہ دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔ اور اب یہی ہوا تھا۔

وہ ایک چھوٹا سا ایک قطعہ تھا۔ شہر کے شہرے الگ تھلگ ایک خاموش، پرسکون جگہ..... جس کے چاروں طرف درخت ہی درخت تھے۔ سر بلبلے اور رنگ برنگ کے پھول..... جن پر تتلیاں اڑ رہی تھیں، اور درختوں کی پھینک پر پرندے چھپا رہے تھے۔ میران نے اس منظر سے ملایا تھا۔ کیا وہ بھی ایسی ہی بحر طاری کر دینے والی خوب صورتی کی مالک تھی؟ اگر تھی تو وہ اب تک خود سے اتنی بے خبر کیوں تھی؟

سین اس منظر کی ابتداء سے ہی محو ہو گئی تھی۔ ابھی اندر نہ جانے کیا کیا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھی تھی۔ لیکن پھر ایک دم سے رک گئی۔ وہ کہاں جاے؟ میران نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے یہاں ہی ملے گا اور اب اسے اس جگہ پر کہیں بھی میران نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیل فون نکال کر اس نے میران کو کال کی، لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ بار ملانے پر بھی نمبر بند

کھڑکی سے کسی نے اسے سراپتے ہوئے اس کی طرف پھول پھینکا ہے۔ آج بھی وہ سین کے اچھالے ہوئے پھول پر پاؤں رکھتا ہوا گزر گیا تھا۔ سین اس کی ایسی بے خبری پر ہنسنے لگی تھی۔ تاہم اس راگ کوں کروہ فریش ہو گئی تھی۔

گھڑی میں وقت دیکھا تو پورے سات بج رہے تھے۔ رات اگرچہ دیر سے سوئی تھی اس کی نیند بچی گہری نہیں تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ خود کو تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ کسی قسم کی کوئی تھکن نہیں تھی۔ اس نے آج ہنسنے کے لیے کپڑے پر لیں کروانے کے لیے درگزر کر دیے اور خود نہانے چلی گئی۔ نہا کر نکلی تو اس کے کپڑے بھی پر لیں ہو کر آچکے تھے اور ناشتا بھی..... جسے کر کے وہ تیار ہو گئی۔ کمرے میں ٹھوڑا بہت میک اپ کا سامان بھی موجود تھا۔ کچھ وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی اس نے اسے استعمال کرنا ہی مناسب سمجھا۔ کیونکہ جو کمرے میں موجود تھا وہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ تاہم بڑی احتیاط کے ساتھ کرل مشین کا استعمال کرتے ہوئے اس نے اپنے سیدھے بالوں میں ڈھیلی سی لہریں ڈال لیں تھیں۔ جن میں وہ مکمل اٹھی تھی۔ پرانے ٹیشن میگزین کی تصویروں کو یاد کر کر کے اس نے اپنے اوپر ہی مشن کی تھی۔ یہاں اس کی یادداشت اچھی تھی یا اس کی قسمت..... کچھ بھی خراب نہیں ہوا تھا۔ سب اس کے حسن کی طرح نکھرتا ہی چلا گیا تھا۔

کھڑکی سے باہر طلوع ہو چکا دن اب جوہن پر پہنچ چکا تھا۔ بہار کا موسم کسی وحی کی طرح بڑے مقدس انداز سے نازل ہو رہا تھا۔ ان دنوں میں آنے والی زندگی کے لیے خوشخبریاں تھیں۔ وہ جانتی تھی۔

تیاری کا عمل پورا خوش کن تھا۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اور کچھ یاد کرتے ہوئے مسکراتی رہی تھی۔

”میران نام میران ہے۔“ وہ آواز دے دے کبھی

خواتین ڈائجسٹ
 کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ کدھر

فوزیہ یاسمین



قیمت - 750 روپے

وانیہ آفرین

کیٹل لٹریچر

<https://www.urdu tubes.com/>



”ہاں..... ایسا ہی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے میں سورج سے آج پہلی بار ملی ہوں۔ پانی کو بھی میں نے اصل میں آج ہی دیکھا ہے۔“ وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں پڑی۔ اسے آج پتا چلا تھا کہ ہر زمانے میں لوگ سورج کی پرستش کیوں کیا کرتے تھے۔ یقیناً سب سے پہلی عبادت سے پہلے انہوں نے بھی سورج کا ایسا ہی کوئی منظر دیکھ لیا ہوگا۔

”چلو..... دعا مانگو.....“ میرا ان کی دعا چوٹی۔

”کیا مطلب..... تم سورج پرست ہو؟“

”نہیں میں قدرت پرست ہوں۔ خدا کو مانا ہوں۔ اس کے ہر دلفریب منظر پر مجھے احساس ہوتا ہے کہ خدا بہترین تخلیق کار ہے۔ اس لیے میں دعا کرتا ہوں۔ تم بھی کرو.....“

میرا نے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کیں تو اس نے بھی اس کی تقلید میں مسکرا کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ لیکن وہ اس کی طرح آنکھیں بند نہ کر سکی۔ بلکہ جمیل میں نظر آتے ہیں کے عکس کو دیکھنے لگے اور دعا کرنے لگی۔

”اے خدا..... میں نے زندگی بھر کوئی ایسی عکس نہیں کیں کہ میں اس کے بدلے میں بھی سچے سے میرا مانگ سکوں۔ پر میں ایک التجا کرتی ہوں کہ مجھے یہ ملے نہ ملے لیکن اس کی یہ پرچھا میں مجھ سے دور نہ جائے۔ میں جب جب یہاں آؤں..... مجھے جمیل کے پانی میں اس کا عکس دیکھنے کو مل جائے۔ میں اس عکس کو دیکھ دیکھ کر ہی ساری زندگی گزار دوں گی۔“

اس نے بڑی شدت اور رقت سے دعا کی تھی۔ وہ شروع سے ہی ایسی بے سلیقہ رہی تھی۔ دعا مانگنا اسے بھی آیا ہی نہیں تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے دعا میں کیا مانگ لیا ہے۔ کتنی بھیا تک التجا خدا کے حضور بھیج دی ہے۔ جو منظور بھی کر لی گئی ہے۔ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

احساس ہوا تھا۔ تب ہی میرا قبضہ لگا کر ہنسا تھا۔ اس نے سین کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ دیکھ لیے تھے۔

”مذاق کر رہا ہوں۔ میں ہر چیز کا انتظام کر کے آیا ہوں۔“ میرا نے کہا تو سین کی سانسیں پھر سے ہموار ہوئیں۔

”جلدی کرو..... سورج اپنا راستہ بدلنے والا ہے۔ پھر تم وہ نہیں دیکھ سکو گی جو میں دکھانا چاہتا ہوں۔“ ایک دم سے ہی وہ اٹھا اور سین کا ہاتھ پکڑ کر وہ ایک طرف کو بڑھا تھا۔ سین یہ تک نہیں کہہ سکی تھی کہ وہ اس کا ہاتھ نہ پکڑے..... وہ خود چل لے گی۔ اس نے سپردگی دے دی تھی۔ میرا نے اسے لے کر ایک قدرے اونچے مقام پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں سے جمیل پوری کی پوری نظر آ رہی تھی۔

”یہ دیکھو.....“

سین نے میرا پر سے نظریں ہٹا کر اس کے اشارے کی طرف دیکھا تھا۔ سامنے ایک جمیل تھی اور اس کے عین درمیان میں اور عین اوپر دن کا سورج چمک رہا تھا۔ جمیل کے غیر مرئی سے بھنوروں میں سورج کی کرنیں رقص کر رہی تھی۔ ہر ہر بھنور نفس سنہری قالین کی طرح سلوٹ زدہ سا ہو کر اسے عکسوں کو بڑھا رہا تھا۔ پانی کا اصل رنگ تو کہیں کھو کر ہی رہ گیا تھا۔ اس وقت جو جمیل نظروں کے سامنے تھی وہ سونے کے پانی سے بھری ہوئی دھبی تھی۔ سین دم بخود رہ گئی۔

”یہ منظر پورے تین منٹ تک برقرار رہتا ہے۔ جب تک سورج عین ندی کے اوپر رہتا ہے۔“ میرا نے بتانے لگا تھا۔

”یہ آگ اور پانی کا سنگم ہے۔ ایسے لگتا ہے ناں جیسے سورج کی آگ پانی کو جلا ڈالنا چاہتی ہو..... اور پانی سورج کی تپش کو خود میں سمو کر اسے ٹھنڈا بیٹھا کر دینا چاہتا ہو۔ عجیب تضاد لگ رہا ہے ناں یہ.....“

پہلی دوپہر میں پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر اور صدر کا بے ہنگم ٹریفک کی عذاب الہی سے کم نہیں ہے۔ پیشانی پر آئی کی کوٹھوپیر سے صاف کرتے ہوئے وہ اپنی قسمت سے نالاں اور زندگی سے ناراض تھی۔ شدت ضبط سے اس کی ہجوری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس نے اکتائی ہوئی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا، کان یونیفارم میں سامنے دو لڑکیاں بے زار بیٹھی تھیں، برابر میں بیٹھی ایک ادیبہ عورت جوشاید اسکول لچھڑی بار بار اپنی ہائیں کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہی تھی الغرض ہر کوئی غلت میں بے زار سا نظر آ رہا تھا بے زاریت بھی اب قومی شکل اختیار کر گئی ہے۔ بس سے اتار کر وہ تیز تیز قدم اٹھائی بلڈنگ کی طرف آ گئی، لمحے بھر کو رک کر اس نے بلڈنگ کے تیسرے فلور پر پرانے طرز پر بنے اپنے دو کمرے کے گھر پر شکوہ پھری نگاہ ڈالی اور پست قدموں سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”اف ایک تو اس بجلی نے تنگ کیا ہوا ہے قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔“ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی چڑچڑاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ”جس سویرے کام پر نکل جاؤ، تھک ہار کر گھر لوٹو تو بجلی نہیں،“ جھنجھلاتے ہوئے اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔

فریش ہو کر اس نے چائے بنائی اور کمرے میں آ گئی۔ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اسے ماں کی بارہا کی گئی نصیحت یاد آئی۔

”بیٹا! خالی پیٹ چائے مت پیا کرو۔“ ماں کی سرگوشیاں یاد بن کر سامنے آن کھڑی ہوئیں تو اس کا منہ تنگ جاتا ہاتھ رک گیا۔ آنکھوں میں آنی کی کو اندر اتارتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھی اور ساند ٹیبل سے بسکٹ نکال لائی۔ خیالوں میں گم نہ جانے اس کی آنکھ کب لگ گئی۔ دن بھر کی تھکی ہاری ایسی لمبی تان کے سونی کون شام میں اور شام رات میں ڈھل گئی قریباً نو بجے واضح کی آواز پر ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔

”نیند پوری ہوئی ہو تو کھانا دے دو۔“ واضح کی

بے زار آواز نے اسے جھنجھوڑا کھانا تو اس نے آج بنا ہی نہیں تھا۔

”جاؤ بازار سے لے آؤ کچھ آج میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔“ اپنی کوتاہی کو اس نے سر دلچے میں چھپانے کی کوشش کی۔

”جو بھی ہے گھر میں کھانا بناؤ۔“ واضح نے سخت لہجے میں کہا اور فریش ہو کر چلا گیا۔ اس کی پشت کو ناگواری سے سورا۔

”ہونہہ سمجھتا کیا ہے خود کو۔“ اس نے غصے سے فون اٹھایا اور بریانی کا آرڈر دے دیا۔

واضح جب فریش ہو کر روٹم میں واپس آیا تو بھر کو بستر پر نیم دراز دیکھ کے اس کا خون کھول گیا۔

”دن بھر محنت کر کے آتا ہوں تم مجھے ایک وقت کا کھانا بھی نہیں دے سکتیں۔“ کڑے تیور لے

عین اس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ ”محنت صرف تم ہی نہیں کرتے میں بھی دن بھر سر کھپاتی ہوں فکر مت کرو بریانی آرڈر کر دی ہے میں نے۔“ سحر نے غصے سے سر جھٹکا اور اپنے کمرے

سنہرے بالوں کو سمیٹ کر بیڈ سے اٹھ گئی۔ واضح ہمیشہ کی طرح اس کی زلفوں میں الجھ کے رہ گیا۔

اس نے اپنی نظروں کا ارتکاز بدلا۔ سامنے بیٹھی لا پرواہانہ لڑکی اس کی بیوی تھی جس پر وہ حق رکھتا تھا۔ لڑکے، ناراضی سے اپنی بات منوانے کا گھراپا کیا ہوا تھا ان کے درمیان جو شریر جملوں اور نظروں التفات کے بجائے، سرد مہری نے جگہ لے لی تھی اتنے قلیل عرصے میں زندگی کے رنگ آخر کیوں ماند پڑ گئے تھے؟

”سحر! تم روز فضول خرچی کرتی ہو، ہر مہینے جو راشن لاتی ہو وہ پڑے پڑے خراب ہو جائے گا۔“

واضح کا لہجہ اب کی بار دھیمہ تھا۔ ”نہیں ہے ہمت تو کیا کروں، ویسے بھی راشن میں اپنے پیسوں سے لیتی ہوں، تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ تڑخ کے جواب آیا۔

واضح نے کچھ بولنے کے لیے لب کھولنا چاہے

مگر ضبط کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

یہ حقیقت تھی گھر کا راشن و دیگر ضروریات سحر اپنی خواہ سے پوری کرتی تھی، واسح کی لگی بندھی سیلری گھر کے کرائے بجلی و گیس کے بل میں کھپ جاتی

ادھر کے سب خرچے سحر پورے کرتی تھی۔ وہ ایک ہسپتال میں ریپنڈنٹ تھی واسح کے ساتھ مل کے وہ گھر طائی تھی مگر سامان کے بار بار سامنے

کھانا دونوں نے مختلف سوچوں میں گم تناؤ کے ماحول میں عیاں کی کھانا خوش گوار ماحول میں بھی کھایا جاتا تھا اگر ایک دوسرے سے کہنے کھنچے رہنا شاید دونوں کی عادت سی بن گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

”مسئلہ حل ڈھونڈنے سے ٹھیک ہوتے ہیں۔“ آج دن بھر ماہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔

”پہلے تو میرے لیے مسئلہ کا تعین کرنا ضروری ہے، مسئلہ آخر ہے کیا؟ کیا میں اور واسح اب ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے، ہماری محبت ماند پڑ گئی ہے؟“

”سحر! میں یہ کھانا لایا ہوں، اوون میں گرم کر لو۔ آتے، آتے ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“

نہ جانے وہ کب تک خود کلائی کرتی رہتی واسح کی آواز نے اسے چونکایا۔

”یہ لو، تم گرم کرو، میں فریش ہو کے آتا ہوں۔“ چھوڑ، میں فریش ہو کر خود گرم کر لیتا ہوں۔“

سحر کو اپنی جگہ کھڑے دیکھ کر اس نے ناگواری سے کہا۔

”نن..... نہیں، میں کر رہی ہوں گرم۔“ سحر نے دھیمی آواز میں کہا اور پگن کی طرف بڑھ گئی۔

واضح پیچھے حیران کھڑا رہ گیا تھا آج اسے سحر کے چہرے پر اکتاہٹ کے بجائے کچھ عجیب سا احساس نظر آیا۔

کھانے کے دوران بھی سحر خاموش رہی واسح سحر کے بدلے رویہ کو دیکھ کے کچھ پریشان ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

کری کی پشت سے نکادیا اور آنکھیں موند لیں۔ ماہا پر سوچ انداز میں کاؤٹر کی طرف بڑھ گئی۔

”یہ لیں گرما گرم چائے، میں نے خاص کبہ کر دودھ پتی بنوائی ہے۔ لی ٹیک والی چائے سرد رکھاں دور کر لی ہے، سینڈوچ بھی لیں نا۔“ ماہا ایک ہنس کھ کی تلاش لڑکی تھی۔

”جھینک یو۔“ سحر بدقت مسکرائی اور چائے کا کپ اپنے آگے کر لیا۔

”سحر! مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ نے اپنی کوتاہیوں کو ڈھونڈ لیا ہے۔“ ماہا عام سے انداز میں اس سے بات کر رہی تھی۔

”جھینک ایسا کیوں لگا؟“ حیرانی سے اس نے ماہا کو دیکھا۔

”کیونکہ کل آپ پریشان تھیں اور آج الجھی ہوئی لگ رہی ہیں۔“ سحر نے انتہائی حیرت سے سینڈوچ اور چائے سے انصاف کرتی اٹھا رہے، بیس سیال کی لڑکی کو دیکھا جو خطرناک حد تک چہرہ شناس تھی۔

”ماہا! تم مجھے روز اپنی باتوں سے حیران کر رہی ہو۔“ اب کی بار سحر کی آواز میں ہلکی ہلکی ٹھنک تھی۔

”آہاں..... یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔“ ماہا گل کھلائے تھی۔

”نہا ہے سحر! ہم انسان اپنی پریشانیوں کا گلہ اللہ سے کرتے رہتے ہیں مگر یہ نہیں جان پاتے یہ مصائب کا سلسلہ درحقیقت ہمارا ہی شروع کیا ہوا ہے، ہمارے عمل، ہماری کوتاہیاں ہمیں نظر نہیں آتیں، جس دن ہم اپنی غلطی کی مان لیتے ہیں اس دن سے ہماری آنکھیں بڑھ جاتی ہیں، ضمیر کی جنگ کا آغاز شروع ہو جاتا ہے۔ ہماری انا ہمیری کی آواز کو جیتنے نہیں دیتی یہ انسان کی فطرت ارادی پر منحصر ہے وہ اپنی انا کو چل کے غلطیوں کو سدھارتا ہے یا پھر اپنی عمر اسی گرداب میں گزاردیتا ہے۔“

”چلو، دیر ہو رہی ہے۔“ سحر نے گھبرا کے کہا اور تیزی سے کینے ٹیر سے نکل گئی۔

اس کے بعد پورا دن دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔

”ماہا! جن لوگوں کا دل کاچ کی طرح شفاف ہوتا ہے نا اللہ انہیں دوسرے کے دل میں اترنے کے ہنر سے نوازتا ہے، پلیز اسے ہمیشہ شفاف رکھنا کیوں کہ تم چہرہ شناس نہیں بلکہ دل کے رازوں کو پڑھنے کا ہنر جانتی ہو۔“

سحر نیارے۔

”کچھ فیصلے خاص لمحوں کے منتظر ہوتے ہیں، یہ خاص لمحہ سحر واضح کی زندگی میں آ گیا تھا۔

☆☆☆☆

آج موسم قدرے بہتر تھا آسمان پر چھائی بدلیاں اور ہلکی ہلکی ٹھنک ہوا دل کے موسم کو سرد کر رہی تھیں۔

بالکونی میں کھڑی وہ آج خود کو خاصا بکا چھلکا محسوس کر رہی تھی جب دل پر چھائی گرد صاف ہو جائے تو ہر منظر اجلا اجلا لگتا ہے کھڑی پہ نگاہ پڑی شام کے سات بج رہے تھے واضح کے آنے میں کچھ ہی ٹائم تھا۔

”آج وہ واضح کو مس کر رہی تھی۔“ اس نے حیران ہو کے اپنے دل پر ہاتھ رکھا شادی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا وہ واضح کا شرفی بیویوں کی طرح سچ سنور کے لیوں پر مسکراہٹ سجائے انتظار کرنا جانے کب کا چھوڑ چکی تھی۔ آخری دفعہ وہ پانچ ماہ کی واضح کی بہن کی شادی پر تیار ہوئی تھی۔ تو سحری معاش نے زندگی کے رنگ ماند کر دیے تھے۔ سحری کرنا اس کی مجبوری تھی واضح کی تنخواہ میں گزر بسر مشکل تھا دن بھر دینی و ماعی مشقت کرتے اس کے وجود میں بھی بے زاریت رنج بس گئی تھی۔ گھر لوٹنے کے بعد وہ اپنی ساری بے زاری واضح پر الٹ دیتی یہی حال بچہ واضح کا بھی تھا۔

تیز ہوا کے جھونکے نے اسے سوچوں کے صندوق سے نکالا۔ لمبے گہرے سانس اندر لیتے ہوئے اس نے

نے آسمان کی طرف دیکھا اور بچپن میں آگئی۔ کھانا بنا کر وہ خود تیار ہونے لگی اس نے سی گرین کلر کالان کا انیمز ڈیسوٹ پہنا بالوں کو اسٹریٹ کر کے انہیں کھلا چھوڑا اور فرنٹ سے ٹوئسٹ بنائی، لائٹ سامیک اپ اور نازک سی جیولری پہن کر اس نے خود کو آئینہ میں دیکھا آج وہ خاصی خوب صورت لگ رہی تھی۔ لیوں پر دلفریب سی مسکراہٹ لیے وہ واپس کچن میں سلاوا بنائی اتنے میں دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی اس کا دل آج پہلے کی طرح واضح کی موجودگی کا سوچ کر ایک الگ لہجے میں دھڑکا۔

”جلدی سے فریش ہو جائیں میں کھانا لگا رہی ہوں۔“ سحر نے کچن سے ہی آواز لگائی۔

”واضح کے بڑھتے قدم اس تہذیبی پر حیرانی سے گہرے کمر خوش فہمیوں کو جھٹکتے ہوئے وہ فریش ہونے چلا گیا۔

فریش ہو کر آیا تو دسترخوان پر اپنا من پسند کھانا اور سنی سنوری مسکرائی بیوی کو دیکھ کے اس کی ساری ٹھنک اور طبیعت پر چھائی کرانی لپٹ کر میں غائب ہو گئی۔

”خیریت! آج میری یا تمہاری برتھ ڈے ہے۔“ واضح نے خوش گوار حیرت سے پوچھا۔

”جلدی سے کھانا کھا کیے لائٹ جانے والی ہے۔“ سحر کے یاد دلانے پر واضح نے منہ بنایا۔

”ایک تو یہ بچی ذرا جو رو مانس کا موقع دے۔“ واضح کی بات پر سحر کی مدھمکی سے ہر منظر جھوم اٹھا۔

”اسی طرح مسکرائی رہا کرو۔“ واضح کی تعبیر نے سحر کی ایک ہیٹ مس گئی۔

”واضح ایم سوری۔“ کچھ لمحوں بعد سحر کی آواز نے سحر کے من میں چھائے سکوت کو توڑا۔

”سوری کس لیے؟“

”ہوں۔“ ندامت سے چور لہجے اور غم آنکھوں سے اس نے کہا۔

”سحر میں بھی اپنے روئے پر نادم ہوں میری غلطی زیادہ ہے۔ مجھے تمہاری پرابلم کو سمجھنا چاہیے تھا۔ تم ایک ورکنگ وومن ہو، میں نے تم سے ایک گھریلو بیوی کی سی امید رکھی جب تم میرا گھر چلانے میں ہاتھ بٹا سکتی ہو تو میں گھر کے کاموں میں تمہارا ہاتھ کیوں نہ بٹا سکتا۔ ہمارا معاشرتی المیہ ہے ہم دوسروں سے تو امیدیں وابستہ رکھتے ہیں مگر بھی ان کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش نہیں کرتے۔“ واضح کے لہجے سے شرمندگی و ندامت جھلک رہی تھی۔

”واضح! ہر رشتے کی کچھ ڈیمانڈز ہوتی ہیں، ایک دوسرے کو سمجھ کر ہی ہم ان ڈیمانڈز کو پورا کر سکتے ہیں۔ بہت سے مسئلے محض ایک ٹیبل ٹاک کے منتظر ہوتے ہیں۔

”خیر چھوڑیں ان باتوں کو، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”ادھاں آج کا ڈنر تو میرے لیے بہت خاص ہے۔“ کمرے میں ایک دم اندھیرا چھا گیا واضح کا ڈش کی طرف جاتا ہاتھ رک گیا۔

”آف ایک تو یہ بچی۔“ واضح کی جھنجھلاہٹ بھری آواز پر سحر کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”فکر نہیں کریں میں نے انتظام کیا ہوا ہے پہلے سے۔“

کچھ دیر بعد کمر اسنہری روشنی سے چمک اٹھا۔

”ارے واہ آج کا ڈنر تو کچھ زیادہ ہی اسپیشل ہو گیا۔“ واضح کی بات پر سحر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ارے بھی۔“ کینڈل لائٹ ڈنر“ جو ہوا۔“

سکرادونوں کے محبت بھرے تہمتوں سے گونج اٹھا۔

بہت سی خوشیاں صرف ہمارے ایک قدم آگے بڑھنے کی منتظر ہوئی ہیں بعض دفعہ حالات نہیں بدلتے ہمارا ان حالات کو برتنے کا طریقہ بدل جاتا ہے۔

☆☆

عشقِ آتش

<https://www.urdutubes.com/>

چاندنی کسی گوری کے پیروں میں بندھی پائل کی صورت میں چمن چمن کرتی کوسہار کی برقی چوٹی پر اترتی تھی اور پھر پھسلے ہوئے پوری وادی پر پھیلتی چلی گئی۔ قریب قریب چمکتی ہوئی چاندنی نے اس حویلی کے احاطے کو بھی اپنے حصار میں لے لیا تھا، مگر پھر بھی اس حویلی کی ویرانی میں کی آئی نہ پراسراریت میں۔

جانے کتنے دہائیوں سے یہ حویلی ملکہ کوسہار کے پہاڑوں کو منہ اٹھا کر تنک رہی تھی۔ اس کے بدن کی مٹی بھر بھری ہوئی جا رہی تھی۔ شان و شوکت ڈھلنے کو بھی مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ پر بیٹھے گاڑے کھڑی، وادی کے بایسوں کو خوف زدہ کرتی۔

ہاں خوف زدہ ہی تو کرتی تھی۔ نہ جانے کون سا آسیب پلٹا تھا اس حویلی میں جو آدھی رات کو حویلی دلدوز چیخوں سے لرز اٹھتی ایسی دلدوز چیخیں جسے سن کر انسان کو وحشت گھیر لے۔ آج بھی حویلی ان دل کو چیر جانے والی چیخوں سے لرز اٹھتی تھی۔

”نہ جانے کب اس حویلی میں بھٹکنے والی آتماؤں کو شائقی ملے گی۔“ نور محمد نے کانٹے دل سے سوچا اور ایک نگاہ اسے بیوی بچوں پر ڈال کر آنکھیں زبردستی میچے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دیگر وادی بایسوں کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ اس حویلی میں بھوت، بریت، آتماؤں منڈلائی ہیں۔

☆☆☆

”پیارے اتر!“ قلم سے یہ دو لفظ جاری ہوئے، اس کے لبوں پر خوب صورت کی مسکان سج گئی۔ بے ساختگی کے انداز میں اس نے قلم اپنے دانتوں تلے

دبایا۔ آنکھوں میں آنسو تھپتھپاتا تھا۔ یوں تھا جیسے شش و پنج میں مبتلا ہو کر مزید کیا لکھوں۔ مزید کے دائیں جانب سرخ رنگ کے گگن میں ایک لڑکی کی کافی اس کی توجہ کی منتظر تھی۔ نہ جانے کیا لکھ دیتی تھی وہ..... شاید محبت کی کوئی داستان رقم کر رہی تھی۔ ہاں یہ ہی ہو سکتا ہے..... جودل آدیز مسکان اس وقت اس کے لبوں پر تھی تھی، وہ محبت کے مہروں منت ہی ہو سکتی تھی۔ دائیں جانب کی دیوار پر نصب گھڑیاں لگنے سے گھٹنہ بجایا، وہ چونک اٹھی۔ سرد ہوتی کافی نے اسے نکلنے سے گھورا۔

سامنے رکھے لپ ٹاپ کی اسکرین آن ہوئی۔ اس کی خرد و ملی انگلیاں کی بورڈ پر جبکہ نگاہیں اسکرین پر بڑی پھرتی سے دوڑنے لگیں۔ کچھ دیر بیٹھی سلسلہ جاری رہا۔ کچھ ای میلز تھیں جن کا جواب دے کر وہ لپ ٹاپ بند کر کے ان صفحوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے دروازے میں ڈال کر بڑے مطمئن سے انداز میں کافی کا گئی۔ اٹھاتے ہوئے کرسی سے اٹھی اور دھیرے دھیرے قدموں سے کھڑکی کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ مسکراتی ہوئی کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے باہر برکتی برکتی موٹی بوندوں کو دیکھنے لگی۔ سرد موسم، سرد دکانی، سرد بوندیں۔

اس نے لطف کی اس کیفیت کو آنکھ بند کر کے محسوس کیا۔ کافی کا آخری گھونٹ بھرتے ہی اجاٹک کی خیال کے زیر اثر اس نے گردن موڑ کر بید کے ساتھ رکے ایک سیاہ ہینڈ بیگ کو دیکھا اور پھر گھڑیاں کو.....

مسکاتے لب دھیرے سے ہم کلام ہوئے۔

”وادی کوسہار..... عن قریب تم سے ملاقات

ہونے والی ہے۔“ وہ کافی کا خالی گ میز پر رکھ کر نرم و گداز برستی نرمی و گرمی کے احساس تلے سوئی چلی گئی۔ صبح نہایت خوش گوار تھی۔ وہ بے دار ہوئی تو خود کو بے حد تازہ دم محسوس کرنے لگی۔ شاید یہ تردنازگی اس

ٹرب کی بدولت اس پر چھائی تھی جس میں اسے اسکول کے طالب علموں کے ساتھ شامی علاقہ جات میں ہنسنے دن کے لیے جانا تھا۔ مسز صدیقی (پرنسپل) نے اس کی ذمہ دارانہ فہمیت کو دیکھتے ہوئے خاص طور پر اس کا نام تجویز کیا تھا۔ رات بھر ہوتی بارش کا سلسلہ اب ہم چکا تھا۔ وہ کھڑکی سے داخل ہوئی تازہ ہوا کے جھونکوں کو کچھ دیر تک آنکھیں بند کر کے اپنے اندر اتارتی رہی اور پھر تیاری کی غرض سے واش روم میں چلی گئی۔

”میاں جی! آپ کو سنبھل کو اتنے دنوں کے لیے ان علاقوں میں جانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ دس دن تک میری بیٹی مجھ سے دور رہے گی، یہ سوچ سوچ کر تو میرا دل ہول رہا ہے۔“ حبیب، اشتیاق

URDU TUBE
A HUB OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com



* RIVER

عالم کو چاہئے کہ کاپکڑا کر فکر مند ہی سے بولیں۔
 ”ارے بیگم! آپ خواہ خود بھی ہوں رہی ہیں اور اپنے دل کو بھی ہول رہی ہیں۔ سب ماشاء اللہ بڑی ہو چکی ہے، اسکول میں پڑھتی نہیں، پڑھاتی ہے اور آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ مسز صدیقی نے سب کی سب داری اور ذمہ دارانہ فطرت سے متاثر ہو کر خاص طور پر اسے منتخب کیا ہے۔“ اشتیاق عالم نے ناک پر دھرے ٹیک کو ہٹا کر، بیگم کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھامتے ہوئے انہیں سمجھایا۔
 ”السلام علیکم اماں، بابا! سب بڑے جوش سے انداز میں کبھی لاؤنج میں داخل ہوئی اور جیبہ کے گلے میں بانٹیں ڈال کر چپٹے ہوئے کہنے لگی۔
 ”آج آپ کی لاڈلی بیروسیاحت کی غرض سے پریوں کی دادی کا رخ کر رہی ہے اماں جان! آپ نے ہماری شان میں پیٹ پوجا کے لیے یقیناً خاطر خواہ انتظام تو کیا ہی ہوگا۔“
 ”بالکل ٹھیک فرماری ہیں صاحب زادی صاحبہ! آپ کی والدہ ماجدہ نے اعتراضات کے ٹوکے بھر بھر کر آپ کی خدمت میں پیش کرنے کو سجائے ہیں۔ ہاں غصے کی چھال کا الگ انتظام کیا ہے۔“ تیمور صاحب کی ماں بیٹی کے لاڈ دیکھ کر رگ زلفت پڑ کر ٹپکی۔
 ”ہاں تو..... ایک ہی بیٹی ہے میری اور آپ کی وجہ سے پہلی بار اتنے دن دور رہے گی مجھ سے۔ ماں ہوں ناں، میں فکر نہ کروں گی تو کیا محلے والے فکر کریں گے میری بیٹی کی۔“ جیبہ، میاں جی کی باتوں کا برامتاہے ہوئے بولیں۔
 ”بابا جان..... نہ چیخیں میری پیاری اماں جان کو۔“ وہ تیمور صاحب کی شرارت سمجھ کر ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

☆☆☆

او ضمن آ..... او ضمن آ..... صمنآں..... صمنآں..... او ضمن آ
 تیری تصویریں..... تیری تحریریں..... تیری تصویریں..... تیری تحریریں.....
 اب میری تہائی ہے آسان..... اب میری تہائی ہے آسان.....

تیری تصویریں..... تیری تحریریں..... تیری تصویریں..... تیری تحریریں.....
 گھر میں میرے پھیلا ہوا ہے یہی سامان.....
 ارم کمرے سے نکلتا ہوا تڑپا تھا۔ دادی جان کی ریڈارجیسی تیز نظر نے جھٹ ارم کو اپنے حصار میں لیا اور بلند آواز میں اعلان فرمایا۔

”بھو! اب تمہارا بیٹا شادی کی درست عمر کو پہنچ گیا ہے۔ اپنی بہن سے اب شاملہ کو رخصت کرنے کی بات کیوں نہیں کرتی ہو؟ یہ نہیں کر رہی ہیں جیسے کہ حالت، کیسا اتنا ڈلا ہوا جا رہا ہے۔“ دادی جان کی کڑک دار آواز نے جہاں ارم کو خوابوں کی دنیا سے حقیقی دنیا میں واپس لا چکا تھا، وہیں وال میں بھگدڑ لگائی عفت آرا کو بھی ہڑ بڑا دیا۔

”دادی جان میری سفارش کر رہی ہیں یا کھنچائی۔“ وہ آفس کے لیے نکل رہا تھا مگر دادی جان کے اس اعلان کے بعد ان کے پاس آ بیٹھا اور پاندان سے پان نکال کر بناتے لگا۔ یہ تھا دادی جان کو رام کرنے کا خاص انداز۔

”بیٹا! اس عمر میں تو تمہارے دادا بھی باب بن چکے تھے۔ ایک تم ہو کہ سارے جہاں میں ادھر سے ادھر لور پھرتے رہتے ہو۔“ دادی جان نے اس کے ہاتھ سے پان لیتے ہوئے کہا۔

”ہونہ، دادا کا بتا رہی ہیں۔ پوتے کے ابا کا نہیں کہ ان کی کس عمر میں شادی کی تھی۔“ عفت آرا کچن میں دونوں دادی پوتا کی گفتگو سن کر بڑبڑا گئیں۔
 ”دادی جان! دادا کو تو ہر بات اور کام میں جلدی کی عادت تھی۔ شادی بھی جلدی کی، بچے بھی جلدی پیدا کر لیے اور نکلت کٹا کر اوپر بھی جلد چل دیے۔ میں ہر کام آرام سے، وقت پر کروں گا۔“
 دادی کو بان پکڑا کر اب وہ انہیں چونکا کر ہاتھ تھا۔
 ”چل ہٹ بد معاش۔“ نامحسوس کہیں کا اپنی ہر ذمہ داری پوری کر کے گئے ہیں صدیقی صاحب۔

مرحوم بڑے ہی نیک طبیعت انسان تھے۔“ دادی جان اپنے عجازی خدا کو یاد کر کے آب دیدہ ہو گئیں۔
 ”دادی جان! ان کی زندگی میں بھی انہیں یوں

ی یاد کیا کرتی تھیں یا یہ امر از انہیں مرنے کے بعد حاصل ہوا۔“ مجال سے جو وہ کبھی سنجیدہ ہوا ہو۔ بھر پور مجروحان اور کرسٹل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ کا بہترین آفیسر ہونے کے باوجود اس کی طبیعت میں شوقی کے سارے رنگ کھلے ہوئے تھے۔ فطرتاً وہ زندہ دل انسان تھا۔

”مگر عفت آرا! آپ کی اڑا ہے۔ جب وہ طیس میں آئیں تو ان کا لاڈلا پوتا اچانک ہی بوسم کا بد معاش بیوت بن جاتا تھا۔ ارم کی چونک کر رہے ہو اماں جی کو، اب ارم کی دہائی نہیں اپنے بچروں کے ادارے پہنچنے میں۔“ عفت آرا نے جھٹ بیٹے کے کان کھینچے۔

”ارے میری پیاری ماں! جا رہا ہوں، اب اور اتنا دل کو کھینچیں نہیں سکتا۔ چلو ارم میاں اٹھو ایک منٹ کی بھڑک کے ساتھ ہی پھوڑتے رہو۔“ وہ بیکر کا بیٹھیل۔

”ویسے اماں جی! کہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔“ ارم نے اس کی بات کو ٹھیک کر دیا۔
 ”اب اس میں اور کتنی ہی شادی کے حوالے ہیں۔“ ارم نے اس کی بات کو ٹھیک کر دیا۔

”اب اس میں اور کتنی ہی شادی کے حوالے ہیں۔“ ارم نے اس کی بات کو ٹھیک کر دیا۔
 ”اب اس میں اور کتنی ہی شادی کے حوالے ہیں۔“ ارم نے اس کی بات کو ٹھیک کر دیا۔

”عفت آرا! آپ کا فون آیا تھا آج، کہہ رہی تھیں کہ کون سا سال گزر چکا ہے اب شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے۔“ شام کو خوشی سے چمکتا چہرہ لمحے بھر میں ماند پڑ گیا۔ میمونہ کی دل کو ٹھنڈ پینچی، وہ ایسی ہی تھی دوسروں کی خوشی میں بھگ ڈالنے والی۔
 ”آثار تو ایسے ہی بتاتے ورنہ خود سوچو، اتنی طویل مگنی آج کل کے زمانے میں کر کے کون بھول جاتا ہے۔ خیر چھوڑو اب تو تمہاری خالہ مان گئیں

چلنے دیا ہوا اس نے کہ خالہ جان سے شادی کی بات کر چکا ہے۔

”میں نے کہا سو بسم اللہ۔ آپ کا اپنا گھر ہے آپا، جب چاہیں آپ لوگ آئیں ہمارے گھر پر۔“ راحت آراء پر جوش سی شاملہ کو ساری تفصیل بتا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر سے گزرتی میمونہ کے قدم ارم کا نام سنتے ہی رک گئے۔ کتنی دیر تک وہ دروازے کی آڑ میں کھڑی کن سوئیاں لیتی رہی اور جیسے ہی اسے پتا چلا کہ شاملہ اور ارم کی شادی کی تاریخ پکی ہونے والی ہے وہ پیر پختے اپنے کمرے میں آ گئی۔

”نہ جانے شاملہ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو میرے پھسلانے کے باوجود ارم کے سر سے اس وقوف لڑکی کی محبت کا بخار نہیں اتر رہا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی، جلتے پیر کی ملی بینی کمرے میں ادھر سے ادھر کھلتے لگی۔

”اور یہ شاملہ، آجائے گی ابھی میرے سینے میں مونگ دلنے، ارم کی محبت کے قصبے سنانے۔ ہونہہ.....!“ اور ایسا ہی ہوا۔ میمونہ پٹی ہی تھی کہ شاملہ کمرے میں مسکراتے ہوئے داخل ہوئی۔

”تمہیں پتا ہے میمونہ! خالہ آنے والی ہیں شادی کی تاریخ لینے۔“ وہ خوشی خوشی اسے بتا رہی تھی اور میمونہ کے دل سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے ناں، آخر ارم نے منا ہی لیا عفت خالہ کو شادی کے لیے، ورنہ وہ تو مگنی کر کے ایسے بھولی تھیں جیسے شادی کا ارادہ ہی نہ ہو۔“ جل بھن کر اس نے ہوا میں تیر چھوڑا۔

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ خالہ شادی کے لیے راضی نہ تھیں۔ ارم کے ضد کرنے پر راضی ہوئی ہیں۔“ شاملہ کا خوشی سے چمکتا چہرہ لمحے بھر میں ماند پڑ گیا۔ میمونہ کی دل کو ٹھنڈ پینچی، وہ ایسی ہی تھی دوسروں کی خوشی میں بھگ ڈالنے والی۔

”آثار تو ایسے ہی بتاتے ورنہ خود سوچو، اتنی طویل مگنی آج کل کے زمانے میں کر کے کون بھول جاتا ہے۔ خیر چھوڑو اب تو تمہاری خالہ مان گئیں

ناں۔ یہ بتاؤ ارم سے بات ہوئی۔“ وہ دل میں گرہ ڈال کر اب موضوع گفتگو تبدیل کر چکی تھی مگر شاملہ کی خوشی پر اراؤں بڑ چکی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی، دوسروں کی نظر سے دیکھنے والی، دوسروں کے ذہن سے سوچنے والی اور دوسروں کی سمجھاائی مٹی بولی بولنے والی۔

نہیں، ارم سے تو کوئی بات نہیں ہوئی۔“ شاملہ نے مجھے دل سے آہستگی سے کہا۔

شمالیہ کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ وہ مچلا سا رقص نہ
جاگے نہ کب اور کیسے شاندار سے انسان کے روپ میں
محو ہو گیا۔ مزید اس کی شخصیت میں چار چاند، سی آئی
ڈی آفیسر کے ٹیک نے لگا دیا۔

ایک تو راوی کے کنارے ہونے پر اور دوسرا ایسے راستے پر موجود ہونے پر جو بیرونی حملہ آوروں کی راہ گزر رہا ہے۔ ایسے میں اس کی اہمیت سے کسی دور میں بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

کی طالبات تھیں اور قلعے کے حوالے سے ایک دوسرے سے چہ گوئیوں میں مصروف تھیں۔

وہ اونچے قد کاٹھ کا نوجوان تھا جو اس کی جانب پشت کیے بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ اس نے سر پر ہلکے بھورے رنگ کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ آسانی رنگ کی شرٹ پر لیڈر کی براؤن سلیمیں جیکٹ میں وہ بے حد منفرد لگ رہا تھا۔ اس کے آس پاس لڑکے، لڑکیاں بیٹھے تھے اور اس سے اس خوب صورت لوک گیت کی فرمائش کر رہے تھے، اس کے قدم وہیں رک گئی۔

”رک کیوں گئیں، چلو بھی سنیں۔“ ماہین نے اسے پکار کر اس کا ارتکاڑ توڑا تھا اور اس کے رے قدم اٹھ گئے۔ وہ پلٹ کر ماہین کے سبک چل دی مگر سامنے ابھی بھی اس دھن کی میٹھاں میں کھوئی ہوئی تھیں کہ اچانک بانسری کی آواز ختم ہوئی۔ اس کی محویت ٹوٹی اور قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ اب کی بار جو آواز فضا میں ابھری اس نے سنبل کے صرف قدم ہی نہیں، دل کی دھڑکنیں بھی روک ڈالیں۔

یار ڈاڑھی عشق آتش لانی ہے
یار ڈاڑھی عشق آتش لانی ہے
دے یار سانو.....

دے دوست سانو لگ گئی بے اختیار
سانو لگ گئی بے اختیار
سینے دے وچ نہ سانی ہے
یار ڈاڑھی عشق آتش لانی ہے
یار ڈاڑھی عشق آتش لانی ہے

اس نوجوان نے پھر سے تان لگائی تھی اور اس کی آواز کی کشش میں سنبل کھوئی چلی گئی۔ بے اختیار سی، وہ ان لفظوں کی گہرائی میں ڈوبتی چلی گئی۔ وہ کم صم سی کھڑی اس نوجوان کی پشت کو تنکے جارتی تھی۔ بس کے اطراف نوجوان لڑکے لڑکیاں سردھنے جا رہے تھے۔ اس میں ہمت نہ تھی شاید، اس خوب صورت آواز سے منہ موڑنے کی۔

”اچھا گارہا ہے ناں، سن لیا، اب چلیں۔“ ماہین نے اسے بازو سے پکڑ کر جھٹکھوڑتے ہوئے کہا تھا۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس سارے اس آواز اور اس بول کا جادو اس پر کیوں نہ چلا تھا۔

پگلی سی سنبل انجان تھی کہ عشق کے بول ہر ایک کے لیے نہیں ہوتے۔ ان کی تاثیر ہر ایک کے دل میں اترنے کے لیے نہیں ہوتی۔ شاہی قلعہ میں اس دن وہ ایک پل سنبل کے دل میں قید ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”آج راحت کون کیا تھا میں نے، جانتے ہو کیا بات ہوئی۔“ وہ رات دیر سے آتا تھا اور چاہے کتنی دیر ہو جائے کھانا وہ ہر رات کھاتا تھا۔ اس وقت بھی جب سارا گھر نیند کی وادی میں جا سویا تھا۔ عفت ارم کے لیے جاگ رہی تھیں۔

”جی بالکل جانتا ہوں۔ میری اور شائلہ کی شادی کی تاریخ پکی کرنے کی بات ہوئی ہے آپ دونوں کے درمیان۔“ وہ چاول کے تلمے بناتا، عفت آرا کے پھیلائے گئے کپڑے پر پانی ڈال رہا تھا۔

”ماہین، تمہیں کیسے پتا؟“ عفت نے حیران سے ہاتھ گلے منہ پر جماتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی ہونے والی بیوگی کال آئی تھی۔“ محترمہ خوب بریں۔“ ارم نے انہیں مزید دوطہ حیرت میں مبتلا کر ڈالا۔

”بریں کیوں بھی، شادی کی تاریخ پکی ہو نا تو خوشی کی خبر ہے۔ اس پر لڑنے کی کیا تنک بھلا۔“ وہ متعجب سی گویا ہوئیں۔

”جب دماغ میں فحور بھر جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ محترمہ کو شکایت ہے کہ آپ سے پہلے اسے شائلہ نے کیوں نہیں بتایا۔ اب خود بتائیں مجھے کب پرتا تھا جو میں اسے بتاتا۔ شائلہ کچھ دنوں سے بہت امپورٹا رویہ رکھنے لگی ہے اور میں سمجھ گیا ہوں۔ یہ سب اس کی کزن میمونہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہی اس کے ذہن میں الٹی سیدھی باتیں ڈالتی ہے۔“ ارم اب پرسوج انداز میں کہہ رہا تھا، وہ جتنی بار بھی راحت خالہ کی طرف گیا تھا۔ میمونہ کے انداز دیکھ کر چونک گیا تھا۔ یہ وہ جاننے کے باوجود کہ ارم اور شائلہ محبت کی مضبوط ڈور سے بندھے ہوئے ہیں، ارم کو اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ تو ارم تھا جو میمونہ

کی حقیقت جان کر اس سے محتاط رہنے لگا تھا ورنہ کوئی اور ہوتا تو کب کا پھنس چکا ہوتا۔

”ایسی بات ہے تو جس دن راحت آئے گی، میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ میمونہ کو حیدر آباد واپس بھجوائے۔ خواہ بھلا شائلہ کا ذہن خراب کر رہی ہے یہ لڑکی۔“ عفت آرا بگڑے مزاج سے بولیں۔

”راحت حالہ کب آ رہی ہیں۔“ ارم کے لیے شائلہ کے حالیہ رویے کے باعث اب ہر بات کی خبر رکھنا بے حد ہو گیا تھا۔

”اُمی بیٹے بلایا ہے، میں نے تمہارے خالہ، خانو کو شائلہ بھی آئے گی ساتھ۔ تمہارے ابا کہہ رہے تھے کہ تینور بھائی اور راحت کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیں۔ اُمی دن باہمی رضامندی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لی جائے گی۔“ عفت آرا اسے مزید تفصیلات فراہم کر رہی تھیں، اس کے لبوں پر

”کونسی جنگل میں جا بھیجیں۔“ اس نے شائلہ سے اہولوں کے ساتھ پیغام بھیجا۔

میری شادی کا خیال ڈال دیا ورنہ وہ تو منگنی کر کے بھول گئی تھیں۔ ارم عفت آرا کو پڑانے سے باز رکھا۔

عفت آرا نے بیچارے سانبل کو پھینکا ہے۔“ وہ کچھ شراکت سے نہیں پڑا اور سانبل نے کی غرض سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو سوبال پر شائلہ کے کئی خطوات روشن تھے۔ ایک ایک پیغام کو باری باری پڑھا، وہی شکوے، شکایتیں، ناراضی..... ایک جھماکے سے شائلہ کی صورت دل کے نہال خانوں سے ابھر کر بند پر دوں پر آدھمکی۔ گہری سانس لڑو پیغاموں کا جواب لکھنے لگا۔

میری وہ شائلہ کہاں جا کھوئی ہے جو میری

ہمت ہوا کرتی تھی۔ جس کی باتوں سے چاہت کی شیرینی چپتی تھی۔ جس کی محبت میری ہمت ہوا کرتی تھی۔“ اتنے سارے پیغاموں کے بعد آدھی رات کو اس کا پیغام شائلہ کے سوبال کی اسکرین پر روشن ہوا تھا۔ آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی، کب سے وہ اکیلی جاگ رہی تھی۔ سارا دن اس کی عقل چوہٹ کر کے میمونہ اس کے برابر میں گدھے، گھوڑے بچ کر سو رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہیں ارم سے بلاوجہ جھگڑے کرنے پر احساسات اسے ملامت کر رہے تھے۔ ایسے میں ارم کے موصول شدہ پیغام نے اس کے اندر رمل چل چلا دی۔ وہ بے چینی سے پیغام کھول کر پڑھنے لگی۔ طمانیت کا احساس اس کے رویں روئیں میں پھیلتا چلا گیا۔ مدھری مسکراہٹ لبوں پر سج گئی۔

”وہ کسی جنگل میں جا بھیجیں۔“ اس نے شائلہ سے اہولوں کے ساتھ پیغام بھیجا۔

میرے دل کی رانی کو واپس میرے پاس بھیج دو۔“ ارم کے شوخ و شنگ سے جواب نے اس کے اندر پھیلی سارے دن کی اضطرابی کیفیت کو اڑھچھوڑ ڈالا تھا۔ وہ اب مطمئن سی ارم سے باتوں میں مشغول تھی۔

”میں میمونہ کی ناں، خواہ بھلا شائلہ کا ذہن خراب کر دے۔“ سوچنے سے اس کی نظر جب منہ پھولے خراٹے لپٹی میمونہ پر پڑی تو بڑا ہڑاہٹ لبوں سے خود جا پھسل۔

”آہ..... کچھ کہا تم نے؟“ اس کی بڑا ہڑاہٹ پر بوکھلا کر اٹھی۔

”کچھ نہیں میری ماں، سو جاؤ آرا۔“ شائلہ کو اس کی اس درجہ بیوگی پر کسی آگلی۔

☆☆☆

”آج گروسری کے لیے گئی تھی وہاں پڑوس والی خاتون عفت آرا سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں بتانے لگیں کہ عفت کے دن ان کے بیٹے ارم کی تاریخ طے ہونے کی رسم ہے۔“ شام کی چائے پیتے ہوئے حبیب نے اشتیاق عالم تک اطلاع

وہ اونچے قد کاٹھ کا نوجوان تھا جو اس کی جانب پشت کیے بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ اس نے سر پر ہلکے بھورے رنگ کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ آسانی رنگ کی شرٹ پر لیڈر کی براؤن سلیمیں جیکٹ میں وہ بے حد منفرد لگ رہا تھا۔ اس کے آس پاس لڑکے، لڑکیاں بیٹھے تھے اور اس سے اس خوب صورت لوک گیت کی فرمائش کر رہے تھے، اس کے قدم وہیں رک گئی۔

”رک کیوں گئیں، چلو بھی سنبل۔“ ماہین نے اسے پکار کر اس کا ارتکاڑ توڑا تھا اور اس کے رکنے قدم اٹھ گئے۔ وہ پلٹ کر ماہین کے سنگ چل دی مگر ساعتیں ابھی بھی اس صحن کی منہاس میں کھوئی ہوئی تھیں کہ اچانک بانسری کی آواز سنی گئی۔ اس کی خوبیت ٹوٹی اور قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ اب کی بار جو آواز فضا میں ابھری اس نے سنبل کے صرف قدم ہی نہیں، دل کی دھڑکنیں بھی روک ڈالیں۔

یار ڈاڑھی عشق آتش لانی ہے
یار ڈاڑھی عشق آتش لانی ہے
دے یار سانو.....

دے دوست سانو لگ گئی بے اختیاری
سانو لگ گئی بے اختیاری

سینے دے دوج نہ سانی ہے
یار ڈاڑھی عشق آتش لانی ہے
یار ڈاڑھی عشق آتش لانی ہے

اس نوجوان نے پھر سے تان لگائی تھی اور اس کی آواز کی کشش میں سنبل کھوئی چلی گئی۔ بے اختیار سی، وہ ان لفظوں کی گہرائی میں ڈوبتی چلی گئی۔ وہ کم صم سی کھڑی اس نوجوان کی پشت کو تنکے جارتی تھی۔ جس کے اطراف نوجوان لڑکے لڑکیاں سردھنے جا رہے تھے۔ اس میں ہمت نہ تھی شاید، اس خوب صورت آواز سے منہ موڑنے کی۔

”اچھا گارہا ہے نال، کن لیا، اب چلیں۔“ ماہین نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس سارے اس آواز اور اس بول کا جادو اس پر کیوں نہ چلا تھا۔

پلی سی سنبل انجان تھی کہ عشق کے بول ہر ایک کے لیے نہیں ہوتے۔ ان کی تاثیر ہر ایک کے دل میں اترنے کے لیے نہیں ہوتی۔ شاہی قلعہ میں اس دن وہ ایک پل سنبل کے دل میں قید ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”آج راحت کو فون کیا تھا میں نے، جانے ہو کیا بات ہوئی۔“ وہ رات در سے آتا تھا اور چاہے کئی دیر ہو جائے تھا وہ صبر سے انتظار کرتا تھا۔

بجی جب سارا گھر نیند کی دلدلی میں جا سوتا تھا۔ غٹ ارقم کے لیے جاگ رہی تھیں۔

”جی بالکل جانتا ہوں۔ میری اور شائلہ کی شادی کی تاریخ پکی کرنے کی بات ہوئی ہے آپ دونوں کے درمیان۔“ وہ چاول کے لقمے ہاتھ غٹ آرا کے پھیلانے گئے جس پر پانی ڈال رہا تھا۔

”ماہین، تمہیں کیسے پتا؟“ غٹ نے حیران سے ہاتھ کھلے منہ پر جھاتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی ہونے والی بہو کی کال آئی تھی۔“ محترمہ خوب بریں۔“ ارقم نے انہیں مزید دلدلی حیرت میں مبتلا کر ڈالا۔

”بریں کیوں بجھی، شادی کی تاریخ پکی ہوئی خوشی کی خبر ہے۔ اس پر لڑنے کی کیا تنگ بھلا۔“

”جب دماغ میں فور پھر جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ محترمہ کو شکایت ہے کہ آپ سے پہلے اسے میں نے کیوں نہیں بتایا۔ اب خود بتائیں مجھے کہ پتا تھا جو میں اسے بتاتا۔ شائلہ کچھ دنوں سے بہت انجور سا رویہ رکھنے لگی ہے اور میں سمجھ گیا ہوں۔ یہ سب اس کی کزن میمونہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہی اس کے ذہن میں الٹی سیدھی باتیں ڈالتی ہے۔“ ارقم اب پر سوچ انداز میں کہہ رہا تھا، وہ جتنی بار بھی راحت خالہ کی طرف گیا تھا۔ میمونہ کے انداز دیکھ کر چونک گیا تھا۔ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ ارقم اور شائلہ محبت کی مضبوط ڈور سے بندھے ہوئے ہیں، ارقم کو اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ تو ارقم تھا جو میمونہ

کی حقیقت جان کر اس سے محتاط رہنے لگا تھا ورنہ کوئی اور ہوتا تو کب کا پھنس چکا ہوتا۔

”ایسی بات ہے تو جس دن راحت آئے گی، میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ میمونہ کو حیدر آباد واپس بھجوائے۔ خواہ خواہ شائلہ کا ذہن خراب کر رہی ہے یہ لڑکی۔“ غٹ آرا بگڑے مزاج سے بولیں۔

ارقم کے لیے شائلہ کے حالیہ رویے کے باعث اب ہر بات کی خبر رکھنا بے حد ہو گیا تھا۔

”اکیس بجے بلایا ہے، میں نے تمہارے خالہ، خالو کو شائلہ بھی آئے گی ساتھ۔ تمہارے ابا کہہ رہے تھے کہ تیور بھائی اور راحت کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیں۔ اسی دن باہمی رضامندی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لی جائے گی۔“ غٹ آرا اسے مزید تفصیلات فراہم کر رہی تھیں، اس کے لبوں پر دلدلی سی مسکان سج گئی۔

”شکر ہے میرے اللہ۔ میری ماں کے دل میں میری شادی کا خیال ڈال دیا ورنہ وہ تو مفتی کر کے بھول گئی تھیں۔“ ارقم غٹ آرا کو چڑانے سے باز رکھتا تھا۔

”مجل جہت بد معاش۔ ماں کو چھیڑتا ہے۔“ غٹ آرا نے پیار سے اس کے کان کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ بھی شرارت سے ہنس پڑا اور سونے کی غرض سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو موبائل پر شائلہ کے کئی پیغامات روشن تھے۔ ایک ایک پیغام کو باری باری کھول کر پڑھا، وہی شکوے، شکایتیں، ناراضی.....

ساری باتیں بے معنی کی۔ اس نے آنکھیں موند لیں، ایک جھماکے سے شائلہ کی صورت دل کے نہیں خانوں سے ابھر کر بند پر دوں پر آدھمکی۔ گہری سانس کے ساتھ اس نے آنکھیں دھوئیں اور ان سب تنقیر زندہ پیغاموں کا جواب لکھنے لگا۔

”میری وہ شائلہ کہاں جا کھوئی ہے جو میری

ہمت ہوا کرتی تھی۔ جس کی باتوں سے چاہت کی شیرینی چپکتی تھی۔ جس کی محبت میری ہمت ہوا کرتی تھی۔“ اتنے سارے پیغاموں کے بعد آدھی رات کو اس کا پیغام شائلہ کے موبائل کی اسکرین پر روشن ہوا تھا۔ آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی، کب سے وہ اکیلی جاگ رہی تھی۔ سارا دن اس کی عقل چوٹ کر کے میمونہ اس کے برابر میں گدھے، گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہیں ارقم سے بلا وجہ جھگڑے کرنے پر احساسات اسے ملامت کر رہے تھے۔ ایسے میں ارقم کے موصول شدہ پیغام نے اس کے اندر تل چل بھادی۔ وہ بے چینی سے پیغام کھول کر پڑھنے لگی۔ طمانیت کا احساس اس کے رویں رویں میں پھیلتا چلا گیا۔ مدھری مسکراہٹ لبوں پر سج گئی۔

”وہ کسی جنگل میں جا چھپی۔“ اس نے شرارتی سے ایویشن کے ساتھ پیغام بھجوا۔

”سنو شیرینی! اسے جنگل میں واپس جاؤ اور میرے دل کی رانی کو واپس میرے پاس بھیج دو۔“ ارقم کے شوخ و خشک سے جواب نے اس کے اندر پھیلی سارے دن کی اضطرابی کیفیت کو اڑ چھو کر ڈالا تھا۔ وہ اب مطمئن سی ارقم سے باتوں میں مشغول تھی۔

”یہ میمونہ بھی ناں، خواہ خواہ میرا دماغ کھاتی ہے۔“ سوتے سے اس کی نظر جب منہ کھولے خرائے لیتی میمونہ پر پڑی تو بڑبڑاہٹ لبوں سے خود جا پھسلی۔

”آں..... کچھ کہا تم نے؟“ اس کی بڑبڑاہٹ پر پوکھلا کر اٹھی۔

”کچھ نہیں میری ماں، سو جاؤ آرام سے۔“ شائلہ کو اس کی اس درجہ چونکی نیند پر ہنسی آ گئی۔

☆☆☆

”آج گرومیری کے لیے گئی تھی وہاں پڑوس والی خاتون غٹ آرا سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں بتانے لگیں کہ غٹ آرا کے دن ان کے بیٹے ارقم کی تاریخ طے ہونے کی رسم ہے۔“ شام کی چائے پیتے ہوئے حبیبہ نے اشتیاق عالم تک اطلاع

پہنچائی۔

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔ اللہ مبارک کرے ان کے گھر خوشیاں۔“ اشتیاق عالم نے رسمی انداز میں دعا دی۔

”صرف دعائیں دینے کے لیے خبریں نہیں سنارہی ہوں، آپ کو کچھ فکر اپنے گھر کی بھی کرنی چاہیے۔“ جائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے حبیبہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”پھر کس لیے سنارہی ہیں بیگم صاحبہ!“ اشتیاق صاحب حبیبہ کی جانب متوجہ ہو کر بولے، جانتے تھے کہ اب کچھ اہم بات کرنے والی ہیں۔

”سنبھل کے بارے میں بھی ہمیں کچھ سوچنا چاہیے۔ اس کی تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ شوقیہ ٹیچری بھی گزری۔ اب ابھی سے اس کے لیے سوچیں گے تو کل کہیں اس کا رشتہ ہوگا نال۔“ بیٹی کی محبت میں چور حبیبہ فکر مند سی تھی کہہ رہی تھیں۔ اشتیاق عالم ان کی بات پر مسکرا اٹھے۔

”بات تو ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ حبیبہ! جلیں پھر آپ بھی اپنی کوشش شروع کیجیے اور اللہ سے اچھی امید رکھیں۔ نصیب بے شک اس کے ہاتھ میں ہے مگر دعاؤں کا اختیار اس نے ہمیں دیا ہے اور دعائیں ہی تو ہیں جو قدریریدنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ان شاء اللہ سب اچھا ہوگا۔“ اشتیاق صاحب بہت پرسکون سے انداز میں بول رہے تھے اور ان کے الفاظ حبیبہ کی ممتا کو بھی ٹھنڈ پھنڈا گئے۔

”ان شاء اللہ۔ آپ کی بات ہوئی سنبھل سے، کہاں تک پیچیدیں صاحب زادی صاحبہ!“ حبیبہ کو خیال گزرا۔

”آج صبح اسلام آباد پہنچے ہیں وہ لوگ۔ سارا دن گھوم پھر کر کل صبح مری کے لیے نکلیں گے۔ کہہ رہی تھی لاہور میں بے حد مزہ آیا۔ تمام تاریخی مقامات دیکھے اس نے۔ واگہ بارڈر پر بھی گئی تھی، کہہ رہی تھی کہ بہت ہی پُر جوش لمحات گزرے وہاں۔“ بیٹی کی بتائی ہوئی تفصیل اب وہ بیگم کو سنارہے تھے۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اللہ ان سب کو خیر و عافیت سے گھر واپس لائے۔“ حبیبہ چائے کے کپ اٹھا کر پین کی جانب بڑھتے ہوئے دعا گو ہوئیں۔

”آمین۔۔۔۔۔“ اشتیاق صاحب حبیبہ کے جانے کے بعد پھر سے ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے۔ ویسے بھی وہ ایک اچھے سامع تھے۔ بیوی اور ٹی وی دونوں کی خوب اچھی طرح سنتے۔

وہ اسلام آباد مونیٹمنٹ سے نکل کر میٹرو سٹیشن پر پہنچے۔ اس کا پاؤں مزہ اور وہ لڑکھڑکاتے ہوئے گزرتے تھے کہ کسی کے مضبوط ہاتھوں اسے تھام لیا۔

اس نے ان ہاتھوں کے سہارے خود کو سنبھالا اور بے اختیار نگاہ اٹھا کر اپنے ہمدرد کو دیکھا۔ وہ انہماکی خوش شکل نوجوان تھا جو اس کی جانب پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دلی دلی سی مسکراہٹ تھی تھی، اس کی شخصیت ہمیں سے لفظوں والی نہ تھی۔ وہ پروقا تھا، پراثر، متاثر کن شخصیت کا حامل تھا مگر اس کی آنکھیں میں خوف نص شرارت نے سنبھل کر جزیرہ کر دیا تھا۔

”خالق آپ شکر یہ ادا کرنا چاہ رہی ہیں۔“ اس نوجوان نے سنبھل کی مشکل آسان کی۔

”جی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ شکر یہ۔“ وہ اعتماد سے عادی لڑکی تو ہرگز نہ تھی مگر فی الوقت وہ کچھ ایسا ہی خود کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کے شکر یہ ادا کرنے پر وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے مڑ کر جاتا دیکھتی رہ گئی۔

”چوت تو نہیں آئی۔“ ماہین کب اس کے عقب میں آکھڑی ہوئی اسے علم نہ ہو سکا۔

”نہیں، پاؤں مڑنے سے بچ گیا۔ سب بیٹھ گئے گاڑی میں؟“ اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بیٹھ گئے، تم بھی چلو۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ ماہین نے احتیاط اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ وہ صرف اس کی سائیچ پیچر ہی نہیں بلکہ اچھی دوست بھی تھی۔ آج صبح وہ لوگ اسلام آباد پہنچے تھے اور اس کے بعد مسلسل مارگلہ کی پہاڑیوں میں گھوم

رہے تھے۔ اب شام ڈھلنے کو تھی، وہ لوگ واپس ہوٹل پہنچ گئے تمام طالبات کو ان کے کمرے میں بخیر و عافیت پہنچا کر کمنبل اور ماہین میٹنگ ایریا میں مسز صدیقی کے بلانے پر پہنچ گئیں۔

”ہمارے ٹرپ کا الحمد للہ آج چوتھا روز بھی بخیر و عافیت گزر گیا۔ کل صبح ہی ہمیں مری کے لیے نکلنا ہے۔ اب لوگ بچوں کو مطلع کر کے بیٹھ گئے اور وہ وقت گزار رہے ہیں۔“ داؤد بھائی نے مری کے تمام انتظامات کو سنبھال کر کہا۔

”اب لوگ بس بچوں پر توجہ مرکوز کر رہے ہیں۔ ان کے لیے کچھ اور کچھ اوقات بچیاں چاہتے ہیں۔“ مسز صدیقی ٹرپ کی تفصیلات کے حوالے سے ان سب کو بریف کر رہی تھیں۔

”جی ہاں احساس ہے کہ اب ہم جن علاقوں میں جائیں گے، وہاں خوب صورتی کے ساتھ ساتھ بعض خطرات بھی ہیں۔ اسی لیے وہاں احتیاط کی زیادہ ضرورت ہے۔“ مسز صدیقی کی بات کا جواب داؤد بھائی نے دیا تھا۔

”مسز صدیقی! وہ علاقے خطرناک ہیں۔“ اس نے چونکتے ہوئے سوال دیا۔

”اُن کی بات نہیں مسز سنبھل! مگر دراصل وہ علاقے پہاڑی علاقے ہیں۔ وہاں کا مزاج شہروں سے کافی مختلف ہے۔ پھر ہم لوگوں کے لیے احتیاط کرنا تو بنتا ہے ناں۔“ داؤد بھائی نے نرمی سے جواب دیا۔

”یہی ان کا خاص انداز تھا۔ سنبھل اور ماہین ان کی بات سنبھلی تھیں۔ اب وہ دن بھر کی سیاحت پر بات کر رہے تھے۔ سنبھل کی نظر ہوٹل کے اندر داخل ہونے والوں کے گروپ پر پڑی۔ ان میں سے ایک شخص نے سنبھل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اپنی گہری نگاہ اس لڑکے کی طرف مرکوز کر رہی تھی۔ وہ اپنی گہری نگاہ اس لڑکے کی کوئی نامی سے پیوستہ دلچسپ قصہ سنارہی تھیں۔

☆☆☆

”یار تجھے جس لوکیشن کی تلاش ہے، وہ آخر کب مل کر دے گی۔“ زوار نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”واقعی یار! حد ہوگئی۔ لاہور کے ساتھ ساتھ اسلام آباد بھی چھان مارا، اب اور کہاں جائیں۔“ یہ محسن تھا جو بے زار ہوا بیٹھا تھا۔

”مری۔۔۔۔۔ کل صبح مری جائیں گے۔ مجھے یقین ہے میری من پسند لوکیشن وہیں ملے گی۔“ وہ اطمینان سے گویا ہوا اور اس کے اطمینان نے ان سب کے دلوں کو جلا کر رکھ دیا۔

”یہی یقین تمہیں اسلام آباد آنے سے پہلے بھی تھا کہ یہی ہے وہ جگہ جہاں مجھے اپنے ویڈیو سائیک کے لیے خاص لوکیشن مل جائے گی۔“ زوار ٹھیک ٹھاک چڑ گیا تھا۔

”تم دونوں مجھے ایک بات بتاؤ، اس سفر پر تم لوگوں کا کوئی خرچا آرہا ہے نہ کوئی وقت ضائع ہو رہا ہے بلکہ مجھ سے زیادہ تفریح کر بھی تم لوگ رہے ہو یہاں پر، پھر یہ جھگڑا ویڈیوں کی طرح طے مارنے کا شوق کس خوشی میں پورا ہو رہا ہے۔“ اس بار شاور نے کڑے تیور سے ان دونوں کی کلاس لی۔

”بھائی دیکھو، گھومنا پھرنا، موج مستی اپنی جگہ مگر وقت پر ویڈیو نہ بنی تو نقصان ہمارا اپنا ہی ہے۔ اس لیے اب خیالی تصورات پر ذرا کپور و ماز کر دو اور اب مری میں جگہ پسند کر ہی لیتا۔ ہمارے معاہدے کا ایک وقت مقررہ ہے اور مقرر وقت کے اندر اندر ہم نے گانے کی ویڈیو بنانی کتنی ہے اور اب تک تم نے لوکیشن ہی اوکے نہیں کی بات کو سمجھو یار۔“ زوار اس بار سنجیدہ ہو چلا تھا۔ شاور کو اس کی بات سمجھ آئی گئی۔

”چلو یار! پہلے کھانا منگواؤ۔ پھر بات کرتے ہیں اس موضوع پر۔“ محسن کو بھوک نے پریشان کر رکھا تھا۔

زوار ویڈیو کو بلا کر کھانے کا آرڈر دینے لگا۔ شاور نے ارد گرد کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک طاؤزہ نگاہ ڈالنے والے ہال کے چاروں اطراف دوڑائی اور پھر اس کی نظر میٹنگ ایریا سے باہر آئی ہوئی اس

انجان لڑکی پر ٹھہر گئی۔ جس سے آج شام اس کا آسنا سامنا ہوا تھا۔
”سنہری لڑکی۔“ اس کے لب دہسے سے کہہ اٹھے۔

ڈھلتے آفتاب کی مدھم کرنوں میں جب اس نے پہلی مرتبہ اس لڑکی کو دیکھا تھا تو تب بھی اس کا دل بے اختیار کہہ اٹھا تھا۔

”سنہری لڑکی۔“ وہ واقعی سنہری تھی۔ اس کی رنگت گندم کی سنہری ڈالی جیسی سنہری تھی۔ اس کی آنکھیں اور بال بھورے تھے۔ اس کی توجہ کہیں اور مرکوز تھی اور اس کا پیر مڑا تھا۔ وہ بے خود سا اس کی جانب متوجہ تھا اور اس کے پیر مڑتے ہی وہ اسے تمام پیشہ تھا۔ کتنی حیرانی تھی ان بھوری آنکھوں میں، وہ دچکی سے دیکھ گیا اور ابھی بھی وہ اسے میڑھیاں چڑھتے، اوپر جاتے بے خود سا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

پینتیس سالہ نور محمد کے دل میں اگر کوئی خوف چھپتا تھا تو وہ اس پر اسرار حویلی کا خوف تھا۔ جو جنگل کے پیچھے تنہا تھا کھڑی اسے بھیانک چڑیل ہی لگتی تھی۔ پول تو کوئی بھی اس حویلی کا رخ نہ کرتا اور اگر کبھی کوئی بھنگ کر یہاں انجانے میں چلا بھی گیا تو وہ لوٹ کر واپس نہ آیا۔ نور محمد کے دل میں کئی ایسے لوگ بستے تھے جو اس بھیانک حویلی کے اسرار میں گھوپکے تھے۔

وارث..... اس کی نوعمری کا ساتھی تھا۔ ان سب دوستوں کی آپس میں شرط لگی تھی، جو اس حویلی میں ایک گھنٹہ بتا کر آئے گا اسے وادی کا سب سے بہادر نوجوان گردانا جائے گا اور پر جوش سے وارث نے ٹھان لیا تھا کہ وہ اس حویلی میں گھنٹہ بتا کر ضرور واپس آئے گا۔ سورج ڈھلتے ہی وارث شرط کے مطابق اس حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سب یار دوست چچا شکور کے ڈھابے پر بیٹھے گھنٹہ بتینے کا انتظار کر رہے تھے۔ گھنٹہ بیت چکا مگر وارث نہ آیا۔ کافی وقت گزر گیا تو پریشان ہو کر وہ — لوگ بھی

وہاں سے اٹھ گئے۔ ان کے قدموں کا رخ حویلی کی جانب تھا۔ ڈرے، سب سے خوف زدہ قدم..... سنائے سے پڑ حویلی کے کئی حصے بے حد ناتواں ہو چکے تھے اور کسی بھی وقت منہدم ہو سکتے تھے۔ وہ چاروں حویلی کے اندر داخل ہو گئے، کچھ بھی نہ تھا۔ جس سائیل سائیل کرتی ہوا، دہشت زدہ، بکڑیوں کے جال سے لدے چھت و بام اور دھول مٹی سے لٹی ہوئی زمین۔ وہ چاروں وارث کے ساتھ تھے۔ یہ حصہ گلے حصوں سے زیادہ نیت حصے میں جا پہنچے۔ یہ حصہ گلے حصوں سے زیادہ نیت ناک تھا۔ یہاں کی خاموشی میں اسرار چھپا تھا۔ ایک لمبی سی راہداری تھی اور اس راہداری میں ٹھلنے والا ہر دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ ان چاروں نے کھولنے کی بے حد کوشش کی مگر ان دروازوں کو زنجیروں سے باندھا گیا تھا۔

”اگر یہ زنجیر سے بندھے دروازے ہیں تو یقیناً وارث ان کے اندر نہ جا سکا ہوگا۔“ ان میں سے ایک دوست نے خیال ظاہر کیا۔

”ہمیں سارے دروازے چیک کر کے جا نہیں۔“ نور محمد نے کہا۔ وہ لوگ حیران تھے کہ حویلی خالی ہے تو وارث پھر کہاں گیا۔ وہ حویلی میں آیا ہی تھا کہ نہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ حویلی میں نہ آیا ہو اور کہیں اور چاچھا ہو اور ان سب پر بعد میں ظاہر کرے کہ وہ اتنی دیر حویلی میں رہ کر آیا ہے۔ اسی میں ونچ میں مبتلا وہ چاروں ہر دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتے رہے اور پھر ایک دروازہ کھل ہی گیا۔

کمرے کا منظر اس قدر وحشت ناک تھا کہ ان چاروں کی چیخوں سے حویلی گونج اٹھی۔

☆☆☆
ان کی کوسٹر ناگن کی طرح ٹل کھاتے پہاڑوں کی تراش خراش سے بنائے گئے ان پتلی سڑکوں پر جو سفر تھی۔ ایک جانب بلند و بالا پہاڑ تو دوسری جانب گہری کھاٹی۔ جہاں سبک روی سے بہتا دریا نے نیام موجود تھا یعنی ایک طرف بادلوں کو چھوٹی بلندی، تو دوسری جانب اتھاہ گہرائی۔ جو بد قسمتی سے اس کی پناہ

میں آجائے تو موت کی وادی استقبال کو بائیں واکے اس کی منتظر ہوتی۔ یہ خوف ناک حقائق اپنی جگہ مگر جو یہ سین نظارے تھے وہ نظروں کو خیرہ کر رہے تھے۔ قدرت انہی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ وہ ٹھنڈی کے شیشے پر چہرہ لگائے خاموشی سے چتریلے پہاڑوں کو سرسبز گزرتا دیکھ رہی تھی۔ کوسٹر میں موجود لڑکیاں جو شیلے جذبات کے ساتھ ان خوب صورت مناظر کی طرف متوجہ تھیں۔ اس پر ہیبت طاری تھی۔ ایسا پہاڑوں کی خوب صورتی سے زیادہ ان کی ہیبت کی آواز دے ڈرا رہی تھی۔ سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ روشن تھا اور سفر ابھی آدھا گزرا تھا۔

کچھ دیر بعد ان کی گاڑی ایک پر فضا مقام پر رکی۔ یہ مری تو نہ تھا مگر وادی کو ہمساری شروعات اس حصے کے تھے ہوتی تھیں۔ وہاں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں، جہاں کھانے پینے کی اشیاء بکتی تھیں۔ داؤد ٹھکانا سب کے لیے گرما گرم پکڑیوں کے ساتھ کھانے کی چائے لے کر آئے تھے، وہ پکڑی بے حد ذرا تیار تھے اور کھانے کی سہولتیں بھی۔ سفر کی سہولتیں ان سڑکوں کے جسموں سے غائب ہو گئی، وہ سب سب تازہ دم ہو کر وادی کو ہمسار میں داخل ہونے سے تیار تھے۔ ان پہاڑوں کا خوف اب سنبھل کے اندر سے نکلتا جا رہا تھا۔ قدرت کی رعنائیاں اب اسے اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں۔ چائے کا کپ داؤد نے اپنے نظارے کی جانب متوجہ ہوئی مگر ایک خوش گوار حیرت نے اس کے وجود کا یک دم احاطہ کر ڈالا۔ ان کی گاڑی کے قریب ایک عجیب آرکی تھی اور اس کی سائیل کے عالم میں چمکی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا وہ شخص جس پر نگاہ بے باک تھی اور ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ سنبھل کا بوسہ تھا، وہ کونسی بے ترتیب سی تھیں۔ آثار کچھ اچھے نہ تھے، دل کی کاغذ شہ تھا۔ سنبھل نے بے اختیار

منہ موڑ لیا۔

شاور نے بھی مسکراہٹ دہائے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ بہت سنا ہے آنکھوں کی آنکھ پھولی کے بارے میں۔ اس کھیل سے آج خود واسطہ پڑا تو مزہ آنے لگا۔ اسے بھی اچھا لگ رہا تھا اس سنہری لڑکی سے نظریں ملانا۔

کوسٹر چل پڑی تھی، رخ وادی کو ہمساری جانب تھا۔ مسافر تو شاور بھی اسی راہ کا تھا مگر ان لوگوں کا پلان یہاں کچھ دیر وقت گزارنے کا تھا۔ ”کیا وادی کو ہمسار اتنی مختصر ہوگی کہ اس کا سامنا پھر اس اجنبی سے ہو سکے۔“ دل نے چپکے سے پوچھا تھا۔ ”اے کاش ایسا ہو۔“ اس کے لیوں پر خواہش چلی۔

مزید ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ وادی کو ہمساری بلندی پر واقع مال روڈ پر جا پہنچے تھے۔ پرانے پوسٹ آفس کی ڈھلتی عمارت کے پاس ان کی کوسٹر رک گئی تھی۔ وہاں سے اتر کر انہیں پیدل جانا تھا۔ یہی دستور تھا وہاں کا مگر خوش آئند بات یہ تھی کہ صرف دس منٹ کی مسافت پر وہ مال روڈ کے بازار کے پیچھے جا پہنچے مگر وہ چڑھائی کا راستہ تھا۔

داؤد بھائی نے وہاں سامان اٹھانے والوں کو بلا رکھا تھا۔ ان سب کا سامان ٹرائی میں رکھ کر سامان اٹھانے والوں کی معیت میں وہ چڑھائی پر چڑھنے لگے۔

مابین طالبات کے ایک گروپ کو لیڈ کر رہی تھی تو دوسرے گروپ کو سنبھل اور تیسرے گروپ کو مسز صدیقی اور داؤد بھائی ان سب کے مشترکہ لیڈر تھے۔ کچھ لمحوں میں مال روڈ کی رونقیں ان پر آشکار ہوتی چلی گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس وقت کسی دور افتادہ پہاڑی چوٹی پر ایسی آبادی میں آ گئے ہیں۔ وہاں بہترین دکانیں تھیں۔ سچ میں چوڑی سڑک اور ان کے اطراف بڑی بڑی بہترین دکانیں، جن میں زرق برق بلوسات، شال، اوڑھنیاں، کٹی ہوئی تھیں۔ داؤد بھائی نے ہول کی بنگ پہلے کرائی

تھی اور وہ ہوٹل مال روڈ کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ وہ لوگ اپنا سامان اپنے کمروں میں رکھ کر فریش ہونے لگے۔ سنبھل کمرے سے منسلک راہداری میں آکھڑی ہوئی۔ وہاں بالکنی سے وادی کے بالائی حصے کا نظارہ نظر آتا تھا۔ کچے کچے، چھوٹے چھوٹے مکان، ہرے بھرے درخت، ہر سو ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ آکھڑوں کو سکون عطا کر دینے والا نظارہ تھا وہ اس میں کھوٹی چلی گئی کہ اچانک اس کا فون بج اٹھا۔

”اچھا تو مری پہنچ گئے تم لوگ۔ کیا لگا مری پھر؟“ حبیبہ بڑا اشتیاق لے کر میں پوچھ رہی تھیں۔ کتنی دیر سے وہ کل مال داری تھیں اب جا کر سکنتز ملے تو ان کی سنبھل سے بات ہو رہی تھی۔

”اچھا اچھا، ابھی ابھی مری پہنچے ہو۔ سفر کیا رہا؟ کچھ کھانا وانا کھایا بھی ہے یا نہیں؟“ وہ اب فکر مند ہو چھ رہی تھیں۔

”ہاں، ہاں میں اور تمہارے بابا جان بھی ٹھیک ہیں۔ بس اکیلے بیٹھے رہتے ہیں سارا دن۔ تم ہوتی تھیں تو گھر میں رونق رہتی تھی، اب تو سارا گھر سانسیں کرتا رہتا ہے۔“ وہ اس اپنی پتھاری تھیں۔

”ہاں ہاں جانتے ہیں مجھے گھر سے باہر، اسی دن تو گرومیری کے لیے گئی تھی میں۔ پڑوس والی خاتون سے ملاقات ہوئی، بتا رہی تھیں کہ ان کا بیٹا ہے ناں، آج شادی کی تاریخ پکی ہونے جا رہی ہے۔ ارے وہی ناں ارم! اس کی بات کر رہی ہوں میں، ہاں ہاں ارم کی..... ہیلو ہیلو..... سنبھل۔“ بات ابھی مکمل نہ ہوئی تھی حبیبہ کی کہ سنبھل کی آواز آنا بند ہو گئی۔

”ارے سکنتز کا مسئلہ ہوگا۔ رابطہ منقطع ہو گیا ہوگا۔ حبیبہ ذرا ایک کام تو کریں، سنبھل کی رائٹنگ ٹیبل پر جا کر دیکھیں ذرا، وہاں کچھ ٹائپ شدہ کاغذات ایک ڈائری میں رکھے ہوں گے میں نے کل ہی رکھے ہیں۔ وہ کاغذات ذرا لیٹی آئیے گا۔“ ان کی ہیلو ہیلو کی پیش کیا۔

حبیبہ ”جی اچھا“ کہہ کر اپنا موبائل واپس رکھ کر

سنبھل کے کمرے میں چلی آئیں۔ رائٹنگ ٹیبل کی سطح پر انہیں نہ ڈائری نظر آئی اور نہ ہی صفحات۔ وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دروازہ کھول بیٹھیں، دروازہ کھلتے ہی کچھ صفحات ہوا سے پھڑپھڑائے۔ حبیبہ کی نگاہ ان پھڑکتے صفحات پر پڑ گئی۔

”یہی مانگ رہے ہوں گے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی ان صفحات کو دروازے سے نکال کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

”یہ لیے جناب، اسے صفحات۔“ حبیبہ نے ان صفحات کو سرکراتے ہوئے اشتیاق عالم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے آپ کو آج فوراً صفحات مل گئے ورنہ تو دو تین چکر میں کچھ ڈھونڈ کر لانے کی عادی ہوں آپ۔“ اشتیاق عالم بیگم کو چھینٹنے سے باز نہ آئے۔

حبیبہ ”ہونہ“ کر کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اشتیاق عالم نے عینک لگا کر ان صفحات کی ورق گردانی شروع کر دی۔ جوں جوں وہ پڑھتے جاتے چہرے کی رنگت بدلتی جاتی۔ یہاں تک کہ ان کے چہرے کی رنگت متغیر ہوتی چلی گئی اور ہاتھ کھپکھپانے لگے۔

”حبیبہ! یہ کیا ہے؟“ انہوں نے کانپتے ہوئے سانسوں سے بیگم کی جانب سوال اچھالا۔

”آپ نے جو صفحات منگوائے تھے یہ وہی صفحات ہیں۔“ حبیبہ کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر پڑی تھیں، انہوں نے میاں کے چہرے کی جانب دیکھے بغیر ہی جواب دے ڈالا۔

”اسے پڑھیے ذرا آپ، پھر بتائیے کہ یہ کیا ہے؟“ اشتیاق عالم کے لہجے نے انہیں چونکا ڈالا۔

صفحات کا پلندہ ان کے ہاتھوں سے لے کر انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ چہرے کی رنگت اڑنے کی باری اب حبیبہ کی تھی۔

”یہ..... یہ تو محبت نامیہ ہے..... ارم کے نام سے لکھا ہوا ہے اور..... اور ارم کی تو آج تاریخ ملے ہوئے والی ہے۔“ لفظ حبیبہ کے زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ انہوں نے پریشان کن انداز میں

اشتیاق عالم کی جانب دیکھا۔ وہ سردنوں ہاتھوں سے حقانے بیٹھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

”مبارک ہو رحمن بھائی، مبارک ہو عفت آباد۔“ تیمور حسن نے رحمن احمد سے گلے لگتے ہوئے مبارک سلامت کی صدا بلند کی۔ ارم اور شامکہ کی تاریخ ملے ہوئے تھی۔ دو مہینے بعد نکاح، رخصتی اور ویسے کی رخصتی ہو چکی تھی۔

”آپ کو بھی بہت مبارک ہو بھائی صاحب۔“ رحمن احمد نے کر آئی ہوں۔“ عفت خوشی سے کہتی تھیں رحمن احمد نے چلی گئیں۔

”ارے رحمن! ذرا غزالہ کو فون لگاؤ میں اسے اس کے لاڈلے بھانجے کی تاریخ پکی ہونے کی خوشخبری تو سنا دوں۔“ اماں جی کو بروقت بیٹی کی یاد تازہ ہوئی۔ غزالہ اپنے میاں کے ساتھ لاہور میں رہائش پزیر تھیں۔

”یہ تو بھی سب منہ میٹھا کر اور میری پیاری بہو کہاں ہے۔ راحت! ذرا شامکہ کو تو اب یہاں بلا لو۔ اسے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے مٹھائی کھلاؤں گی۔“ عفت ارم کی طرف سے لبوں پر مسکراہٹ لے کر آئی۔

”آپا آپ ہی کی بیٹی ہے۔ آپ خود اندر سے شامکہ کو بلانے لیں۔ راحت نے مسکرا کر کہا اور عفت اندر کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ فاسکی رنگ کے مختصر سے انگریشی لباس زیب تن کر کے ٹراؤزر اور نیٹ کے دوپٹے کی عفت آرم کے نام سے گلے سے لگایا، ماتھے کو بوسہ دیا اور مٹھائی سے منہ میٹھا کر آیا۔ تب ہی نظر اچانک عفت کی طرف پڑا۔

”یہ تو بھی، تم بھی آئی ہو تو منہ میٹھا کر لو۔“ ایک ٹھٹھکیا ہوا جاسن عفت آرم نے میمونہ کے منہ میں لپٹ لپٹ کر دیا۔ میمونہ اس تو بین آمیز جملے اور گلاب جاسن کی باتوں کو سننے کے انداز پر تلملا کر رہ گئی۔

”میں اماں جی! آپ بھی منہ میٹھا کریں۔“

”مگر..... مگر اس کی تو آج تاریخ پکی ہونے کی رسم ہے۔ سب مہمان آئے ہوں گے، ہم کس طرح جا کر سب کے سامنے یہ خطوط رکھ چھوڑیں۔ اس سے تو ہماری بیٹی کی بھی بدنامی ہوگی ناں۔“ اشتیاق عالم

”مگر..... مگر اس کی تو آج تاریخ پکی ہونے کی رسم ہے۔ سب مہمان آئے ہوں گے، ہم کس طرح جا کر سب کے سامنے یہ خطوط رکھ چھوڑیں۔ اس سے تو ہماری بیٹی کی بھی بدنامی ہوگی ناں۔“ اشتیاق عالم

”مگر..... مگر اس کی تو آج تاریخ پکی ہونے کی رسم ہے۔ سب مہمان آئے ہوں گے، ہم کس طرح جا کر سب کے سامنے یہ خطوط رکھ چھوڑیں۔ اس سے تو ہماری بیٹی کی بھی بدنامی ہوگی ناں۔“ اشتیاق عالم

اماں جی غزالہ سے بات کر کے فارغ ہوئیں تو عفت آرم نے ان کا منہ بھی میٹھا کر لیا۔

”ارے بھئی یہ ارم کہاں رہ گیا۔ اسی کی کی ہے یہاں۔“ تیمور حسن نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

”بس راستے میں ہے تیمور بھائی۔ آ رہا ہے۔ میری بات ہوئی ہے ابھی۔“ عفت آرم نے فوراً جواب دیا۔

☆☆☆

”تو کیا سنبھل اور ارم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا مگر ارم کی تو آج تاریخ پکی ہونے والی ہے۔ یہ..... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ارم محبت اگر سنبھل سے کرتا ہے تو شادی کی اور سے کیسے کر سکتا ہے۔ یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ حبیبہ بیگم کا بلند آواز میں داویلا شروع ہو گیا۔

”مجھے سنبھل سے یہ امید نہیں تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ پڑوس کے لڑکے سے محبت کا چکر چلا رہی ہے۔ وہ آخری خط پڑھا آپ نے جو آپ کی بیٹی نے محبت میں لکھا تھا اور آخر میں خود کو ”تمہاری محبت“ کے نام سے تعبیر کر ڈالا۔ تو یہ تو بہ..... میں نے تو تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میری سنبھل، میری بیٹی ہماری ناک کے نیچے یہ گل کھلائے گی۔“ اشتیاق عالم کو بیٹی کی بے شرعی کا تم کھائے جا رہا تھا۔

”سنبھل تو یہاں ہے نہیں، میں تو کہتی ہوں اس ارم کو جا کر پکڑنا چاہیے ہمیں جو ہماری معصوم بیٹی کو ان خطوط میں سبز باغ دکھا کر خود کو کسی اور کے نام سے منسوب کرنے کا انتظام کیے بیٹھا ہے۔“ حبیبہ نے سوں سوں کرتی ہوئی ناک کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے ترخ کر لیا۔

”مگر..... مگر اس کی تو آج تاریخ پکی ہونے کی رسم ہے۔ سب مہمان آئے ہوں گے، ہم کس طرح جا کر سب کے سامنے یہ خطوط رکھ چھوڑیں۔ اس سے تو ہماری بیٹی کی بھی بدنامی ہوگی ناں۔“ اشتیاق عالم

”مگر..... مگر اس کی تو آج تاریخ پکی ہونے کی رسم ہے۔ سب مہمان آئے ہوں گے، ہم کس طرح جا کر سب کے سامنے یہ خطوط رکھ چھوڑیں۔ اس سے تو ہماری بیٹی کی بھی بدنامی ہوگی ناں۔“ اشتیاق عالم

”مگر..... مگر اس کی تو آج تاریخ پکی ہونے کی رسم ہے۔ سب مہمان آئے ہوں گے، ہم کس طرح جا کر سب کے سامنے یہ خطوط رکھ چھوڑیں۔ اس سے تو ہماری بیٹی کی بھی بدنامی ہوگی ناں۔“ اشتیاق عالم

”مگر..... مگر اس کی تو آج تاریخ پکی ہونے کی رسم ہے۔ سب مہمان آئے ہوں گے، ہم کس طرح جا کر سب کے سامنے یہ خطوط رکھ چھوڑیں۔ اس سے تو ہماری بیٹی کی بھی بدنامی ہوگی ناں۔“ اشتیاق عالم

”مگر..... مگر اس کی تو آج تاریخ پکی ہونے کی رسم ہے۔ سب مہمان آئے ہوں گے، ہم کس طرح جا کر سب کے سامنے یہ خطوط رکھ چھوڑیں۔ اس سے تو ہماری بیٹی کی بھی بدنامی ہوگی ناں۔“ اشتیاق عالم

”مگر..... مگر اس کی تو آج تاریخ پکی ہونے کی رسم ہے۔ سب مہمان آئے ہوں گے، ہم کس طرح جا کر سب کے سامنے یہ خطوط رکھ چھوڑیں۔ اس سے تو ہماری بیٹی کی بھی بدنامی ہوگی ناں۔“ اشتیاق عالم

<https://www.urdu-tubes.com/>

چکچکاتے ہوئے بولے۔

”ان آٹھ خطوط میں سے سات خط ان کے بیٹے کے ہیں، بدنامی کیسے پھر ہماری بیٹی کی..... اچھا ہے ناں ان کے خاندان والوں کو بھی پتا چلے کہ صاحب زادے کیا گل کھلا رہے ہیں مکے میں اور میاں صاحب کیا معلوم ارم یہ شادی بجموڑی میں کر رہا ہو۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے اس کی مشکل بھی آسان ہو جائے۔ دیکھا نہیں آپ نے، ارم کی شادی کی خبر سن کر سنبل نے فون بند کر ڈالا۔ ہم ماں باپ ہیں سنبل کے، ہم بیٹی کے لیے نہیں کھڑے ہوں گے تو پھر کون کھڑا ہوگا۔“ حبیبہ کو ایک نئی راہ سوچی یکا یک ان کا دماغ کلمی انداز میں کام کرنے لگا۔ ہوتا ہے عموماً ایسا جب بے حد فیچوٹن رونما ہوتی ہے۔ ہماری عام سی زندگی میں تو فیصلے بھی یوں ہی ڈرامائی انداز میں ہونے لگتے ہیں۔ حبیبہ کی بات بھی اشتیاق عالم کے دل کو لگی اور دونوں میاں بیوی ان خطوط کا پلندہ اٹھائے رحمن احمد کے گھر جا پہنچے۔

☆☆☆

مبارک سلامت کا زور شور کے ساتھ سلسلہ جاری تھا۔ تب ہی دروازے کی گھنٹی بجی۔

”لگتا ہے ارم آ گیا۔“ میں گیٹ کھول کر آتا ہوں۔ رحمن احمد مسکرا کر دروازہ کھولنے کے لیے اٹھے اور پھر واپسی ان کی اشتیاق عالم اور حبیبہ کے ساتھ ہوئی۔

”ارے بڑے اچھے موقع پر آئے آپ لوگ، آئیے آئیے منہ میٹھا کریں۔“ عفت آرا پر جوش سی مٹھائی کی پلیٹ لے کر ان دونوں میاں بیوی کی جانب بڑھیں۔

”کہہ تو بالکل صحیح رہی ہیں آپ، آئے تو واقعی بڑے اہم موقع پر ہیں اور اگر یہ خطوط آپ پڑھ لیں تو اس موقع کی اہمیت کا بھی خوب اندازہ ہو جائے۔“

حبیبہ نے ممتی خیز انداز میں کہا اور ان کے اس انداز پر وہاں بیٹھے سب ہی افراد چونک اٹھے۔

”خیر تو ہے ناں بہن۔“ عفت آرا نے تعجب

خیز لگا ہوں سے بڑوں کو دیکھا۔ جو کچھ ماہ قبل ہی اس مکے میں آباد ہوئی تھیں اور ان سے اچھی علیک سلیک بھی ہو گئی تھی مگر آج ان کا یہ انداز انہیں چونکا رہا تھا۔

”آپ یہ خطوط پڑھیں بہن، ساری بات سمجھ میں آ جائے گی۔“ حبیبہ نے منہ بنا کر کاغذوں کے پلندے کو عفت آرا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ عفت آرا نے ان صفحوں کو پیل جرائی سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر برے لگنے لگی۔ جوں جوں وہ پڑھتی جاتیں ان کا دل پیٹتا جاتا۔ رحمن احمد ان کی قی پڑتی رنگت اور متحیر ہوئی حالت کو دیکھ کر جھٹ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کیا لکھا ہے ان کاغذوں میں؟“ وہ ان خطوط کو عفت آرا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولے۔

”ارم کے ابا! آپ خود پڑھ لیجیے۔ میرا قول بیٹھا جا رہا ہے ان محبت ناموں کو پڑھ کر۔“ عفت آرا صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں مگر ان کے منہ سے نکلے لفظ ”محبت نامے“ نے وہاں پچھل مجادی۔

”محبت نامہ!“ تیور حسن نے اچنبھے سے اس لفظ کو دہرایا اور اپنی زوجہ کو دیکھا۔ زوجہ صاحبہ کے کندھے اچکا کر لافلمی کا اظہار کرتے ہوئے

کی گردن کرتے ہوئے ساتھ بیٹھی شاندار اور مینوہ کو سوالیہ لگا ہوں سے دیکھا۔ شانلہ کے من میں عجیب خطرناک سی گھٹیاں بجنے لگیں اور پچھل کے کمر کی صورت اس کی زبان سے بل کھا کر لفظ پھسلا ”محبت نامہ۔“

”ہاں محبت نامہ۔ پڑوسیوں کے گھر آئے۔ آیا محبت نامہ ارم کے گھر۔“ رہی کسی کمر بیٹھنے نے پوری کردی۔ خوب آنکھیں دکھا کر شانلہ کو شوکا مارا اور

شانلہ کے اندر رنجے والی گھٹیاں خطرناک سا رن میں تبدیل ہو گئیں۔

ان خطوط کو پڑھ کر رحمن احمد کی پیشانی بھی عرق آلود ہو گئی۔

”ہائے یہ کس نے، کس کو محبت نامہ لکھ ڈالا۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔“ اماں جی نے سب کے دلوں میں

پتلا سوال بالا خرکری ڈالا۔

”اس کا جواب تو آپ کے پوتے صاحب ہی آکر دیں گے۔“ رحمن احمد نے نڈھال سے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اس نے دائیں پیر کی سیاہ ہائی ہیل کی نوک سے اٹھارہ میں پڑے ایک چھوٹے سے پتھر کو ہلکے سے پھینکا۔ پتھر پڑا اور پھر اٹھارہ میں پڑا۔ اٹھارہ کی طرف مرک گیا۔ وہ سیاہ لائٹ کوٹ، ان فٹنگ کافی کلر کی ویلورٹ کی پینٹ میں ملبوس بی بی پتھر کی سڑک پر اس خوب صورت جگہ کا نظارہ کرتی جہاں قدی میں گلی تھی۔ یہ پتھر رونق اسٹریٹ نیومری کا مال روڈ تھا۔ جس کے دونوں اطراف مختلف مشہور برانڈز کے آؤٹ لٹس بھی موجود تھے۔ سنبل کے ہاتھوں میں موجود کون سی پیر پیر کے باعث برف کی طرح جمی ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ گھنٹوں کے ریٹ کے بعد پیر مال روڈ کی سیر کو نکلے تھے اور ادھر ادھر کی دکانوں میں گھس چکے تھے۔ وہ آکس کریم شاپ سے اپنے لیے کون سے کمال روڈ کی رونقوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے کون کواپنے لیوں سے لگا کر ان کے انٹرنیٹ کے محسوس کیا تب ہی اچانک موسم نے ان کی لی اور دھنکی ہوئی روٹی کی مانند برف باری شروع ہو گئی۔

سنبل نے آواز کا آغاز ہو گیا۔ مبارک ہو۔“ اس سے پتھر پڑا اور پھر اٹھارہ میں پڑا۔ اٹھارہ کی طرف مرک گیا۔ وہ سیاہ لائٹ کوٹ، ان فٹنگ کافی کلر کی ویلورٹ کی پینٹ میں ملبوس بی بی پتھر کی سڑک پر اس خوب صورت جگہ کا نظارہ کرتی جہاں قدی میں گلی تھی۔ یہ پتھر رونق اسٹریٹ نیومری کا مال روڈ تھا۔ جس کے دونوں اطراف مختلف مشہور برانڈز کے آؤٹ لٹس بھی موجود تھے۔ سنبل کے ہاتھوں میں موجود کون سی پیر پیر کے باعث برف کی طرح جمی ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ گھنٹوں کے ریٹ کے بعد پیر مال روڈ کی سیر کو نکلے تھے اور ادھر ادھر کی دکانوں میں گھس چکے تھے۔ وہ آکس کریم شاپ سے اپنے لیے کون سے کمال روڈ کی رونقوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے کون کواپنے لیوں سے لگا کر ان کے انٹرنیٹ کے محسوس کیا تب ہی اچانک موسم نے ان کی لی اور دھنکی ہوئی روٹی کی مانند برف باری شروع ہو گئی۔

سنبل نے آواز کا آغاز ہو گیا۔ مبارک ہو۔“ اس سے پتھر پڑا اور پھر اٹھارہ میں پڑا۔ اٹھارہ کی طرف مرک گیا۔ وہ سیاہ لائٹ کوٹ، ان فٹنگ کافی کلر کی ویلورٹ کی پینٹ میں ملبوس بی بی پتھر کی سڑک پر اس خوب صورت جگہ کا نظارہ کرتی جہاں قدی میں گلی تھی۔ یہ پتھر رونق اسٹریٹ نیومری کا مال روڈ تھا۔ جس کے دونوں اطراف مختلف مشہور برانڈز کے آؤٹ لٹس بھی موجود تھے۔ سنبل کے ہاتھوں میں موجود کون سی پیر پیر کے باعث برف کی طرح جمی ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ گھنٹوں کے ریٹ کے بعد پیر مال روڈ کی سیر کو نکلے تھے اور ادھر ادھر کی دکانوں میں گھس چکے تھے۔ وہ آکس کریم شاپ سے اپنے لیے کون سے کمال روڈ کی رونقوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے کون کواپنے لیوں سے لگا کر ان کے انٹرنیٹ کے محسوس کیا تب ہی اچانک موسم نے ان کی لی اور دھنکی ہوئی روٹی کی مانند برف باری شروع ہو گئی۔

نوجوان بلند قد تھے لگاتے، برف کو اپنی ہتھیلیوں پر جمع کر کے ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے۔ وہاں موجود ہر شخص کے چہرے پر خوشی جگمگاتی تھی۔ مکان لیوں پر بج اٹھی تھی، معصوم، بے ریا، شفاف مسکراہٹ۔

وہ بھی آنکھیں بند کر کے چہرے کا رخ آسمان کی جانب کیے، پیاری سی مکان لیوں پر سجائے برقی برسات سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ برف کے ننھے گالے کسمی اس کے رخسار پر تو کسمی اس کے گلابی ہونٹوں پر گرتے۔ کمر سے نیچے تک آتی زلفوں میں بھی سفید موتی جاٹکے تھے۔ وہ ٹھیک اسٹریٹ لمپ کے نیچے کھڑی تھی اور سنہری روشنی نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ وہ ان حسین لمحات کو آنکھیں موندے محسوس کر رہی تھی، اپنے اندر جذب کر رہی تھی اور یوں وہ کسی طلسماتی داستان کا ایک افسانوی کردار محسوس ہو رہی تھی۔

سفید موتیوں سے بھی چوڑی سڑک پر تیز رفتار جب دندناتی ہوئی چلی آئی اور ٹھیک اس کے سامنے جا رکی۔ جب کی روشن ہیڈ لائٹس نے سنبل کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔ وہ پھر بھی بے خبر رہی، ڈرائیونگ سیٹ پر براہجان شاور نے اس خوب صورت منظر کو نہایت ہی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ وہ لڑکی اسے مجسمہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مہموت سا اسے دیکھے چلا گیا، یہاں تک کہ اس ساکت تجسس میں حرکت ہوئی، پہلے اس نے آنکھیں ذرا سی کھولیں، مگر روشنی کے تیز جھماکے نے اسے آنکھیں دوبارہ بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ مہموت سے شاور کا ارتکاز ٹوٹا اور اگلے ہی لمحے اس نے جبب کی لائٹس بجھا دیں۔

سنبل نے دھیرے سے آنکھیں کھول لیں۔ وادی کو سارواچی اتنی مختصر ثابت ہوئی تھی کہ اجنبی چند گھنٹوں کے وقفے سے پھر اس کے سامنے موجود تھا۔ سنبل کی نظریں بے اختیار شاور پر جا ٹھہریں، بس چند ساعتوں کا ٹکراؤ تھا مگر دل سیراب ہو گیا اور جب دل سیراب ہوا تو سنبل نے نظریں

جھکالیں۔ جیب میں بیٹھا شاور بھی مسکراہٹ دباے جیب آگے بڑھا لے گیا۔

بعض لمحے امر ہو جانے کے لیے ہمیشہ زندہ رہ جانے کے لیے ہوتے ہیں۔ دلوں میں بھی اور ذہنوں میں بھی۔ یہ لہجہ بھی امر ہو جانے کے لیے ان دونوں کے درمیان چپکے سے گزر گیا تھا۔ اس گزرنے جیب کو سنبل نے مڑ کر چپکے سے دیکھا تھا اور اس حرکت کو شاور نے مسکراتے ہوئے بیک ویو اسکرین پر دیکھا تھا۔

ہرف باری مزید شدت اختیار کر گئی تھی۔ وہ لوگ ہول واپس آ گئے۔

”سنو سنبل! ایک بات تو بتاؤ۔“ مابین نے کھڑکی پر کھڑی عقب سے پکارا۔ اس وقت وہ دونوں کمرے سے فسلک راہداری میں کھڑکی تھیں۔ اس راہداری کی کھڑکیاں مال روڈ کی جانب کھلتی تھیں۔ ”ہاں پوچھو۔“ سنبل نے لپٹ کر جواب دیا۔ مابین اس کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

”تمہارے اس ایڈوچر کا کیا بنا۔“ وہ دونوں اب کھڑکی کے اس پار سے نظر آتے نظر سے کا نظارہ کر رہی تھیں۔

”کس ایڈوچر کا۔“ سنبل حیرت میں مبتلا ہوئی۔

”ارے وہی بابا، جو تمہیں کتابوں کو پڑھتے پڑھتے کہانیاں لکھنے کا شوق ستایا تھا۔“ مابین نے یاد دلایا۔

”اچھا وہ.....“ سنبل کو یک دم یاد آ گیا۔ ”میں نے لکھی ہے ایک کہانی، چند خطوط پر مبنی، محبت کی ایک اچھوتی کہانی۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ذہن کے پردے پر وہ خطوط اپنے بیٹھے لفظوں سمیت بکھرنے لگے۔

”واقعی تم نے لکھ لی کہانی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔“ مابین پر جوش سی چکی۔

”میں نے یہاں آنے سے ایک دن قبل ہی تو کہانی مکمل کر کے سارے صفحات اپنے دراز میں رکھ

کر آئی ہوں۔“ سنبل مسرور سی بتا رہی تھی۔ کتابوں سے محبت تو اسے ایک زمانے سے تھی، اب لکھنے کا شوق بھی ہو گیا تھا۔

”اچھا یہ بتاؤ، کیا نام رکھے ہیں تم نے اپنے کرداروں کے۔“ مابین کو اشتیاق نے آکھیرا۔

”ارم..... میری کہانی کے اصل کردار کا نام ارم ہے۔ پتا ہے مابین! ہمارے بڑوں میں جو آئی رتنی

ہیں، ان کے لیے نام بھی ارم ہے اور سنبل بھی۔ اچھا لگتا تھا۔ جان کی زبانی اکثر یہ نام سن رکھا تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔ نام، اس لیے میں نے اپنی کہانی میں اس نام کا استعمال کر ڈالا۔“ اس نے نیا نیا لکھا شروع کیا تھا اور اس موضوع پر بات کرنا اسے بے حد پسند بھی تھا۔

مابین نے جب یہ موضوع چھیڑا تو وہ بھی پر شوق انداز میں بتانے لگی۔

”اور تمہاری ہیروئن..... اس کا نام کیا رکھا؟“ مابین کو مزید پس ہوا۔

”اپنی ہیروئن کی پہچان میں نے محبت سے کرائی ہے، ارم کی محبت۔“ مابین نے آئینہ میں نظر ڈالا۔ ”وہ اب اپنے خیال کے مفرد ہونے پر مابین کی رائے مانگ رہی تھی۔“

”بہت زیادہ مفرد.....“ مجھے اپنا یہ خوب صورت سا تجربہ ضرور پڑھنے کے لیے دینا۔“ مابین نے اصرار سے کہا اور بند کھڑکی کو ہولے سے کھول دیا۔ کوسٹار سے برقی ہواؤں کا جھونکا ان دونوں کے چہرے کو چھیڑتا ہوا گزر گیا۔

وہ دونوں باہر روڈ کی جانب متوجہ ہو گئیں، اچانک شور اٹھا اور سب لوگ جمع کی صورت ایک جگہ گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے اچانک یہاں۔“ وہ دونوں بھی چونک کر اس جمع کی جانب متوجہ ہوئیں اور پھر اچانک سکوت چھا گیا اور ٹھنڈی ٹھارہوں میں اتنی سرد خاموشی کو بائرسی کی مدھر لے کر گئی۔ دھن ایسی سحر کنیز تھی کہ وہاں موجود سب ہی لوگ دم بخود سے بیٹھتے چلے گئے۔

”یہ..... یہ تو وہی دھن ہے جو ہم نے لاہور میں کی تھی۔“ مابین فوراً پہچان گئی۔

”ہاں یہ وہی دھن ہے۔ اس رومانوی ماحول میں مزید تسکین بخیر تھی۔“ سنبل وہ دھن بھلا کیسے بھول سکتی تھی، وہ تو اس دھن کے سحر میں اسی دن قید ہو چکی تھی۔

بائرسی کی مدھر دھن بستر وں میں دیکھی طالبات کے دل میں گونجنے لگی تھی۔ مابین نے اس دھن کی آواز ان فسون خیز فضاؤں میں گونجی۔ ارد گرد جھوم کی صورت میں بیٹھے لوگوں کے لیے تابی بڑھ گئی اور پھر نہایت سحر انگیز فضا میں گونجی۔

”عشق تے عاشق دونوں برابر اڑیے عشق دانا کھڑا“ ارم نے سنبل کے دل پر چمتے پان آتش بانی تال بھانڈی ارے عشق تادارو گھڑا

”وہی دھن ہے مابین! جو شاہی قلعے میں ملا کر چل اٹھا۔ اس دھن کے بیدار کو جو عشق آتش کی تان چھیڑ رہا تھا۔

داؤد بھائی بیچوں کو لے کر ہول سے باہر جانے لگے۔

”ارے سنبل! مابین! آپ دونوں بھی آئیے ناں۔ سری میں یہ لوگ میلہ روز روز نہیں لگے گا، کرنا آج خوب صورت ملے ہیں انہیں محسوس جائے گا۔“ داؤد بھائی نے مزہ صدیقی کو بھی باہر باعث انکار کر دیا۔ مابین نے شدید تھکان کے بھائی کے ہمراہ ہول سے باہر چلی آئیں اور اس جمع میں شامل ہو گئیں۔

وہ تین نوجوان تھے، جنہوں نے فضاؤں میں سرد سار کے رنگ بکھیر رکھے تھے۔ سنبل کی جانب ان

تینوں کی پشت تھی، بچوں کا اصرار تھا کہ وہ لوگ سامنے کی جانب جا کر بیٹھیں۔

سنبل اور مابین بچوں کے ہمراہ لوگوں کے درمیان سے جگہ بناتے ہوئے سامنے جا پہنچیں۔ اس نوجوان نے وہی بھوری ہیٹ اس انداز سے پہن رکھی تھی کہ اس کے چہرے کا بالائی حصہ ہیٹ میں جا چھپا تھا۔ سر اس نے جھکایا ہوا تھا، اس کا چہرہ ان سب کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ دائیں جانب بیٹھے سامنے کی گٹار سنبل لا ہوا تھا جبکہ دوسرا سناٹا ان سب لوگوں کی ویڈیو بن رہا تھا۔ سنبل ٹھیک اس کے سامنے جا بیٹھی۔

غلام خیرید..... اتنے چاہ نہ رہی جسے عشق لاوے ڈیرہ.....!

شاور نے جیسے یہ مصرعہ سنبل کے لیے گاتے ہوئے اپنا جھکا سر دھیرے سے اوپر اٹھایا۔ مگر اس کی آنکھیں تاحال بند تھیں۔ اس کی آواز میں سوز کے جو رنگ گھلے تھے وہی رنگ اس کے چہرے پر بھی عیاں تھے۔ وہ اب سنبل کے عین سامنے تھا اور سنبل کی آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں۔ کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جن میں ہم قید ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ ایسی اسیری ہوتی ہے جس میں آزادی کی چاہ بھی نہیں ہوتی۔ سنبل حیرت زدہ تھی، اس سفر کے آغاز سے ہی وہ جن لمحوں میں خود کو قید پارہی تھی، اس کے سارے تانے بانے سامنے بیٹھے شخص سے جڑتے تھے۔

”یا الہی..... کیا یہ محض اتفاق ہے یا کوئی معجزہ ہونے کو ہے۔“ اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔

یار ڈاؤسھی عشق آتش لانی ہے یار ڈاؤسھی عشق آتش لانی ہے اس کی لے بلند ہوئی اور مجمع جھوم اٹھا۔

”وے یار سانو.....“ شاور نے یک دم آنکھیں کھول لیں اور اس کی نگاہیں عین سامنے حیرت زدہ سی بیٹھی سنبل پر جم کر رہ گئیں۔ شاور اس وقت اپنے آپ میں نہ تھا، وہ اس سراپا کی لوگ گیت کے مدھر بولوں میں گھل چکا تھا۔ ایک الوی رنگ میں ڈھل چکا تھا، وہ میں نہ رہا تھا۔ ”تو“ بن چکا تھا۔

ملکہ کو ہمارے برقی اور دھنی کے گھونگھٹ سے ذرا سا جھانک کر اس عشق کے روٹی کو دیکھا اور مسکرا کر گھونگھٹ میں رخ چھپالیا۔ اس کی ہاتھوں میں کٹی وادی بھی ہوئے ہوئے عشق کے سرور میں غور و خوض تھی۔

وے یار سا نو لگ گئی بے اختیاری

سینے وے وچ نہ سائی ہے.....

بارڈا دھنی عشق آتش لانی ہے

مختل کو محسوس ہونے لگا کہ ایک بے اختیاری اس پر بھی چھانے لگی ہے۔ شادو کی نگاہوں کا مرکز اگر وہ بھی تو شادو بھی اس کی نظروں کے حصار میں تھا۔ برف باری کا تھا ہوا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔ ننھے روٹی جیسے گالے ان سب پر جموتے ہوئے پھر سے برسا شروع ہو گئے۔ حسن یہ فسوں خیز مناظر اپنے کیرے میں ریکارڈ کر چکا تھا۔ عشق آتش کا سلسلہ بھی قلم چکا تھا اور لوگ اب شادو سے آؤ گراف لے رہے تھے۔

”میں نہیں بھی لینا ہے آؤ گراف۔“ شوخ و

شگ بچوں نے ضد باندھ لی تھی۔

داؤد بھائی پہلے ہی ان لوگوں سے علیک سلیک بڑھ چکے تھے۔ آؤ گراف ملنا مشکل نہ ہوا، ساری بچیوں نے قطار بنا کر آؤ گراف لیا تھا۔ بچیوں کے ساتھ ساتھ لگے ہاتھوں ماہین نے بھی آؤ گراف لے ڈالا۔ ماہین کے پیچھے وہ بھی کھڑی تھی، کھوئی کھوئی سی۔ بے اختیاری انھی بھی اس پر چھائی ہوئی تھی، تب ہی نظر سے چھکی ہوئی تھیں۔

”آپ نہیں لیں گی آؤ گراف۔“ کسی نے اس کی جانب جھک کر سرکشی کی تھی۔

”وہ..... دراصل میرے پاس آؤ گراف لینے کے لیے کچھ ہے نہیں۔“ سنبھلنے لگا اور اپنے خالی ہاتھوں کی جانب اشارہ کیا اور واپس جانے کو مڑ گئی۔

”سنئے.....“ شادو بے اختیار اسے پکار بیٹھا۔ بے ساختہ پلٹی۔

”مگر میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ اپنی لیڈر جیکٹ کی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس پر لکھنے لگا اور پھر اپنی اسی مخصوص پرکشش مسکراہٹ کے ساتھ وہ کارڈ اس کی جانب بڑھا دیا۔

میل نے وہ کارڈ اٹھا لیا اور پلٹ کر اپنے گروپ کی جانب بڑھ گئی۔ جائے کے انشال سے نزدیک ایک بچہ کراس نے اس کی دبا کارڈ نکالا جو اس کے ہاتھوں کے کس سے جھپک رہا تھا۔ بے قرار نگاہوں سے اس کارڈ پر نرم لفظوں کو پڑھنے لگی۔

”اس سنہری لڑکی کے لیے جو ایک سنہری میں مجھ سے آئی۔“ اس ایک خوب صورت تصویر کے ساتھ اس کا نام درج تھا ”شادو“۔ سنبھلنے لگا اس کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا، وہ وزینٹنگ کارڈ تھا جس میں شادو کا نمبر بھی درج تھا۔ اس نے بے اختیار سر ہٹا کر کچھ فاصلے پر کھڑے شادو کو دیکھا تھا، وہ اسی کی جانب تکتا تکتا جھپکتا تھا۔

”یہ کیا آنکھ بھولی چل رہی ہے؟“ شادو نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔ وہ اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی، اسے علم ہی نہ ہو سکا۔ ”داؤد بھائی جانے کے انشال پر جا چکا ہوئے۔ داؤد بھائی نے شادو کی طرف اشارہ کیا۔ آؤ گراف لیا تھا۔ ایک سولہ ستر سالہ لڑکی اس کی رفتار سے چائے بنا رہا تھا اور گاؤں کی طرف بھاگ رہی تھی۔

”نام کیا ہے تمہارا۔“ داؤد بھائی نے بات برائے بات نام پوچھ لیا۔ ”خاہر خان۔“ اپنا نام بتا کر چائے کی ٹرے میں آؤ گراف کے حوالے کرتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔ ”آپ لوگ کہاں ٹھہرے ہو صاحب۔“ داؤد نے جو سامنے ہوئی ہے ناں، اس میں۔

بھائی نے بڑے سے پیسے نکالتے ہوئے جواب دیا۔ ”جب بھی چائے لینا ہو، ادھر ہی آنا صاحب۔“ وہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے کھڑا تھا۔ ایک سرسری سی نگاہ اس نے داؤد بھائی کے عقب میں کھڑی نو عمر لڑکیوں کے خوش گلیاں کرتے گروپ پر ڈالی۔

”ضرور، بشرط تمہاری چائے ہمارے معیار کے مطابق۔“ شادو نے بڑے اٹھا کر پلٹ گئے۔ اس بار ظاہر خان کی نگاہ بچہ پر پڑی ان دو جوان لڑکیوں پر چڑھ گئی، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک عجیب سی جھپک کوندی۔

وہ آج خوش تھا، بے تحاشا خوش۔ دوڑتی بھاگتی سڑکوں گلیوں میں ابھی زندگی میں شامل نہ کا خیال ہی ہمارے موسم سے کم نہ تھا۔ آج کا دن بے حد معروف گزرا تھا۔ وہ ایک بے حد اہم اور مشکل کیس بر کام کر رہا تھا، اس سلسلے میں اسے کئی اہم میٹنگز میں شامل ہونا پڑ رہا تھا اور اسی وجہ سے آج اسے گھر جانے میں تاخیر ہوئی۔ وہ زمانے بھر کی تھکن ذہن سے پرے کر کے شامل سے شادی کے تصور میں کھویا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ مگر اس کی توقعات کے برعکس، خوشی اپنا عین اور محبت کے بجائے تناؤ زدہ چہروں اور کٹافٹ بھرے ماحول نے اس کا استقبال کیا۔

”خیریت، آپ سب کے منہ کیوں اترے ہوئے ہیں؟“ اس نے حیرانی سے استفسار کیا۔ گھر میں پر دی مہمانوں کی موجودگی اور ان کی نگاہوں سے گراں ہوتی تھی اسے مزید درط حیرت میں مبتلا کر دی۔

”بیٹا یہ خطوط جو تمہارے سامنے پڑے ہیں، انہی بڑھ لو۔ پھر جان جاؤ گے کہ ہم سب کے منہ کیوں اترے ہوئے ہیں۔“ رحمن صاحب نے لفظ چبا چبا کر جواب دیا۔

اسے حیرت نے آ گھیرا۔ ان سب پر ایک نگاہ اڑاتے ہوئے اس نے ان خطوط کو اٹھایا، ایک ایک

کر کے وہ خطوط کو پڑھتا چلا گیا۔ اس کے لب بے ساختہ مسکراہٹ سے کھل اٹھے۔

”یہ کسی کے ذاتی خطوط ہیں، آپ سب نے مجھے پڑھنے کے لیے کیوں دے دیے۔“ وہ ان خطوط سے محظوظ ہوتے ہوئے ان سے دریافت کرنے لگا۔ ”کیونکہ بیٹا جی خطوط لکھنے والے آپ ہی ہیں۔ آپ کا ہی نام درج ہے ان تمام خطوط میں۔“ اس بار اشتیاق عالم طنزیہ لب و لہجہ اختیار کر گئے۔

”کیا مطلب کہ میرا نام لکھا ہے، اس بات سے مقصد کیا ہے آپ لوگوں کا؟“ ارم کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔

”لگتا ہے سی آئی ڈی والے آج کل اپنے افسروں کو اداکاری سکھا رہے ہیں، تب ہی سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے جی تم انجان بن رہے ہو بیٹا جی۔“ حبیبہ بیگم طنزیہ لہجے میں کہے بنا رہ نہ سکیں۔ ارم بھونچکا رہ گیا۔

”دیکھو بیٹا! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ خطوط تم نے لکھے ہیں ان کی بیٹی کو۔ اور سچ پوچھو تو خط میں نام بھی تمہارا لکھا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ یہ سارا چکر کیا ہے آ خر؟“ رحمن احمد نے خن سے سارا معاملہ ارم کے گوش گزار کیا۔

”میں آپ کی بیٹی کو خط کیوں لکھوں گا۔ میں نے آج تک اسے دیکھا بھی نہیں۔“ ایک بہترین سی آئی ڈی آفسر ہونے کے باوجود اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عجیب و غریب مسئلہ پیدا کیا ہوا اور جوان ہو کر کب اس کی خوشیاں اجاڑنے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”یہ عجیب کئی تم نے بیٹا کر دیکھا تک نہیں، خط نہیں لکھا۔ ارے نام تمہارا لکھا ہے پھر خط تم نے نہیں لکھا تو کیا کسی غلامی مخلوق نے لکھ ڈالا ہے۔“ حبیبہ کے سر پر لگی اور ٹکوں پر بھیجی۔

”سنو بڑوں بی بی! یہ میرے پوتے کو غلامی مخلوق کہہ کر مخلوق نہ بناؤ۔ ہائے کل ہی میں نے خبروں میں سنا ہے کہ حکومت کی غلامی مخلوق سے جنگ

ملکہ کو ہمارے برقیں اور جینی کے گھونگھٹ سے ذرا سا جھانک کر اس عشق کے روی کو دیکھا اور مسکرا کر گھونگھٹ میں رخ چھپا لیا۔ اس کی بانہوں میں کئی واوی بھی ہوئے ہوں عشق کے سرور میں غور و فکر تھی۔

وے یار سانولگ گئی بے اختیار

سینے دے دینے نہ سانی ہے.....

بارڈ اور جینی عشق آتش لانی ہے

تمہیں کو محسوس ہونے لگا کہ ایک بے اختیار اس پر بھی چھانے لگی ہے۔ شاور کی نگاہوں کا مرکز اگر وہ بھی تو شاور بھی اس کی نظروں کے حصار میں تھا۔ برف باری کا تھا ہوا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔ ننھے روٹی جیسے گالے ان سب پر جموتے ہوئے پھر سے برسا شروع ہو گئے۔ حسن یہ فصول خیز مناظر اپنے کیمبرے میں ریکارڈ کر چکا تھا۔ عشق آتش کا سلسلہ بھی تم چکا تھا اور لوگ اب شاور سے آؤ گراف لے رہے تھے۔

”میم ہمیں بھی لینا ہے آؤ گراف۔“ شوخ و شنگ بچیوں نے ضد باندھ لی تھی۔

داؤد بھائی پہلے ہی ان لڑکوں سے علیک سلیک بڑھا چکے تھے۔ آؤ گراف ملنا مشکل نہ ہوا، ساری بچیوں نے قطار بنا کر آؤ گراف لیا تھا۔ بچیوں کے ساتھ ساتھ لگے ہاتھوں ماہین نے بھی آؤ گراف لے ڈالا۔ ماہین کے پیچھے وہ بھی کھڑی تھی، کھوئی کھوئی سی۔ بے اختیار اس کی بھی اس پر چھائی ہوئی تھی، تب ہی نظر بس جھٹکی ہوئی تھیں۔

”آپ نہیں لیں گی آؤ گراف۔“ کسی نے اس کی جانب جھک کر سرگوشی کی تھی۔

تمہیں نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور کئی پرکشش تھی اس کی مسکراہٹ۔

”وہ..... دراصل میرے پاس آؤ گراف لینے کے لیے کچھ ہے نہیں۔“ تمہیں نے بولکھلا کر اپنے خالی ہاتھوں کی جانب اشارہ کیا اور واپس جانے کو مڑ گئی۔

”سنئے.....“ شاور بے اختیار اسے پکار بیٹھا۔ وہ بے ساختہ پلٹی۔

”مگر میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ اپنی لیڈر جیکٹ کی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس پر لکھنے لگا اور پھر اپنی اسی مخصوص پرکشش مسکراہٹ کے ساتھ وہ کارڈ اس کی جانب بڑھا دیا۔

تمہیں نے اس کا ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ اپنے گروپ کی جانب بڑھ گئی۔ جائے کے اشارال سے نزدیک ایک بیچ پر بیٹھ کر اس سے کسی میں دبا کارڈ نکالا جو اس کے ہاتھوں کے پس سے بیگ چکا تھا۔ وہ بے قرار نگاہوں سے اس کارڈ پر مرقم لفظوں کو پڑھنے لگی۔

”اس سنہری لڑکی کے لیے جو ایک سنہرے لے میں مجھ سے آئی۔“ اس ایک خوب صورت منظر کے ساتھ اس کا نام درج تھا ”شاور“۔ تمہیں نے اس کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا، وہ وہی بیگ کا کارڈ تھا جس میں شاور کا نمبر بھی درج تھا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر کچھ فاصلے پر کھڑے شاور کو دیکھا تھا، وہ اسی کی جانب ہلکتا ہوا تھا۔

”کیا آؤ گراف چولی چل رہی ہے جناب۔“ ماہین نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔ وہ کب اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی، اسے علم ہی نہ ہو سکا۔ ”داؤد بھائی چائے کے اشارال پر جا کھڑے ہوئے۔ داؤد بھائی نے کشمیری چائے کا لمبا چوڑا آرڈر دیا تھا۔ ایک سولہ سترہ سالہ لڑکا تھا جو برق رفتاری سے چائے بنا رہا تھا اور گاہکوں کو بھی ڈیل کر رہا تھا۔

”نام کیا ہے تمہارا۔“ داؤد بھائی نے یوں ہی بات برائے بات نام پوچھ لیا۔

”ظاہر خان۔“ اپنا نام بتا کر چائے کی ٹرے داؤد بھائی کے حوالے کرتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔

”آپ لوگ کہاں ٹھہر رہے ہو صاحب۔“ ”یہ جو سامنے ہوں ہے ناں، اس میں۔“ داؤد

بھائی نے بڑے سے پیسے نکالتے ہوئے جواب دیا۔ ”جب بھی چائے لینا ہو، ادھر ہی آنا صاحب۔“ وہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے کھڑا تھا۔ ایک سرسری سی نگاہ اس نے داؤد بھائی کے عقب میں کھڑی نو عمر لڑکیوں کے خوش گپیاں کرتے گروپ پر ڈالی۔

”ضرور، بشرط تمہاری جائے ہمارے معیار کے مطابق۔“ وہ لڑکوں کو دیکھ کر ہنس رہا تھا اور بڑے اٹھا کر لپٹ گئے۔ اس بار خانہ خان کی نگاہ بیچ پر بیٹھی ان لڑکیوں کی کیمیز پر جا پڑی تھی، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک عجیب سی جھلک گونڈی۔

☆ ☆ ☆ وہ آج خوش تھا، بے تحاشا خوش۔ دوڑتی بھاگتی لڑکیوں کی نظروں میں اچھی زندگی میں شامل نہ کا خیال نہ تھا۔ وہ موسم سے ہم نہ تھا۔ آج کا دن بے حد کیف گزارا تھا، وہ ایک بے حد اہم اور مشکل کام کر رہا تھا، اس سلسلے میں اسے کئی اہم میٹنگز میں شامل ہونا پڑ رہا تھا اور اسی وجہ سے آج اسے گھر جانے میں تاخیر ہوئی۔ وہ زمانے بھر کی تھکن ذہن سے بھر کر اسے شاور کے پاس پہنچا۔ وہ اس کی توقعات کے برعکس، اس کی ہنسی اور محبت کے بجائے تناؤ زدہ چہروں سے اس کا استقبال کیا۔

”خیریت، آپ سب کے منہ کیوں اترے ہوئے ہیں؟“ اس نے حیرانی سے استفسار کیا۔ گھر میں بڑی مہمانوں کی موجودگی اور ان کی نگاہوں سے اس کی حساسیت اسے مزید درگزر حیرت میں مبتلا کر رہی تھی۔

”بھائی یہ خطوط جو تمہارے سامنے پڑے ہیں، ان کیلئے پڑھ لو۔ پھر جان جاؤ گے کہ ہم سب کے منہ چہا کر جواب دیا۔“ ”رہن صاحب نے لفظ چہا اسے حیرت نے آ گھیرا۔ ان سب پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے ان خطوط کو اٹھایا، ایک ایک

کر کے وہ خطوط کو پڑھتا چلا گیا۔ اس کے لب بے ساختہ مسکراہٹ سے چل اٹھے۔

”یہ کسی کے ذاتی خطوط ہیں، آپ سب نے مجھے پڑھنے کے لیے کیوں دے دیے۔“ وہ ان خطوط سے محظوظ ہوتے ہوئے ان سے دریافت کرنے لگا۔ ”کیونکہ بیٹا جی خطوط لکھنے والے آپ ہی ہیں۔ آپ کا ہی نام درج ہے ان تمام خطوط میں۔“

اس بار اشتیاق عالم طنز یہ لب و لہجہ اختیار کر گئے۔

”کیا مطلب کہ میرا نام لکھا ہے، اس بات سے مقصد کیا ہے آپ لوگوں کا؟“ ارم کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔

”لگتا ہے سی آئی ڈی والے آج کل اپنے افراد کو اداکاری سکھا رہے ہیں، تب ہی سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی تم انجان بن رہے ہو بیٹا جی۔“ حبیبہ بیگم طنز یہ لہجے میں کہے بنا رہ نہ سکیں۔ ارم بھونپکا رہ گیا۔

”دیکھو بیٹا! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ خطوط تم نے لکھے ہیں ان کی بیٹی کو۔ اور سچ پوچھو تو خط میں نام بھی تمہارا لکھا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ یہ سارا چکر کیا ہے آخر؟“ ”رہن احمد نے محل سے سارا معاملہ ارم کے گوش گزار کیا۔

”میں آپ کی بیٹی کو خط کیوں لکھوں گا۔ میں نے آج تک اسے دیکھا بھی نہیں۔“ ایک بہترین سی آئی ڈی آفیسر ہونے کے باوجود اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عجیب و غریب مسئلہ پیدا کب ہوا اور جوان ہو کر کب اس کی خوشیاں اجاڑنے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”یہ عجیب کبھی تم نے بیٹا کہ دیکھا تک نہیں، خط نہیں لکھا۔ ارے نام تمہارا لکھا ہے پھر خط تم نے نہیں لکھا تو کیا کسی خلائی مخلوق نے لکھ ڈالا ہے۔“ حبیبہ کے سر پر لگی اور تلووں پر بھی۔

”سنو پڑوس بی بی! یہ میرے پوتے کو خلائی مخلوق کہہ کر متھوک نہ بناؤ۔ ہائے کل ہی میں نے خبروں میں سنا ہے کہ حکومت کی خلائی مخلوق سے جنگ

<https://www.urdu-tubes.com/>

چل رہی ہے اور ہاں اگر خط لکھ بھی دیے تو کیا ہو گیا۔
پادانی کی حدود کو چھو تیں دادی اماں نے کچھ دنوں
قبل ہی خلائی مخلوق کی خبریں نیوز چینلز پر سنیں اور
فی الوقت حبیبہ کے منہ سے اس لفظ کون کر پڑے کی
محبت میں شپٹا کر بول پڑیں۔

”مگر دادی اماں! میں نے یہ خط نہیں لکھے۔
آپ لوگ میری بات مان کیوں نہیں رہے۔“ اس کا
دل چاہا اپنے بال نوچ ڈالے۔

”دیکھیں عفت آبا! خطوط کا یہ معاملہ صحیح نہیں
ہے۔ ارم اگر شکملہ سے منسوب ہے تو کیا ضرورت
ہے اسے آس پڑوس کی لڑکیوں کو خطوط لکھنے کی۔“ اس
بار راحت آرائشی منہ پھلائے شکوہ کناں ہوئیں۔

”ہائے میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ ارم بھائی
ایسے دل چپینک نکلیں گے۔ بے چاری شکملہ کا تودل
ہی ٹوٹ گیا۔“ چہ چہ چہ۔“ میمونہ نے جھٹ شرانگیزی
دکھائی۔ ارم نے خوں خوار نگاہوں سے میمونہ کو گھورا
اور پھر کئی گھنٹوں سے اس کے برابر میں آنکھوں سے
ندی بہانی شکملہ کو۔

”اچھی مصیبت گلے پڑ گئی یار۔“ وہ بڑبڑا کر رہ
گیا۔

”آپ سب لوگ ایک طرف کی کہانی سن
رہے ہو۔ ارم کی بات سن ہی نہیں رہے جب وہ کہہ
رہا ہے کہ یہ خط اس نے نہیں لکھے تو شکملہ اس نے
نہ لکھے ہوں۔ کیا خبر یہ خطوط کی اور نے لکھے ہوں۔“
عفت آرا بالآخر بیٹے کی حمایت میں میدان میں
اتریں۔ ارم نے انہیں منوں نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ تو یہی کہیں کی ناں بہن، آپ کا بیٹا جو
ہے اور بیٹے والوں کو بیٹی والوں کے دکھ دکھائی نہیں
دیتے۔ یہ خطوط تو آپ لوگوں کے لیے بے معنی سی
بات ہے مگر ذرا سوچئے کہ جو وعدے دعوے ارم نے
خطوط میں میری بیٹی سے کر ڈالے ہیں۔ جب اسے
علم ہوگا کہ ارم اب کسی اور شادی کر رہا ہے تو کتنا دکھ
ہوگا اسے۔“ کبھی سوچا بھی ہے آپ لوگوں نے۔“ حبیبہ
آب دیدہ سی بیٹی کی محبت میں بولے چلی گئیں۔

”بات تو ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ بیٹیوں
والوں کے درد کا احساس بیٹے والوں کو کم ہی ہوتا ہے۔
ارم ایک ہی وقت میں دو لڑکیوں کے دلوں سے کھلتا
آ رہا ہے اور آپ! آپ کو بھی اپنا بیٹا غلط معلوم نہیں
ہو رہا۔ افسوس کا مقام ہے یہ۔“ راحت آرا کا دل بھی
آنسو بہا بیٹی کے درد پر گر لایا تھا۔

”ارم بھائی اگر آپ کو شکملہ سے شادی نہیں
کرنی تھی تو اسے ہی کیوں نکالتے اس طرح کسی اور
سے چکر چلا کر آپ نے اسے جیسے بی مار ڈالا۔“
اس پورے قصے میں میمونہ بھی اپنا خوب ڈال رہی
تھی۔

”اوہ بس کرویں آپ سب، جس بات کا نہ
کوئی سر ہے نا پیر۔ اس بات کے پیچھے پڑ گئے ہیں
آپ لوگ اور انٹی آپ یہ تو بتائیں یہاں ان خطوط کو
لا کر ہنگامہ کھڑا کر دیا مگر اپنی بیٹی سے پوچھا کہ اسے
خطوط کس نے لکھے ہیں۔“ اب جرح کی باری ارم کی
تھی۔

”پوچھوں کیا؟ جب صاف جلی حروف میں نام
تمہارا لکھا ہے صاحب زادے اور جب اسے بتایا کہ
تمہاری آج تاریخ طے ہو رہی ہے شادی کی تو میری
معصوم بیٹی کھکھلائی بیٹی کو جب لگ گئی۔ ایسی خاموشی
ہوئی وہ کہ میں ہیلو ویلو بوتی رہ گئی مگر وہ ایک لفظ نہ بول
پائی۔ بڑی حساس ہے میری بیٹی، نہ جانے کیسے وہ اٹا
بڑا صدمہ وہاں اکیلے سہہ رہی ہوگی۔ اب بتائیے
ذرا، ایسے میں کیسے میں یہاں آ کر فریاد نہ کروں۔
حبیبہ کی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور لہجہ بھگا تھا۔
عفت آرا اور رحمن احمد ساری بات سن کر سر جھکا
کر رہ گئے۔

”رحمن بھائی! میرے خیال سے ہمیں اب
پڑوسیوں کی بیٹی کے کراچی لوٹنے کا انتظار کرنا
چاہیے۔ تب تک اس معاملے کو یہیں چھوڑ دیتے
ہیں۔ اب جو بھی بات ہوگی، اس بیٹی کے آنے کے
بعد ہوگی۔“ تیور حسن تمام معاملے کو بغور سن اور دیکھ
رہے تھے۔ رحمن احمد سے اجازت لیتے ہوئے

بولے۔ ارم اب سمجھنے انہیں جانا دیکھتا رہ گیا۔ شکملہ کی
آنکھوں میں پھٹکی بدگمانی اس کی نظروں سے مخفی نہ تھی
اور وہ بخوبی جانتا تھا کہ میمونہ اب اس کے حوالے سے
شکملہ کے دل میں بدگمانی کے ساتھ ساتھ نفرت کے
چمک بھی بونے والی ہے۔

”آج تم نے ہمارا سر خاندان کے ساتھ ساتھ
مکے بھر میں بھی شرم سے جھکا دیا۔ کیا آپ کو اسے یہ
سچا نہیں لگتا کہ میں اسے اس طرح کیوں کر لے آئی۔“
مکے میں آتا رہا کہ ایک ذمہ دار افسر ہو کر بھی تم اتنی
لڑکیوں کو، رحمن احمد نے جو غصہ اتنی دیر سے اپنے
انداز بار کھاتھا، وہ بالآخر ابل ہی پڑا۔

”مجھے بھی آپ لوگوں سے یہ امید نہیں تھی،
مگر میرے بیٹوں کو ہی اعتبار نہیں۔ حد ہو گئی ہے،
آپ لوگوں نے مہوچ لیا کہ میں محبت نامے لکھنے جیسی
بلا وقتانہ حرکت کرتا پھروں گا۔ باہر سے آ کر کسی
کے کہنے پر انٹلی اٹھائی اور آپ لوگوں نے اس کا یقین
کر لیا۔“ رحمن احمد نے اٹھ کر اٹھارہ ڈالے۔ میں آپ لوگوں کا اپنا
بھائی ہوں، میری بیٹی کی جرح کا بھر و سا نہیں آپ لوگوں
اسے دے کر کھٹک چکا تھا۔ تب ہی چیخ پڑا۔ ایک
کروڑ اسے کمرے میں چلا گیا۔

ایک ایک کے سفر میں کب کوئی بھیانک ساموڑ
اُسے بھی انسان کو نہ چھتا۔ چاہتے نہ چاہتے
کے سامنے سامنے ساموڑ کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ
موت کے حال درپیش تھی۔ اس نے بھی سوچا بھی نہ تھا
کہ وہ اسے کھڑ والوں کی نظر میں یوں بے اعتبار ہو کر
رہ جائے گا۔ کچھ حادثات بجلی کی سی تیزی کے مانند
پڑ سکتے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی ہو کر گزر جاتے
ہیں مگر اثرات دیر پا اور بھیانک ثابت ہوتے ہیں۔

جو کچھ بھی ہوا وہ ارم کے لیے بھی ایک حادثہ ہی
تھا۔ جس لڑکی وہ جانتا بھی نہ تھا، اس کے ساتھ اس کا
نام زبردستی تھی کر دیا گیا۔ اس کے کردار کو تار تار اور
اس کی عزت کو داغ دار بنادیا گیا اور پھر تم یہ کہ کوئی
اس پر یقین کرنے کو بھی تیار نہ تھا۔

”حد ہے یار! یہ سب کچھ تو عموماً ہمارے
معاشرے میں لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں تاریخ
میں پہلا انکھار لڑکا ہوں گا جو اپنی عزت و وقار کے
لیے گھر بھر سے لڑ رہا ہوں۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا
بستر پر دراز ہو گیا۔

”اور شکملہ..... اسے بھی یقین نہیں مجھ پر۔ وہ
بھی بے اعتبار کر گئی مجھے۔“ اسے دکھ نے آ گھیرا۔

بہت دیر تک وہ اس تمام قصے کے متعلق سوچتا
رہا۔ بے حد یاد کرنے کے باوجود اسے اس لڑکی کا چہرہ
یاد نہ آیا جس کے عشق میں گرفتار ہو کر محبت نامے لکھنے
کا الزام اس پر لگا تھا اور یاد آتا بھی کیسے جو چہرہ
نظروں سے بھی گزرا ہی نہیں، وہ ذہن کے پردے پر
کیسے اپنی شبیہ دکھاتا۔

بہت سوچ و بچار کے بعد اس نے شکملہ سے
بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شکملہ اس
سے متنفر ہو۔ وہ اس کا اعتماد کسی قیمت پر کھوٹا نہیں چاہتا
تھا۔ وہ میمونہ کو شکملہ کو بہکانے کا موقع ہرگز نہیں دینا
چاہتا تھا۔

وہ بستر سے اٹھا اور کال ملاتے ملاتے کھڑکی پر
جا کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے کھلے پٹ سے آتی خوش گووار
ہوائے اس کے مزاج پر چھائی کثافت کو بھی تھوڑا دور
کر ڈالا تھا۔ کھٹی بج رہی تھی، وہ پنی بھیجی گئی صدا کو
قبولیت کی سند ملنے کا منتظر تھا۔

☆☆☆
”مت اٹھا فون، بالکل بھی نہیں اٹھا۔“ ارم
کا نام اسکرین پر روشن ہوتے ہی شکملہ نے بے اختیار
موبائل تھا ما اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میمونہ نے
اسے کال وصول کرنے سے روکا۔
”کیوں، کیوں نہ اٹھاؤ؟ مجھے بات کرنی

کرن

16 فروری 2019

سراپور کی ہمت اتنی نہ تھی کہ لوڑھے باب

بے حس روئے پر بے حد دکھی تھا۔ آج ساری انا مالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے راحت خالہ کے

گھر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب ڈرائنگ روم میں بیٹھا۔ ٹھنڈے ٹھار پانی کے ساتھ شامکے کے انتظار میں کوفت کا شکار ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی اسے احساس ہوا کہ خالہ کا رویہ اور لہجہ بھی پانی جیسا سرد تھا اور خالو نے تو اس سے ملنے آنے کی زحمت بھی نہ اٹھائی تھی۔

”دیکھو تم وہی کہنا جو مایوں نے کہا ہے کہ جب تک وہ لڑکی واپس نہیں آ جاتی تب تک کوئی بات نہیں ہوگی اور ہاں جذبات میں آ کر اس کی کوئی بات نہ مان بیٹھنا۔“ میونہ نے جب سے شامکا، ارم شامکے سے ملنے آیا ہے تب سے مسلسل اس کے کان بھرے جا رہی تھی۔ نہ جانے کب کب کی بھڑاس اس کے اندر موجود تھی جو ارم کی کردار کشی کر کے نکل رہی تھی حالانکہ اس حقیقت سے وہ بخوبی واقف تھی کہ ارم کردار کا ڈھلا نہیں۔ خود میونہ نے ارم کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کتنی ہی کوششیں کر ڈالی تھیں مگر اس نے ہر دفعہ اس کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ میونہ تو یہ بھی جانتی تھی کہ ارم نے وہ خط نہیں لکھے، مرد کا کردار اس کی نظروں سے عیاں ہوتا ہے۔ مگر بھر بھی وہ اس پر کچھ اچھالنے والوں میں سب سے آگے آگے تھی کیونکہ ارم اگر اس کی جانب مائل نہیں ہوسکا تو وہ شامکے کو بھی اس شاندار شخص کا ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے شامکے کو اپنی کچھ داریاتوں کے ذریعے وہ سب کہنے پر راضی کر ڈالا جو ارم جیسے پختہ کردار کے حامل انسان کے دل کو نہیں پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی تھیں۔

”کیوں آئے ہو تم یہاں؟“ وہ منہ پھیر کر بولی۔ محبت کی لود تھی ارم کی آنکھوں میں جھانکنے سے وہ سخت پرہیز کر رہی تھی۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو شامکے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تمہارا اعتبار مجھ پر اتنا کمزور کیوں تھا کہ کسی کی بھی کہی ہوئی کوئی سی بات تمہیں مجھ سے بدظن کر گئی۔ ہماری محبت کو بے قیمتی کا شکار کر دیا تم نے۔“ وہ اس کے چہرے پر گہری

نگاہ جمائے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”اتنا دکھ ہے تمہیں اگر اس بے اعتباری اور غیر یقینی پر تو خود بتاؤ کیوں کیا تم نے میرے اعتبار کا خون؟ میری محبت کا مذاق بنا کر رکھ دیا تم نے ارم رحمن! محبت کے دعوے مجھ سے کرتے کرتے کیوں کسی اور کو بھی ہماری محبت میں شریک بنا لیا تم نے۔“ وہ بھی آج بچ پڑی تھی۔

”تم نے میری محبت کو خطوں کو خطوں لکھوں گا۔ وہ بھی ایک بار دور میں کسی لڑکی کو خطوں کو خطوں لکھا ہوں۔ مگھیر کے ہوتے ہوئے اشتیاق فارغ اور پاگل لکھا ہوں میں تمہیں۔“ آواز ارم کی بھی بلند ہوئی تھی۔

”تمہیں دنیا سے بٹ کر چلنے کا شوق ہے ناں۔ تم ایسا کر بھی کر سکتے ہو ارم۔“ وہ منہ پھیر کر جواب دے رہی تھی۔ یہ جانے بیکر کس کا یہ کھیلنا لب لباب ارم کے دل کو چیر رہا ہے۔

”یقین نہیں آ رہا کہ تمہاری بدگمانی اس حد تک بڑھ چکی ہے، صبح سے بتاؤ۔ اب کیا چاہتی ہو تم۔“ وہ اب اس کے سامنے رو برو کھڑی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔

”اب ہمارے رشتے کے ختم ہونے کا فیصلہ

اس لڑکی کی گواہی پر ہوگا۔ جب تک وہ نہیں آ جاتی میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ میں پھر سے تمہاری چٹکی چڑی باتوں میں پھنس کر ساری عمر تمہارے ہاتھوں بے وقوف بنی رہوں۔ جب تک حقیقت سامنے نہیں آ جاتی تب تک بھول جاؤ مجھے ارم رحمن۔“ وہ من و عنون وہی کہہ رہی تھی جو میونہ نے اسے سکھایا تھا۔ میونہ دو دروازے کی اوٹ سے ان دونوں کی ساری باتیں سن رہی تھی۔ شامکے کی گرفتار من اس کی مرضی کے مطابق تھی۔

”ٹھیک ہے اگر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ خط میں نے لکھے ہیں، پھر..... پھر کیا کرو گی تم؟ یقیناً یہی سوچ رکھا ہوگا تم نے۔“ ارم کی کینٹی کی ریلیں سن گئی تھیں شامکے کے خیالات جان کر۔ وہ اب صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شامکے کے دل میں کتنا زہر بھر چکا ہے

اس کے خلاف۔

”تمہیں اسی وقت مجھ سے سب کے سامنے معافی مانگنے ہوگی اور اس لڑکی سے اپنا ہر طرح کا ناجائز تعلق ختم کرنا ہوگا۔“ وہ اب اس کی آنکھوں میں نہایت نفوس لکھ میں کہہ رہی تھی۔

”اور اگر اس نے صاف کہہ دیا کہ یہ خط میں نے نہیں لکھے پھر؟“ وہ مزید دو قدم آگے ہوا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو، پھر تو سارا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔“ وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔ ارم طنز پر انداز میں مسکرایا۔

”ٹھیک ہے مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ اگر یہ ثابت ہوا کہ خط میں نے لکھے ہیں تو میں سب کے سامنے معافی مانگوں گا تم سے۔ مگر دوسری صورت میں میں کسی بھی میری شرط ماننی ہوگی۔“ ارم نے بھی اب ارم کو بے اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”کیسی شرط؟“ شامکے چونک اٹھی۔

”اگر اس لڑکی نے میرے حق میں گواہی دی تو میں تم سے مستبردار ہونا پڑے گا۔ پھر بھول جانا سب کے سامنے معافی مانگنی ہوگی۔ جس طرح معافی میں شادی سے انکار بھی سب کے سامنے کروں گا۔“ وہ دروازے کے کھٹکے میں کھتا ایک تیز نظر شامکے اور پھر دروازے کی اوٹ سے جھانکتی میونہ پر ڈال کر تن فن کر رہا تھا۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں ارم! میری بات کا جواب دو۔“

”صبح سویرے کی فلائٹ ہے، مجھے اسلام آباد ایک انتہائی اہم کس کے سلسلے میں جانا ہے۔ کچھ دن وہیں رہوں گا میں۔“ ارم نے انتہائی مختصر الفاظ میں انہیں آگاہ کیا۔

”تم اسلام آباد جا رہے ہو اور مجھے اب بتا رہے ہو اور یہ جو جاتے جاتے اتنا بڑا بکھیرا کر کے جا رہے ہو، اسے کون سمیٹے گا۔“ وہ اب اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے نکلیں۔

”کون سا بکھیرا؟ میں تو سارے بکھیرے سمیٹ کر جا رہا ہوں۔“ ارم نے قطعیت سے کہا۔

مختصر تھیں۔

”تم ایسا فیصلہ کیسے کر سکتے ہو ارم! تم اپنے الفاظ واپس لو۔“ عفت آرانے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ سب میرے حوالے سے رائے قائم کرنے آزاد ہیں۔“ ارم نے بھی سے جواب دیا۔

”تم پاگل ہو گئے ہو ارم! تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ کیا کر آئے ہو۔ تم نے راحت کے گھر جا کر شامکے کو شادی سے انکار کیوں کیا۔ ایک کھرام برپا ہے وہاں۔“ رحمن احمد نے بھی چپ کی قفل توڑی اور غصے سے گرجے۔ مگر وہ ان سب کی باتوں کو نظر انداز کرتا سیڑھیاں چڑھتا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

عفت آرا اس کے پیچھے پیچھے کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ ارم نے کمرے میں آ کر بڑی پھرتی کے ساتھ ہینڈ بیک الماری کے اوپر سے اتارا اور اس میں اپنے کپڑے بھرے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر عفت آرا کے اوسان خطا ہو گئے۔

”یہ..... یہ تم اپنے کپڑے کیوں پیک کر رہے ہو ارم! تم کہاں جا رہے ہو آخر؟“ ارم خاموش رہا۔

عفت آرا کی بے چینی مزید بڑھتی چلی گئی۔ مستقل خاموشی پر وہ اس کا بازو دھکی سے تھام کر کہنے لگیں۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں ارم! میری بات کا جواب دو۔“

”صبح سویرے کی فلائٹ ہے، مجھے اسلام آباد ایک انتہائی اہم کس کے سلسلے میں جانا ہے۔ کچھ دن وہیں رہوں گا میں۔“ ارم نے انتہائی مختصر الفاظ میں انہیں آگاہ کیا۔

”تم اسلام آباد جا رہے ہو اور مجھے اب بتا رہے ہو اور یہ جو جاتے جاتے اتنا بڑا بکھیرا کر کے جا رہے ہو، اسے کون سمیٹے گا۔“ وہ اب اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے نکلیں۔

”کون سا بکھیرا؟ میں تو سارے بکھیرے سمیٹ کر جا رہا ہوں۔“ ارم نے قطعیت سے کہا۔

<https://www.UrduTubes.com/>

”شام تک سے رشتہ ختم کر کے تم نے کون سا بکھیرا
 میٹھا ہے۔“ وہ اب گھورتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔
 ارم اپنے سارے کام روک کر وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور
 ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔

نظر میں۔ لیکن دکھ تو آپ لوگوں کو بھی نہیں ہوگا کیونکہ کچھ ایسی ہی سوچ تو آپ لوگوں کے ذہنوں میں بھی پختی ہے مجھ جیسے بدکردار بیٹے کے لیے۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

”ویسے آپ لوگوں کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ سب کا تو کامل یقین ہے کہ وہ خط میں نے لکھے ہیں اور غالب امکان بھی یہی ہے کہ اس لڑکی کی گواہی بھی مجھ پر الزام تراشی پر مبنی ہوگی

انہوں نے آپ لوگوں کو فکر کس بات کی۔ آپ خالہ کو تسلی
اسے دینے کا کہہ کر ام ان کی بیٹی کی زندگی میں نہیں،
بڑی زندگی میں پرہیز ہوا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ ان سب
کوٹھے میں ڈال کر کرے سے باہر چلا گیا۔

اسلام آباد کے باہر تھا۔ چند ایک دنوں میں اس نے اپنے سفر اسلام آباد سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اترنے کے بعد رابطہ منقطع کر کے وہ اب لیپ ٹاپ کھولے

اسکرین کی جانب متوجہ تھا۔ بریف کیس سے کچھ انتہائی اہم دستاویز نکال کر اس نے اپنے سامنے میز پر پھیلا دیں۔ دفعتاً اس کا موبائل بج اٹھا۔ آنے والی کال ادارے کی جانب سے آئی تھی، وہ کال پر مصروف ہو گیا۔

حال ہی میں بڑھتے ہوئے انسانیت کو دہلا دینے والے، لرزہ خیز واقعات نے کریمنل انوسٹی گیشنل ڈیپارٹمنٹ کو بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر ڈالا تھا اور ادارے نے ان انسانیت کے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے انتخاب ارم کا کیا تھا۔ ارم کے ہمراہ اس کی پوری ٹیم اس اہم نوعیت کے کیس پر کام کر رہی تھی، جس نے اپنے منجر مختلف علاقوں میں پھیلار کھے تھے اور آج اسلام آباد پہنچتے ہی ارم کو کئی اہم اطلاعات بھی موصول ہوئی تھیں۔

سے رابطہ نہ کیا تھا مگر اس بات پر وہ خوشی سے بھولی
 بھی نہ سانی تھی کہ جس شخص کی ایک نظر کی وہ بھیمنی،
 وہ شخص خود اس کی توجہ کا مرکز تھا۔ ساری رات اس نے
 شاد و کوشل ویب سائٹس پر تلاش۔ اگر وہ فن گلوکاری
 سے تعلق رکھتا تھا تو لازمی طور پر اسے ان کوشل ویب
 سائٹس پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ مگر اسے حیرانی نے
 گھیر لیا کیونکہ شاد و ان ویب سائٹس پر کہیں بھی نہ
 تھا۔

گروپ کے ساتھ قطار میں لگا کر ان درختوں کی جانب بڑھ گئی۔ ماہین کو قصد اُس نے نہیں بتایا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ بات پھیلے۔ یہ سراسر اس کی ذمہ داری تھی کہ بچوں کو نظر رکھے اور وہ فضول سوچوں میں گھر کر غفلت برت نہ لے۔

اس کے قدموں کی رفتار مزید تیز ہو گئی تھی یہاں تک کہ وہ بھاگنے لگی۔ تعاقب میں آئی ان پر اسرار قدموں کی آواز بھی تیز ہونے لگی۔

دوران سفر بھی مل جائے تو کیا ہی بات ہے۔ اسکی نظریے کے تحت انہوں نے شادور اور اسی کے دوستوں کو بل اسٹیشن ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی اور اب اس آڑے وقت میں انہیں بے اختیار ان تینوں کا خیال آتا تھا۔ اس اجنبی دیار میں اس واقعے کے بعد وہ جیسا سانی کسی غیر براعظم نہیں کر رہے تھے، اس وقت انہیں شادور اور اس کے ساتھیوں کی اشد ضرورت تھی، وہ شادور کا نمبر ملانے لگے۔

غیر مرئی نقطے کو گھورتا اپنی ہی کہہ گیا۔ شادور مسکرا کر رہ گیا۔

”ویسے ایک بات بتاؤ دوست!“ وہ کچھ کے وقفے کے بعد پھر بولا۔

”ہاں کہو۔۔۔!“ شادور کو وہ دلچسپ سا انسان اچھا لگتا تھا۔

”وہ رومانوی داستانیں تو سنی ہوں گی ناں تم نے لیلیٰ مجنوں؟“ ہیر رانجھا والی۔

”ہاں سنی ہیں۔۔۔“ شادور نے مسکراتے ہوئے کو ہسار پر نگاہ کی۔

”تم بھی ان ہی لوگوں جیسے لگتے ہو۔ من مو جی، اپنے عشق میں جینے والا، اپنی دنیا آپ بنانے والا۔“ وہ مزے سے کہہ رہا تھا۔

”کمال کرتے ہو یا۔۔۔ ایک ذرا سی ملاقات میں میری شخصیت کو پرت در پرت کھولنے لگ گئے تم بڑے پیچھے ہوئے آدنی ہو تم۔۔۔“ شادور کو اس کی بات پر بے اختیار ہنسی آئی تھی۔ پہاڑی لوگ، جودل میں آیا کہہ دیا۔

”بس ایسا ہی ہے۔“ وہ بھی مسکرا اٹھا۔ اسی پل شادور کا موبائل بج اٹھا۔ کال داؤد بھائی کی تھی اس نے نمبر دیکھتے ہی کال وصول کی۔ داؤد بھائی اسے عجیب ہی کہانی سنارہے تھے۔ اس کے حواس تھل ہونے لگے۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا پریشان سا اونچائی کی جانب بڑھنے لگا۔

”سب خیر ہے ناں دوست۔ اچانک کدھر جارہے ہو۔“ شادور کو پریشان دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

شادور نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر اسے بتانے لگا۔ ”چیز لفٹ کے مقام پر شہر سے ایک اسکول کا گروپ آیا ہے۔ اس گروپ سے دو بچیاں اور ایک استانی جنگل میں کہیں کھو گئے ہیں۔ ان لوگوں سے میری اچھی سلام دعا ہو چکی ہے۔ ان ہی کی طرف جارہا ہوں۔“ شادور اب تک اس بات سے انجان تھا

کہ جنگل میں کھونے والی استانی کوئی اور نہیں وہ سنہری لڑکی ہے۔

”میں بھی ساتھ چلتا ہوں دوست۔ یہ جنگل ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ میں تم لوگوں کی مدد کروں گا۔“

”چلو پھر جلدی آجاؤ۔“ شادور اسے اشارہ کر کے آگے بڑھنے لگا۔

”دوست اس طرف سے نہیں۔ اس طرف سے چلو۔ سیدھے۔۔۔“

جانب اشارہ کر کے آگے بڑھنے لگا۔ شادور تیز قدموں کے ساتھ اس کی تقلید کرنے لگا۔

”ویسے نام کیا ہے تمہارا دوست۔“ شادور کو اچانک خیال آیا۔

”نور محمد۔۔۔!“ نور محمد کسی چست جیتے کی مانند چڑھائی پر چڑھتے ہوئے گویا ہوا۔

☆ ☆ ☆

”ارے عفت خالہ! آپ تو جانتی ہیں شائلہ کے مزاج کو جو آپ کے سامنے اس کا اخلاق ہے ناں

در پردہ کچھ اور ہے۔ کیا بتاؤں اس دن ارم بھائی کی شائلہ نے کتنی بے عزتی کی تھی۔ وہ تو ارم بھائی کا حوصلہ ہے جو وہ خاموشی سے سہہ گئے۔ کوئی اور ہوتا تو اسی وقت رشتہ ختم کر کے چلا جاتا۔“ عفت آرا اور رحمن احمد آج شائلہ کے گھر آئے تھے۔ رحمن احمد تیور حسن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور عفت آرا لاؤنج میں بہن کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ وہ شائلہ کو بلانے کے لیے منظر سے ہنسی نہیں کہہ میمونہ نے اپنی زبان کے جوہر دکھانا شروع کر دیے۔

”کل تو ماموں جان نے شائلہ کو بہت ڈانسا اور سمجھایا ہے تب جا کر اس کا غرور اور فظانہ کچھ کم ہوا۔“

”در نہ تو اسے ارم بھائی پر اب بھی بے حد غصہ ہے حتیٰ کہ آپ کو بھی وہ اس سارے قصے کا ذمہ دار ٹھہرائی ہے۔“

”میمونہ اپنی شرانگیزیوں میں مصروف تھی جب دروازے پر شائلہ آن کھڑی ہوئی۔ لمحے بھر میں میمونہ کی اصلیت پھل کر اس کے سامنے آگئی شک تو اسے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

میمونہ کے اکسانے پر اس نے ارقم سے وہ سب کچھ لہا تھا اور اب جب وہ مشکل میں جا پھنسی تھی تو میمونہ اس سے کئی کچھ بڑی تھی۔ مگر آج اپنے کانوں سے

میمونہ کی زہر افشانی سن کر اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس نے اپنے دل تک آستین کے سانپ کو دودھ پلایا تھا۔

”السلام علیکم خالہ جان!“ شائلہ نے ایک جتنائی ہوئی نگاہ بولکھائی۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

”ارم نے ارم سے ہونے والی جھڑپ کے بعد ہی ہو گیا تھا۔

کر بیٹھیں۔“ عفت آرا شائلہ کو ساتھ لگائے بیٹھے اسے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔

”میں شرمندہ ہوں خالہ! بے حد شرمندہ ہوں۔ میں جان گئی ہوں کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کر دیں خالہ! میں بھنگ گئی تھی۔“ وہ

پشیمان سی سر جھکا کر کہہ رہی تھی۔

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں میری بچی! مگر تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ ایسی میٹھی چہر یوں سے بچو جو

منہ پر بیٹھا بولیں اور پیچھے وار کریں۔ میمونہ تو بے نقاب ہو گئی۔ مگر زندگی میں کئی میٹھی چہریاں ملیں گی

تمہیں کہ تمہاری بے خبری میں تمہیں لوگوں کی نظروں سے گرا ڈالیں گی۔

ایسے لوگوں کو پہچانو۔۔۔ اپنی عقل سے سوچا کرو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھو اور وہی بولو جو تمہیں سچ لگے۔

اس بار تو ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر بار بار تم یہی غلطیاں دہرائی تو تمہارا جاؤ گی۔ زندگی کھیل نہیں ہے جو اسے جذباتی فیصلوں کی نذر کر دیا جائے۔ یہ ایک

نقمت ہے۔ اسے اپنے لیے عذاب نہ بناؤ میرے بچے۔“ عفت آراء کا پی دیر تک اسے سمجھاتی رہیں۔ راحت آرا بھی وہاں آ بیٹھیں، دل ہی دل میں بہن اور بھانجے سے بدگمان ہونے پر وہ بھی شرمندہ تھیں۔

کل انہوں نے عفت کو فون کر کے شائلہ کی طرف سے معافی مانگی تھی۔ عفت نے بڑی بہن ہونے کے ناتے بڑا پیٹ دکھاتے ہوئے بردباری کا مظاہرہ کیا تھا اور آج وہ لوگ ملنے آ گئے تھے۔ عفت آرا کا ارادہ تھا

کہ بہن اور بھانجی کو میمونہ کے حوالے سے آگاہ کریں گی مگر یہاں میمونہ کی جلد بازی خود گلے بڑگئی اور عفت آرا کو ان دونوں کو سمجھانے کی زیادہ کوششیں نہ

کرنی پڑیں۔

”خالہ! ارم نے تو صاف کہہ دیا کہ میں اس سے دستبردار ہو جاؤں۔“ وہ ساری بات سمجھ چکی تھی۔ اپنی کوتاہیوں کے بعد اسے ارم کا خیال آیا روہا نسی ہو گئی۔

”کہا تو تم نے بھی اسے بہت کچھ تھا۔ ظاہر ہے

کچھ نہ کچھ رد عمل پھر وہ بھی دے گا ناں شانکہ! اسے تم سے جو شکایت ہے تم اسے خود سے دور کرنے کی کوشش کرو۔ باقی معاملہ چھوڑ دو، میں سنجال لوں گی۔

اور جہاں تک خط والی بات ہے تو جب تک پڑوس والوں کی بچی گھر نہ آجانی اس پر کوئی بات نہیں کرے۔ جلد بازی اور جذباتی پن پہلے ہی ہم سب کو کافی ہنگامہ دے گا۔

”نفت آرا کی بی بی کی بات راحت آرا اور شانکہ کو بھی کافی حد تک مطمئن کر گئی۔ وہ گھر سے طے کر کے آئی تھیں کہ ساری ابھی ڈوریں آج سلجھا کر ہی دم لیں گی۔

میمونہ کا داؤد آج الٹا اس پر پی چل گیا تھا اور وہ دم کئی لمبوتری کی طرح سوچ سوچ کر پھل ہوئی تھیں۔

مطلب: اس مامی کی نظروں سے بھی گر جاتا تھا۔

”اب کیا کروں۔ کیسے ان سب کو رام کروں۔“ وہ اپنی سوچوں میں مگھت سے اتر کر کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر کمرے کے منظر نے اسے ٹھکنے پر مجبور کر دیا۔

شانکہ اور مامی خوش گوار موڈ میں باتیں کرتے ہوئے اس کے کپڑے اور دیگر سامان اس کے بیگ میں ٹھونس رہی تھیں۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ۔۔۔۔۔“ وہ ہلکا سے ہنسنے لگی۔

”تمہارا سامان بیک کر رہے ہیں۔“ شانکہ نے بیتی نکال کر جواب دیا۔

”میمونہ بیٹا! ہمارے خیال سے اب تمہیں گھر جانا چاہیے۔ یہاں تو کافی گل کھلا لے۔ میرا مطلب ہے کافی دن لگا دے۔ اب ذرا اپنے گھر کی بھی خبر لو۔ اچھی لڑکیاں اپنا گھر یا چھوڑ کر یوں کسی کے گھر پر ڈیرہ ڈال کر ٹھوس بیٹھ جاتی ہیں۔ بے وقوف لڑکی! راحت نے بڑے پیار سے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔ میمونہ کھیا کر رہ گئی۔

”شانکہ بیٹا! یہ باجولا کی بوتل بھی میمونہ کے سامان میں ڈال دو۔“ جاتے جاتے راحت آرا شانکہ

کو باجولا کی بوتل دے گئیں۔

”مگر یہ باجولا کی بوتل کس لیے؟“ میمونہ بے اختیار پوچھتی تھی۔

”وہ تم سے کسی کی خوشیاں منعم نہیں ہوتی ہیں ناں۔ اس لیے اسی نے خاص تمہارے لیے باجولا کی بوتل رکھوائی ہے تاکہ جب تمہیں کسی کی خوشی دیکھ کر بدعظمی ہو جاؤ تو تمہیں باجولا کا استعمال ہو سکے۔ ایک گولی پٹ سے کھا لو تاکہ خوشی ف سے بھرا ہو جائے گی۔“ شانکہ نے بڑے پیار سے جوتے کمر مارے تھے۔ میمونہ شرم سے پانی ہو کر رہ گئی۔ دوسروں کے لیے ذلت کا سامان پیدا کرنے والے خود بھی ہمیشہ ذلیل ہوتے ہیں۔ مگر شانکہ نے لوگوں کے لیے ایک باری رسوائی کافی نہیں ہوتی۔ انہیں بار بار ایسے ڈور چاہیے ہوتے ہیں۔ ہلکا سی طرح جس طرح کھایا منعم کرنے کے لیے باجولا چاہیے ہوتا ہے۔

☆☆☆

وقت بیتا جا رہا تھا۔ سورج اپنی کرنوں سے کسی اور سمت رخت سفر باندھنے کو تیار تھا۔ چاند بھی اگلے کرنوں کے چالے بھی رفتہ رفتہ ہٹا رہا تھا۔ لگے تھے۔ شام کے گیلے، مہکتے ہوئے نم ہوا سامنے فلک کی بلندی کو چھوئے کو سار پر اپنے پیر چھلانے کی تیارتھے۔ ایسے میں مزید بیتی کے چہرے کے سامنے خطرناک حد تک زور پڑتی جا رہی تھی۔ فکر کے سائے ماہین کے کشادہ چہرے پر بھی لڑاں تھے اور چچاں خوف زدہ سی جنگل کے اس جھے کی جانب اٹھنے پر تھیں۔ جہاں سنبل اور داؤد بھائی شانہ اور نور محمد کے ساتھ مس اسٹوڈنٹس کوڈھونڈنے لگے تھے۔

حسن اور زوار مزید بیتی کے ہمراہ کھڑے تھے اور ارد گرد کے مقامی لوگوں سے ان علاقوں کی معلومات لے رہے تھے۔ ایک مقامی شخص نے بتایا کہ گزشتہ چھ ماہ میں اس نوعیت کا دوسرا واقعہ ہے اس سے قبل اس علاقے میں ایک بلی کو اپنے چھ سالہ

بچے سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

ان خوفناک حقائق کو جان کر ان سب کا دل لرزا اٹھتا۔

”یا اللہ خبر رکھنا ہم سب پر۔۔۔۔۔ جو ہم سے کھوئے، انہیں خیر و عافیت سے ملا دے ہمیں حزیں کی آزمائش میں نہ ڈالنا میرے مولا۔“ مزید بیتی کا بچہ دل سے دعا کرتا تھا۔

”دن ڈھلتے کو ہے۔“ خواتین اور بچوں کا یہاں پر جانا مناسب نہیں۔ ان پہاڑی علاقوں کے جلوے کی ہیں۔ دن کی روشنی میں خوب صورت نظر آنے والی پہاڑی وادیاں، شام اترتے ہی خوف ناک ادب دھار بن جاتی ہیں۔ نور محمد نارنج کی روشنی میں انہیں پریموں کے نشان تلاش کرتے ہوئے کھد رہا تھا۔

داؤد بھائی اور شانہ تاریک چہروں کے ساتھ اس کے پیچھے اپنے چاروں اطراف نظر دوڑاتے چل کر کھونے والی لڑکی وہ ہے جو آج کل اس کے دل میں گھس رہی ہے۔

نور محمد اس کے ساتھ چل رہی ہے۔ جب سے اس نے ان کے گھر سے زائد گھر جانے کے باوجود بھی ان کے گھر کے سامنے کھڑی ہو کر گھبراہٹ میں دیکھا۔

”نور محمد! ہم اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈنے بنا نہیں جاسکتے۔“ داؤد بھائی نے کچھ برا مناتے ہوئے کہا۔

”آپ نہ جاؤ داؤد بھائی۔ مگر اپنے لوگوں کو بھیج دو۔ گورنوں اور بچوں کا یہاں کچھ نامناسب نہیں سمجھا۔ دوست! یہ تمہارا شہر نہیں جو آدھی رات میں بھی رات بھر میں بھیا رہتا ہے۔ یہاں شام بھی گہری تاریکی کی روشنی میں بخور کچھ تلاش رہا تھا۔

ان لوگوں کو یہاں سے روانہ کر دیتے ہیں۔ باقی ہم یہاں اس وقت تک یہاں سے نہ جائیں گے جب

تک کھونے والے مل نہ جائیں۔“ شانہ کا مشورہ داؤد بھائی کو مناسب لگا اور اس پر راضی ہو گئے۔ شانہ نے زوار کو داؤد بھائی نے مزید بیتی کو تمام مسائل سے آگاہ کر دیا۔ معاملے کی سبب کو سمجھتے ہوئے نور محمد بیتی زوار اور حسن کے ساتھ ہوئے جانے پر راضی ہو گئے۔ ویسے بھی یہاں بھی وہ لوگ ان ہی دونوں لڑکوں کی حفاظت میں تھیں۔ شانہ نے زوار اور حسن کو ان لوگوں کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ وہ لوگ جلد ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔۔۔ یہ بھاگتے قدموں کے نشان ہیں۔ اس سمت کو جاتے ہیں۔“ نور محمد اچانک جوش سا چلا یا۔ وہ تینوں نشانوں کے تعاقب میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ کچھ دیر مزید آگے بڑھنے کے بعد انہیں سنبل کا دوپٹا جھاڑیوں میں الجھا نظر آیا۔ شانہ نے بے اختیار وہ دوپٹا تھام لیا۔ آج دوپہر میں اس نے آخری بار اسے اسی زرد رنگ کے دوپٹے میں دیکھا تھا۔ شانہ کی نگاہوں میں سنبل کا چہرہ گھوم گیا۔

”یہ سنبل کا ہے۔“ داؤد بھائی نے شانہ کے ہاتھوں سے دوپٹے لے کر بخور دیکھتے ہوئے کہا۔

”دوست گڑبڑ ہے۔۔۔۔۔ کچھ گڑبڑ ہے۔“ یہ قدموں کے نشان جس راستے کو جاتے ہیں وہ خطرناک ہے۔ بے حد خطرناک۔“ نور محمد اچانک کھبرا اٹھا۔

”جس حد تک بھی خطرناک ہو نور محمد! ہمیں اس راستے پر جانا ہے۔“ شانہ نے بھنجلا کر کہا۔ اسے نور محمد سے اس بزدلی کی امید نہ تھی۔

”آپ سمجھ نہیں رہے ہو صاحب! یہ راستہ اس منحوس حویلی کی طرف جاتا ہے۔“ نور محمد نے بے چارگی سے کہا۔

”منحوس حویلی۔۔۔۔۔“ شانہ اور داؤد بھائی حیرت زدہ سے نور محمد کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”ہاں منحوس آسب زدہ حویلی!“ نور محمد تھک ہار کر وہاں بیٹھتا چلا گیا۔

”اوہو۔۔۔۔۔ صاف صاف بتاؤ نور محمد! پہیلیاں نہ

کچھ نہ کچھ دیکھ کر غلجیڑی ہو رہی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنس پڑا۔
 سے جو شکایت ہے تم اسے خود سے دور کرنے کی
 کوشش کرو۔ باقی معاملہ چھوڑ دو، میں سنبھال لوں گی
 اور جہاں تک خط والی بات ہے تو جب تک پڑوس
 والوں کی بیٹی گھر نہ آجانی اس پر کوئی بات نہیں کرے
 گا۔ جلد بازی اور جذباتی بننے پہلے ہی ہم سب کو کافی
 مہنگا پڑ چکا ہے۔“ عفت آرا کی بھی کئی بات راحت آرا
 اور شائلہ کو بھی کافی حد تک مطمئن کر گئی۔ وہ گھر سے
 طے کر کے آئی تھیں کہ ساری ابھی ڈوریں آج
 سلکھا کر ہی دم لیں گی۔

میمونہ کا داؤ آج الٹا اس پر چلی گیا تھا اور وہ دم
 کئی یومڑی کی طرح سوچ سوچ کر پاگل ہوئی تھیں
 رہی تھی۔ شائلہ کے سامنے بے نقاب ہونے کا
 مطلب ماموں، مامی کی نظروں سے بھی گر جانا تھا۔
 ”اب کیا کروں؟ کیسے ان سب کو رام کروں۔“
 وہ اپنی سوچوں میں کم چھت سے اتر کر کمرے میں
 داخل ہوئی۔ مگر کمرے کے منظر نے اسے ہنسنے پر مجبور
 کر دیا۔

شائلہ اور مامی خوش گوار موڈ میں باتیں کرتے
 ہوئے اس کے کپڑے اور دیگر سامان اس کے بیک
 میں ٹھونس رہی تھیں۔
 ”یہ..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ.....“ وہ
 ہکلاتے ہوئے بولی۔
 ”تمہارا سامان پیک کر رہے ہیں۔“ شائلہ نے
 بیٹی نکال کر جواب دیا۔

”میمونہ بیٹا! ہمارے خیال سے اب تمہیں گھر
 جانا چاہیے۔ یہاں تو کافی گل کھلا لیے۔ میرا مطلب
 ہے کافی دن لگا دے۔ اب ذرا اپنے گھر کی بھی خبر
 لو۔ اچھی لڑکیاں اپنا گھربا چھوڑ کر یوں کسی کے گھر پر
 ڈیرہ ڈال کر تھوڑی بیٹھ جاتی ہیں۔ بے وقوف لڑکی!“
 راحت نے بڑے پیار سے اس کے سر پر چپت لگاتے
 ہوئے کہا۔ میمونہ کھسیا کر رہ گئی۔

”شائلہ بیٹا! یہ ہاجولا کی بوتل بھی میمونہ کے
 سامان میں ڈال دو۔“ جاتے جاتے راحت آرا شائلہ

کو ہاجولا کی بوتل دے گئیں۔
 ”مگر یہ ہاجولا کی بوتل کس لیے؟“ میمونہ نے
 اختیار پوچھ لیا۔
 ”وہ تم سے کسی کی خوشیاں ہمیں نہیں ہوتی ہیں
 ناں۔ اس لیے امی نے خاص تمہارے لیے ہاجولا کی
 بوتل رکھوائی ہے تاکہ جب تمہیں کسی کی خوشی دیکھ کر
 بدبختی ہونے لگے تو تم جھٹ بھجولا کی بوتل کھلو۔
 ایک گولی پلٹ کے کھالو تو کسی کی خوشی کے
 ہو جائے گی۔“ شائلہ نے بڑے پیار سے جوتے بچو
 کر مارے تھے۔ میمونہ شرم سے پالی ہو کر رہ گئی۔
 دوسروں کے لیے ذلت کا سامان پیدا کرنے
 والے خود بھی ہمیشہ ذلیل ہوتے ہیں۔ مگر شائلہ جیسے
 لوگوں کے لیے ایک باریک روائی کافی نہیں ہوتی۔
 انہیں بار بار ایسے ڈوڑ چاہیے ہوتے ہیں بالکل اسی
 طرح جس طرح کھایا ہضم کرنے کے لیے ہاجولا
 چاہیے ہوتا ہے۔

☆☆☆

وقت بیتا جا رہا تھا۔ سورج اپنی کرنوں سمیت کئی
 اور سمت رخت سفر باندھنے کو تیار تھا۔ بیڑوں میں
 انکے کرنوں کے جالے بھی رفتہ رفتہ صاف ہونے
 لگے تھے۔ شام کے گیلے، مہکتے ہوئے عجم آلود سامنے
 فلک کی بلندی کو چھوئے تو ہمارے اپنے پر پھیلائے کو
 تیار تھے۔ ایسے میں مزید صدیقی کے چہرے کی رنگت
 خطرناک حد تک زرد پڑنی جا رہی تھی۔ فکر کے سائے
 بائیں کے کشادہ چہرے پر بھی لرزاں تھے اور بچیاں
 خوف زدہ سی جنگل کے اس حصے کی جانب امید دیاں
 بھری نظروں سے تیک رہی تھیں۔ جہاں گھنٹہ گھر پہلے
 داؤد بھائی شاور اور نور محمد کے ساتھ مس سنبھل اور
 اسٹوڈنٹس کو ڈھونڈنے لگے تھے۔

محسن اور زوار مزید صدیقی کے ہمراہ کھڑے تھے
 اور ارد گرد کے مقامی لوگوں سے ان علاقوں کی
 معلومات لے رہے تھے۔ ایک مقامی شخص نے بتایا
 کہ گزشتہ چھ ماہ میں اس نوعیت کا دوسرا واقعہ ہے۔
 اس سے قبل اس علاقے میں ایک فیملی کو اپنے چھ سالہ

بچے سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔
 ان خوفناک حقائق کو جان کر ان سب کا دل لرزا
 اٹھتا تھا۔

”یا اللہ خبر رکھنا ہم سب پر..... جو ہم سے
 کھو گئے، انہیں خیر و عافیت سے ملا دے ہمیں مزید کسی
 آزمائش میں نہ ڈالنا میرے مولا۔“ مزید صدیقی
 کا نڈھال سے دھماکا لگ رہا تھا۔ کچھ یہی حال
 بائیں کا بھی تھا۔

”دن ڈھلنے کو ہے۔“ خواتین اور بچوں کا یہاں
 ٹھہرنا مناسب نہیں۔ ان پہاڑی علاقوں کے جلوے
 کی ہیں۔ دن کی روشنی میں خوب صورت نظر آنے
 والی یہ پہاڑی وادیاں، شام اترتے ہی خوف ناک
 روپ دھار لیتی ہیں۔“ نور محمد تاریخ کی روشنی میں
 زمین پر بچروں کے نشان تلاش ہوئے کہہ رہا تھا۔
 داؤد بھائی اور شاور تاریک چہروں کے ساتھ اس کے
 پیچھے پیچھے اپنے چاروں اطراف نظر دوڑاتے چل
 رہے تھے۔ شاور کو یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا تھا
 کہ کھونے والی لڑکی وہ ہے جو آج کل اس کے دل
 دوامی رہی ہے۔ تب سے اس
 کی پریشانی سوا ہو چکی تھی اور سب سے تاریک پہلو یہ
 تھا کہ گھنٹہ گھر سے زائد گزر جانے کے باوجود بھی ان
 تینوں گمشدگان کا کوئی سراغ نہیں تھا۔

”نور محمد! ہم اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈے بنا نہیں
 جاسکتے۔“ داؤد بھائی نے کچھ برا مناتے ہوئے
 قطعیت سے کہا۔

”آپ نہ جاؤ داؤد بھائی۔ مگر اپنے لوگوں کو بھیج
 دو۔ غورتوں اور بچوں کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ سمجھا
 کرو دوست! یہ تمہارا شہر نہیں جو آدمی رات میں بھی
 روشنیوں میں نہ پایا رہتا ہے۔ یہاں شام بھی گہری
 رات برابر ہوتی ہے۔“ نور محمد اب ایک جگہ بیٹھ کر
 تاریخ کی روشنی میں بخور کچھ تلاش رہا تھا۔

”ایسا کرتے ہیں۔ محسن اور زوار کی نگرانی میں
 ان لوگوں کو یہاں سے روانہ کر دیتے ہیں۔ باقی ہم
 تینوں اس وقت تک یہاں سے نہ جائیں گے جب

تک کھونے والے مل نہ جائیں۔“ شاور کا مشورہ داؤد
 بھائی کو مناسب لگا اور اس پر راضی ہو گئے۔ شاور نے
 زوار کو داؤد بھائی نے مزید صدیقی کو تمام مسائل سے
 آگاہ کر دیا۔ معاملے کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے مزید صدیقی
 زوار اور محسن کے ساتھ ہوٹل جانے پر راضی ہو گئیں۔
 ویسے بھی یہاں بھی وہ لوگ ان ہی دونوں لڑکوں
 کی حفاظت میں تھیں۔ شاور نے زوار اور محسن کو ان
 لوگوں کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ وہ لوگ
 جلد ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

”یہ..... یہ دیکھو..... یہ بھاگتے قدموں کے
 نشان ہیں۔ اس سمت کو جاتے ہیں۔“ نور محمد اچانک
 جوش سا چلایا۔ وہ تینوں نشانوں کے تعاقب میں آگے
 بڑھتے چلے گئے۔ کچھ دیر مزید آگے بڑھنے کے بعد
 انہیں سنبھل کا دوپٹا جھانڈیوں میں الجھا نظر آیا۔ شاور
 نے بے اختیار وہ دوپٹا تمام لیا۔ آج دوپہر میں اس
 نے آخری بار اسے اسی زرد رنگ کے دوپٹے میں
 دیکھا تھا۔ شاور کی نگاہوں میں سنبھل کا چہرہ گھوم گیا۔
 ”یہ سنبھل کا ہے۔“ داؤد بھائی نے شاور کے
 ہاتھوں سے دوپٹا لے کر بخور دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”دوست گڑبڑ ہے..... کچھ گڑبڑ ہے۔“ یہ
 قدموں کے نشان جس راستے کو جاتے ہیں وہ
 خطرناک ہے۔ بے حد خطرناک۔“ نور محمد اچانک گھبرا
 اٹھا۔

”جس حد تک بھی خطرناک ہو نور محمد! ہمیں اس
 راستے پر جانا ہے۔“ شاور نے جھنجھلا کر کہا۔ اسے نور
 محمد سے اس بزدلی کی امید نہ تھی۔

”آپ سمجھ نہیں رہے ہو صاحب! یہ راستہ اس
 منحوس حویلی کی طرف جاتا ہے۔“ نور محمد نے بے
 چارگی سے کہا۔

”منحوس حویلی.....“ شاور اور داؤد بھائی حیرت
 زدہ سے نور محمد کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”ہاں منحوس آسب زدہ حویلی!“ نور محمد تھک ہار
 کر وہاں بیٹھتا چلا گیا۔

”اوہو..... صاف صاف بتاؤ نور محمد! پہیلیاں نہ

بجھاؤ۔“ شاور جھنجھلا اٹھا تھا۔ ویسے ہی سنہری لڑکی کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی اور یہ نور محمد جن بموتوں کی داستان سنانے بیٹھ گیا۔

”بتاتا ہوں صاحب! سب بتاتا ہوں۔“ نور محمد وارث پچا شکور سے لے کر اب تک وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات ان سب کے گوش گزار کرنے لگا۔ شاور اور داؤد بھائی دم سادھے وہ سارے واقعات سننے لگے۔ واقعات واقعی اتنے خوف ناک تھے کہ ان کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

”ابھی حال ہی میں کچھ بچے بھی اس حویلی کی بجینٹ چڑھ گئے ہیں۔ وہ لوگ ٹھیل ٹھیل میں اس حویلی کے اندر چلے گئے تھے اور آج تک ان کا کچھ اتا پتا نہیں چلا۔“ نور محمد اپنی دھن میں کہتا جب ساری بات مکمل کر چکا تو اس کی آخری بات پر شاور یک دم چونک اٹھا۔

”مجھے یہ کوئی اور ہی معاملہ لگ رہا ہے۔ میں اس حویلی میں جانا چاہتا ہوں۔“ وہ مصمم ارادہ کیے اٹھا۔ ”پاکل ہو رہے ہو شاور! پہلے ہی ہم اتنے پریشان ہیں اور تمہیں ایڈوچر سوچ رہا ہے۔“ داؤد بھائی ہنسی سے بولے۔

”بات ایڈوچر کی نہیں ہے داؤد بھائی۔ اس حویلی میں واقعی کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ بچوں کا غائب ہونا معمولی بات نہیں اور دیکھیں آپ کے اسکول کی بھی بچیاں غائب ہوئیں اور ایک استانی بھی۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ معاشرے میں کتنی ہی برائیاں جڑ پکڑ چکی ہیں اور اتنی دیر سے ہم لوگ اس جنگل میں خاک چھاتے پھر رہے ہیں۔ صرف ایک دوپٹے کے علاوہ مزید کوئی سرائے نہ ملا۔ اگر ان تینوں کے غائب ہونے میں خدا خواستہ کسی جانور کا ہاتھ ہوتا تو اب تک ہمیں کچھ نہ کچھ نشان مل چکے ہوتے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں داؤد بھائی۔ یہ کریمنٹل کیس بھی ہو سکتا ہے۔“ شاور ایک ایک بات پر زور دیتا کہہ رہا تھا۔

”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“ یقیناً داؤد بھائی کو

بات کچھ کچھ سمجھ میں آئی تھی۔ ”میں جانتا ہوں کیا کرنا چاہیے۔“ شاور یہ کہہ کر موبائل پر کال ملانے لگا۔

☆☆☆

ارقم اس وقت میٹنگ ہال میں اپنی ٹیم کے ساتھ انتہائی اہم نوعیت کی گفتگو میں مشغول تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس کے سر پر شان کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ مگر وہ اس وقت شان سے بات نہیں کر سکا۔

”اہم میٹنگ میں مصروف ہوں۔ فوراً سے بات کرتا ہوں۔“ جلد ہی شان کی جانب سے جوابی پیغام موصول ہوا۔

”بات کرنا انتہائی ضروری ہے تمہاری اہم میٹنگ سے بھی زیادہ۔“ شان کا جواب پڑھ کر ارقم تھوڑا اٹھکا۔ ایسی کیا مصیبت آنا پڑی شان پر کہ اس وقت اس کے منع کرنے کے باوجود وہ مسلسل اصرار کرتا تھا۔ میٹنگ میں شامل ٹیم ارکان سے

کرنا شان کا نمبر ملانے لگا۔ ”ہاں کہو شان۔۔۔۔۔۔ ایسی کیا بات ہے جس سے تم نے اسے روک دیا۔“

جو اس وقت بات کرنے کے لیے آئے تھے۔ ”ارقم نے خفیہ جتنائے ہوئے رہا۔“ ارقم نے مختصر جواب دیا۔

”یہ بہت معذرت مگر یہ بات اتنی ہی اہم ہے جتنی تمہاری میٹنگ۔“ شان نے اس کی خفگی کا قصہ سمجھتے ہوئے اپنی بات کی اہمیت کا احساس دلایا۔

”ہونہر کہو پھر کیا معاملہ ہے؟“ ارقم نے اس کی طرف پریشان کی جانب متوجہ تھا۔ ”بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔“ شان اسے ملے جلے وقوع پذیر ہونے والے واقعے کی تفصیل بتاتے ساتھ ہی ساتھ اس نے مشہور زمانہ حویلی کا قصہ بھی بتا ڈالا۔

”ادھ میرے خدا یا۔۔۔۔۔۔ تم نے اس جگہ کا نام کیا بتایا پھر سے بتانا۔“ ارقم سارا قصہ سن کر بری طرح

چونک اٹھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس کی ٹیم کو اپنے اہم تجربوں کے ذریعے اس جگہ کے حوالے سے کچھ عجیب اطلاعات ملی تھیں اور شان بھی اسی جگہ کے حوالے سے تازہ ہونے والے واقعے کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”تم اس وقت کہاں ہو۔ مجھے صحیح مقام بتاؤ۔“ وہ شان کی فراہم کی گئی اطلاع کو جلدی جلدی نوٹ پیڈ پر

”ٹھیک ہے۔ میں جلد ہی تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم کیا فیصلہ لے رہے ہیں۔ تب تک تمہیں ہمیں ایک ضرور دینا ہوگا۔ اس حویلی پر جس طرح سے بھی ممکن ہو نظر رکھو۔ اگر وہ حویلی اس واقعے میں ملوث ہوئی تو غریب وہاں کوئی نہ کوئی نقل و حرکت ضرور ہوگی۔“ وہ شان کو ہدایت دے کر کال منقطع کر کے اپنی ٹیم ارکان کی جانب متوجہ ہوا۔ جو بے حد سنجیدگی کے ساتھ اس کی گفتگو سن رہے تھے۔

چند دن قبل ہی ان لوگوں کو ان علاقوں سے کچھ مشکوک خبروں کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ خاص طور پر اس علاقے سے جس کی نشاندہی ابھی ابھی شان نے کال پر کی تھی۔ ارقم چند گھنٹوں قبل ہونے والے حادثے سے متعلق اس اپنی ٹیم کو بریف کرنے لگا۔ اس عجیب و غریب شہرت کی مالک حویلی کا ذکر خاص الخاص ارقم نے کیا تھا۔ وہ سب متفقہ نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس علاقے پر ریڈ کیا جائے۔

ارقم شان کو مطلع کر چکا تھا کہ وہ اپنی ٹیم کے ہمراہ چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ جائے گا۔ مگر یہ اطلاع وہ صرف خود تک رکھے۔ شان نے اسے بے فکر رہنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔

شاور نے ان۔ کوان تمام معاملات کو فی الحال اسے تک رکھنے کی تاکید کی تھی۔ داؤد بھائی تو ان باریکیوں کو بخوبی سمجھ گئے تھے مگر نور محمد کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

”کس سوچ میں غرق ہو نور محمد؟“ شاور پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

”جب وارث اس حویلی میں گم ہو گیا تھا۔ اس دن میں نے کچھ ایسا بھی دیکھا تھا۔ جس سے اس وادی کے دیگر لوگ انجان ہیں۔ وہاں سے بھاگتے سے میں گھبراہٹ میں گر پڑا تھا اور گرنے کے باعث میں سب سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اس وقت میری نظر حویلی کے ایک ایسے حصے پر پڑی تھی جو انتہائی غیر نمایاں تھا۔ وہاں ایک بند دروازے کی درز سے مدہم مدہم روشنی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میں اس دروازے کی جانب بڑھا اور اس دروازے سے جھانکنے کی کوشش کی، نظر تو کچھ نہ آیا۔ مگر کسی کی سسکیاں ضرور سنائی دیں۔ میں نے مزید جاننے کی کوشش کی مگر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ہولے ہولے دروازے کی جانب بڑھ رہا ہو۔ میں ڈر گیا تو وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں جانتا ہوں وہاں کچھ تھا۔ شاید وہ سسکیاں میرے وارث کی ہوں۔ اس دن میں تھوڑی بہت کر لیتا تو شاید آج وارث اور شکور پچا ہم وادی والوں کے درمیان ہوتے۔“ نور محمد آب دیدہ ہو گیا۔ دل تو ان دونوں کا بھی اداس ہو گیا۔ وادی کے معصوم لوگ نہ جانے کتنے عرصے سے اس ظلم کا شکار تھے۔ شاور سوچ کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر گزری تو اس نے داؤد بھائی کو سمجھا بھرا کر نور محمد کے ساتھ گھر پہنچ دیا اور خود وہیں حویلی پر نگاہ جمائے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ایک جھپٹا کے سے کسی نے اس کے سر پر پانی اٹھایا تھا۔ اس کا جسم تھڑھکا کر رہ گیا۔ منفی درجہ حرارت میں برف جیسا ٹھنڈا پانی اس کی رگوں میں دوڑتے خون کو ٹھنڈ کرنے لگا۔ اس کے وجود میں حرکت ہوئی۔ اس کا ذہن رفتہ رفتہ بے دار ہونا شروع ہوا اور آنکھیں کھولنا چاہیں۔ مگر پوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ وہ با مشکل آنکھیں کھول پائی۔ سامنے کا منظر دھندلا ہوا تھا۔ زرد مدہم روشنی نگاہوں کو جھینے لگی۔ ایک واہیات سا تہیہ اس کی سماعتوں میں ٹونجا۔ اس نے تمام تر ہمت کے ساتھ آنکھیں پھر سے کھولنے کی

کتنے دھوکے سے ارقم سے کہہ ڈالا کہ یہاں انسانی اسمگلنگ سے جڑے جرائم پیشہ افراد چھپے ہیں اور یہاں کچھ بھی نہ ہوا تو.....“ تصویر کا دوسرا رخ اسے اب نظر آ رہا تھا۔

”اسے ہمت کر کے اس حویلی میں جانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ معاملہ کیا ہے؟“ بہت سوچ بچار کے بعد بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا۔

آہستہ آہستہ بے حد احتیاط کے ساتھ وہ حویلی کے پچھلے حصے سے نزدیک ہوتا چلا گیا۔ پچھلا حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اس کی ایک دیوار منہدم تھی۔ جس کی وجہ سے اندر جانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ اگر کوئی آمدورفت ہوتی ہوگی تو یقیناً یہیں سے ہوتی ہوگی۔ وہ دل ہی دل میں اندازے لگانے لگا۔ اگر باہر کوئی غیر معمولی حرکت ہوتی تو اندر لوگ موجود ہوتے تو وہ ضرور باہر نکلیں گے۔ مگر وہ غیر معمولی حرکت کیا ہو۔ وہ سوچنے لگا۔ اچانک اسے اپنے جینٹ کی جیب میں پڑی بانسری کا خیال آیا۔ اس نے بانسری جیب سے نکال کر لیوں سے لگائی۔ اگلے ہی پل پر اسرار کی فضا میں بانسری کی مدھن مچ گئی۔ کوہسار کے سنگھار پہاڑیوں سے گمرانی مدھر لے وادی میں گونج اٹھی۔

وہ بانسری کی دھن چھیڑ کر اب منتظر نگاہوں سے حویلی کی منہدم دیوار کو تنک رہا تھا۔ کافی دیر تک دیکھنے کے باوجود کوئی حرکت نہ ہوئی تو اس نے ایک بار بانسری کو لیوں سے چھیڑ ڈالا اور بالائی حصے کا جائزہ لینے لگا۔ تین بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جس کے پت گمان ہوتا تھا جسے صدیوں سے بند پڑے ہوں۔ تب ہی اسے ایک کھڑکی کا پت ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ اندھیرے میں اسے کوئی ہلتے پت کے پیچھے حرکت کرتا ہوا بھی محسوس ہوا۔ گپ اندھیرے میں فقط چودھویں شب کی روشنی تھی جو اس کی مددگار تھی اور اسی روشنی کی مدد سے اس نے حرکت کرتے سائے کو پہچانا تھا۔ وہ بالکل چپ سا رہ گیا۔ ممکن تھا کہ وہ سایہ اس کی موجودگی کا اثر نہ کوئی ناگہان جھانکی کر رہا تھا۔ ایسے میں

اس کی جانب سے کوئی بھی حرکت اسے مشکل میں ڈال سکتی تھی۔

کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ تبدیل کرنے کی غرض سے ہٹا ہی تھا کہ اسے اپنے کندھے پر کسی کا بھاری ہاتھ محسوس ہوا۔ وہ اچھل کر پیچھے پلٹا۔

”نور محمد تم.....!“ شادور نے حیرت سے کہا۔ اس سے قبل کہ نور محمد چلے گا۔ شادور نے حیرت سے کہا۔ اس سے قبل کہ نور محمد چلے گا۔ شادور نے حیرت سے کہا۔ اس سے قبل کہ نور محمد چلے گا۔

☆ ☆ ☆
ظاہر خان کے جانے کے بعد کتنی دیر تک وہ اپنی حرماں نصیبی پر آنسو بہاتی رہی۔ اس کے اندر احساس جاگا کہ فقط آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ اسے ہمت کرنی ہوگی۔ وہ یوں بار نہیں مانی تھی۔ ساری ہمت مجتمع کر کے بے حد مشکل سے وہ کھنکھول کے بل چلتی ہوئی، سارا اور بیاتنگ پہنچتی تھی۔ وہ دونوں بے سمدہ اونگھی پڑی تھیں۔ وہ اپنا رخ گھما کر پشت کی جانب سے سارا کے بندھے ہاتھوں کو اپنے بندھے ہاتھوں سے کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر بے سود۔ رسی بے حد مضبوطی سے بندھی تھی اور بنا دیکھے کھولے جانے پر کھل نہیں رہی تھی۔ سوئے اتفاق کہ اسی وقت بیا کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ ہوش میں آچکی تھی۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ اس کے منہ سے ٹیپ ہٹ چکا تھا۔ سنبل نے اسے اشارے سے اپنی رسی کھولنے کا کہا۔ بیا اپنے دانتوں کی مدد سے رسی کھولنے لگی۔ کچھ دیر لگی مگر رسی کھل گئی۔ اب سنبل نے جلدی جلدی سے منہ سے ٹیپ ہٹایا اور بیا کے بندھے ہاتھوں کو کھولنے لگی۔ ہاتھ کھل گئے تو پاؤں بھی آزاد ہو گئے۔ اب وہ دونوں تیزی سے سارا کی جانب بڑھیں اور اسے رسیوں کے شکنجے سے آزاد کر کے ہوش

روشنی اس کو صبح چہرے پر جو قس قس تھی۔ مگر شادور دیکھ چکا تھا سنبل کے چہرے سے شافقی عفتا ہے۔ خوف و دہشت کے شکنجے زندہ سائے ہنوز اس کے چہرے پر لرزاں تھے۔

”جس جس نے تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے میں وعدہ کرتا ہوں، وہ ضرور اپنے انجام کو پہنچے گا۔“ اس نے اس کے نرم مگر سرد پڑتے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ لیا۔

کچھ ہی ثانیے میں نور محمد پانی سے بھری بوتل کے

شادور نے نور محمد سے بوتل لے کر پانی کے چند

پانی.....!“ اس کے خشک لیوں پر خواہش جاگی، شادور نے سہارا دے کر اسے آگے کیا اور پانی کی بوتل اس کے لیوں سے لگا دی۔ پانی کا گھونٹ اس کے اندر اتر کر اسے سیراب کر گیا۔ کچھ تو اتنی ملی تو اس نے ارد گرد نظر دوڑائی سانسے وہی مہربان تھا جس پر یقین کر کے اس نے اتنی ہمت دکھائی تھی۔

”سنبل تم ٹھیک ہونا.....“ شادور اسے ہوش میں آتا دیکھ کر بے تابی سے پوچھنے لگا۔ نور محمد نے چونک کر شادور کا چہرہ دیکھا۔ سمجھ دار انسان تھا۔ اندر کی بات سمجھ کر زریب مسکرا اٹھا۔

”شادور! بیا اور سارا وہیں ہیں۔ وہ ظاہر خان..... وہ ملوث ہے.....“ وہ اب ان دونوں کو بیٹے جانے والے حادثے کی تفصیل سن رہی تھی۔ شادور کو یہ جان کر حیرت کا شدید جھکا لگا تھا کہ چائے والا

نوجوان لڑکا بھی اس گروہ میں شامل ہے۔ اسی اثناء میں کسی کے زور زور سے بولنے اور قدموں کی تیز تیز چاپ سنائی دی۔ وہ درختوں کے پیچھے جا چھپے۔

”اس لڑکی کا ملنا ضروری ہے۔ ورنہ باس ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اے گدھے کچا چبا جائے گا وہ ہمیں۔“ جانتا نہیں تو اسے کہ وہ کتنا ظالم ہے۔

”ہاں جانتا ہوں اس کے بارے میں! مگر وہ کم بخت ظاہر کو زخمی کر گئی ہے اور اب اگر وہ وادی میں جا نکلی تو وہاں کے بے وقوف لوگوں کو بھی ہمارے دھندے کا علم ہو جائے گا۔ پھر جاتے ہونا کتنا برا ہوگا ہمارے ساتھ۔“ وہ دوہنے لگے نوجوان تھے جو ایک دوسرے کو ڈراتے سنبل کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان دونوں کی باتوں سے صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ حویلی مجرموں کا ڈیرہ ہے۔ وہ دونوں نوجوان ان کے سامنے سے گزر چکے تو درخت کے پیچھے چھپے ان تینوں نے سکون کا سانس لیا۔

”کہیں میرے بھاگنے کے بعد وہ لوگ بیا اور سارا کے ساتھ برا سلوک نہ کر رہے ہوں۔“ سنبل کو نئی فکر ستانے لگی۔

”میں ارقم سے رابطہ کرتا ہوں۔ معلوم کرتا ہوں کب تک پہنچ رہے ہیں وہ لوگ۔“ ارقم کو موبائل پر کال ملانے لگا۔

”اب یہ ارقم کون ہے۔“ سنبل نے حیرانی سے باری باری ان دونوں کے چہرے کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

نور محمد اسے ارقم کے حوالے سے تفصیل بتانے لگا۔ ارقم کی ٹیم کچھ ہی دیر میں اس حویلی تک پہنچنے والی تھی۔ کچھ لمحے مزید سر کے تو وہ دونوں بٹے کئے نوجوان نامراد سے ایک دوسرے کو الزام دیتے واپس لوٹ رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد نور محمد پھر سے تالاب کی جانب پانی لینے کی غرض سے نکل کھڑا ہوا۔

”میں نے تمہاری بانسری کی آواز سنی تھی۔“

منہل نے جھکتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ شہید سردی کے باعث اس نے شاور کی جیکٹ پہن رکھی تھی اور اب ہولے ہولے اس کے کناروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”کہیں میری بانسری کی آواز سن کر تو حویلی سے نہیں بھاگی تھیں تم۔“ وہ اسے دلچسپی سے دیکھتا استفسار کر رہا تھا۔ وہ دونوں درختوں سے پشت لگائے ایک دوسرے کے آگے سامنے بیٹھے تھے۔

”تمہاری بانسری نے ہی مجھے اتنی ہمت دی تھی کہ میں ظاہر خان پر حملہ کر کے بھاگی تھی۔“ وہ سر جھکائے اعتراف کر رہی تھی۔

”اچھا ایسا کیوں.....؟“ وہ پر اشتیاق سا پوچھ بیٹھا۔

سیا منا تب ہی ہوا تھا۔ مگر ایک ملاقات پہلے بھی ہو چکی تھی ہماری، جس سے صرف یہی آشنا ہوں اور تم بیکسر انجان ہو۔“ وہ اس کے تجسس کو ہوا دے کر اسے دلچسپ لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔

میں پریاں شہزادوں کا کرتی ہوں گی۔“ وہ پھر سے اس بل میں جا کھویا۔

لوگوں کی بھی آنکھیں پر نہ تھیں، ان معصوم بچوں میں سے اکثر ہوش و خرد سے بے گانہ اور ذہنی طور پر بے حال میں تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو تشدد سے نڈھال تھے۔ ارم نے ان سب بچوں کو اسپتال داخل کروا دیا تھا ان کے مکمل چیک اپ کے بعد ہی انہیں وارنٹین کے سپرد کرنے کا مرحلہ طے پاتا۔

رہی دونوں طرف؟

”شادی شادی پر تو فاتحہ بڑھ کر آیا ہوں یہاں میرے یار.....!“ ارم استہزائیہ ہنستے ہوئے بولا۔

شاور بری طرح چوک گیا۔

”شہ شہ بول..... کیا الم غم منہ سے نکال رہا ہے لگے۔“

”الم غم تو تمہاری بھابی کے دماغ میں جا گھسا ہے۔ جو اُسے غیرے کی باتوں میں آکر میرے کردار پر انگلی اٹھا رہی ہے۔“

”ارم منہ بھلا کر کھلی غیرے انداز میں کہہ رہا تھا۔“

”کردار پر انگلی..... پورا قصہ سنا میرے بھائی کیوں سر اوپر پیٹ میں درد کروا رہا ہے۔“

”یار کمرے..... یہ جوڑکیاں ہوتی ہیں ناں۔ بڑی ہی الگ قسم کی مخلوق ہوتی ہیں ان کے پیچھے کی جو مشینری اور پیچ پرے ہوتے ہیں ناں وہ بھی عام انسانوں سے مختلف طور پر کام کرتے ہیں۔ مجال ہے کہ سیدھی بات انہیں سیدھے طریقے سے سمجھ آجائے۔ ارسے جوان کے ساتھ ٹھس ہوتا ہے وہ بے وفا لگتا ہے اور جو بچ متوں میں ان کا استعمال کرتا ہے وہ ہی انہیں اپنا لگتا ہے۔“ ارم کے اندر اتنے دنوں کا جمع ہوا غبار بالآخر آتش فشاں کی صورت شاور کے سامنے پھوٹ ہی پڑا۔

”اچھا چل چھڑ۔ خندا پانی پی اور اب بتا کیا ہوا ہے؟“ شاور نے خندا اٹھار پانی جگ سے نکال کر ارم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ارم اسے سارا قصہ سنانے لگا۔

”میں بھی تمہاری بھابھی کا دماغ درست کر کے آیا ہوں۔ ایسا فیصلہ کیا ہے کہ ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ عقل کے ناخن واپس بڑھ جائیں گے اور ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“ وہ سب کارستانی سنانے کے بعد اپنے کارنامے کی بابت گردن اکڑا کر کارجماد کر چچا کرنے لگا۔

”میرے رہے بیانات..... مکمل کوائف کے

ساتھ۔“ ارم کا اسٹنٹ اس کی میز پر فائل رکھ کر چلا گیا۔ ارم ان فائلز کی جانب متوجہ ہو کر ایک کے بعد ایک بیان پڑھنے لگا۔ اگلا بیان فمائل کا تھا۔ مگر کوائف پڑھتے ہی ارم کے دماغ میں زوردار گھٹکیاں بجاتا شروع ہو گئیں۔

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے تمہاری محبت کی عمر انتہائی مختصر ہونے والی ہے۔“ ارم نے کاغذات کے پلندوں سے نگاہیں اٹھا کر فائل پر نظر پڑا۔

سے شاور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوتا ہے۔ ہوتا ہے..... جب اپنی محبت کی دنیا لٹی ہے تو دوسروں کی رومانوی دنیا اجاڑنے کا مین چاہتا ہے۔ ہمت کر، حسد نہ کر میرے دوست۔“

شاور نے ارم کی بات کو ہوا میں اڑایا اور اس سے چھیر خالی شروع کر دی۔

”فلاسفرمیاں! جس وجہ کی بدولت بے گانے معاملے میں عبداللہ دیوانہ کی عملی تعمیر بنے پھر رہے ہوں۔“

میری کسی بستی زندگی میں، میری خوشیوں میں گرہن لگانے کی وجہ بھی وہی ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا کر کہہ رہا تھا۔

”کیا مطلب یار..... میں سمجھا نہیں۔ ایک تیری یہ عادت بڑی خراب ہے گھما پھرا کر بات کرنے کی یقیناً بھابھی بھی تیری اسی عادت سے بے زار رہی ہوں کی تب ہی جھگڑتی ہوں گی۔“ ارم ابھی بھی اپنی لہجہ میں مٹھ رہا تھا۔

”تم ایک کام کرو شان..... کوہ سار پر چڑھ کر اپنی بنی بجاتے رہو۔“ ارم نے تپ کر کہا۔

”دیکھو یہ اب تم میری تو بھین کر رہے ہو ارم! میری بنی کے بارے میں پچھ نہ کہنا۔“ شاور جذبات کی ندی میں غوطہ لگائے غصے سے کہنے لگا۔ مگر ارم نے بات کو نظر انداز کر کے اسٹنٹ کو مکمل کوائف جینے کی تاکید کر ڈالی۔ فون رکھ کر شاور کی جانب متوجہ ہوا۔

”اب پتا چلے گا تجھے شان میاں۔ جب رومانوی دنیا اجڑتی ہے تو کیسا لگتا ہے۔“ وہ منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دھمکا رہا تھا۔ قبل اس کے شاور

کچھ کہتا سنبھل کرے میں داخل ہوئی۔ ایک پھر کہتا ہوا جملہ اس کے لبوں پر ہی دم توڑ گیا اور اس کی جگہ مسکراہٹ سانس لیتے لگی۔ سنبھل نے ایک نظر ان دونوں کے چہرے پر ڈالی اور سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تو آپ کے والد کا نام اشتیاق عالم ہے۔“ ارم نے پر عرب انداز میں پوچھا۔

”جی!“ سنبھل نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اور والد کا نام حبیب بیگم.....“ ارم نے اس کا پیڑہہ خوردہ کیے ہوئے اگلا سوال پوچھا۔

”میری گریہ کے معلوم آپ کو، میں نے ان کا نام تو یہاں درج نہیں کیا۔“ سنبھل حیران ہوئی۔

”یہ آپ کا مکمل ایڈریس ہے.....“ وہ اس کی فکر کو نظر انداز کرتا سنبھل کا مکمل پتا دہراتے سوال کو حل کر رہا تھا۔

”جی جی جی..... مگر آپ نے بتایا نہیں آپ میری والدہ کا نام کیسے جانتے ہیں۔“ سنبھل ہنوز حیران تھی۔

”جی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو ہمیں آنی ڈی والے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کی والدہ کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ.....“ وہ دل جلا دینے والی بات کہنے لگی۔

”سنبھل کے تن بدن میں ایک لگ گئی۔ جبکہ شاور نے بھی کن انکلیوں سے ارم کو گھورا مگر وہ بے نیاز بنا رہا۔

”کیس طرح کی باتیں آپ کر رہے ہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں پچھتا میرے والدین کے حوالے سے بدتمیز رویہ اپنانے کا۔“ سنبھل نے سخت لہجے میں ارم کو تنبیہ کی۔

”معاذرت چاہتا ہوں مگر آپ کے والدین کو بھی کوئی حق نہیں پچھتا میری بستی حقیقت دنیا پر باد کرنے کا۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں غرایا تھا۔ سنبھل کے ساتھ ساتھ شاور بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

”اچھا ٹھیک ہے کرتا ہوں سیدھی سیدھی بات۔“ محترمہ سنبھل! آپ جہاں رہتی ہیں اس کے دو گھر چھوڑ کر میرا گھر ہے۔ کچھ دن قبل میری شادی کی تاریخ پکی ہونے جا رہی تھی، اس دن آپ کے والد اور والدہ صاحبہ چند خطوط کا پلندہ اٹھائے ہمارے گھر حاضر ہوئے اور میری اور آپ کے عشق و معاشقے کے خوب قصے سنانے لگے۔ ان کے پاس ثبوت تھا کہ وہ خطوط میرے یعنی ارم کے نام سے لکھے گئے تھے اور آپ کی والدہ صاحبہ تو یہ تک کہہ گئیں کہ جب سے میری شادی کی خبر آپ نے سنی ہے۔ آپ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ آپ کے گھر والوں کی بے وقت انٹری اور ان شرانگیز خطوط کی بنا پر میرے گھر میں ایک طوفان رہا ہے اور میری منگیتر مجھ سے بے انتہا متفر ہو چکی ہے۔ لہذا میرے مہربانی آپ ان خطوط کے راز سے پردہ اٹھائی ڈالیں آج۔“ ارم نے مختصر ساری روداد سنانے کے بعد نہایت عاجزی سے عاجزانہ انداز میں درخواست کی۔

شاور ساری رام کھٹا سن کر ہکا بکا سانس لے کر جان ب دیکھ رہا تھا اور سنبھل کا حال کچھ یوں تھا کہ کانٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ شرمندگی سے اس کا سر جھک چکا تھا۔ اس کے تو وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی لکھی گئی ایک مختصر کہانی اتنا بڑا فساد کھڑا کر دے گی حیرت تو اسے اماں ابا پر بھی ہو رہی تھی جنہوں نے اسے بتاتے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔

”خدارا! اب پتا بھی دیں کہ ان خطوط کیا معاملہ ہے۔“ سنبھل کو سر تھا بے بیٹھا دیکھ کر ارم نے بے تابانی سے کہا۔ وہ کب سے منتظر تھا اس لڑکی کا جس کے خطوط نے اسے بدنام کر ڈالا تھا۔ اب وہ سامنے موجود بھی تو اس کی خاموشی اسے بری طرح کھٹک رہی تھی۔

”دراصل وہ خطوط نہیں، میری لکھی گئی کہانی کے کاغذات تھے۔“ سنبھل نے شرمندہ شرمندہ لہجے میں جواب دیا اور حلق میں اگلی شاور کی سانس جھٹ سے بجالا ہوئی۔ وہ بھی اس قصے کا ڈراپ سین سننے کو بے

”در اصل حال ہی مجھے لکھنے کا شوق چڑھا تھا اور میں نے ایسے ہی چند خطوط پر مبنی کہانی لکھ ڈالی یہاں آنے سے قبل میں وہ صفحات اپنی رائٹنگ میبل کی دراز میں رکھ آئی تھی۔ میں نے اپنے نئے مشغلے سے اپنے والدین کو انجان رکھا تھا کیونکہ میں انہیں کہانی چھپنے کے بعد سر پرانز دینا چاہتی تھی۔ میرے خیال سے ان کے ہاتھ وہی کاغذات لگے ہوں گے اور کہانی کا اہم کردار آپ کے ہم نام ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اس شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں گے۔“ سنبلی کی بتائی گئی تفصیل سن کے ادم سر تھا م کر بیٹھ گیا۔

”آئی ایم سوری! میں بے حد شرمندہ ہوں۔ مگر یقین کریں مجھے میرے گھر والوں نے اس تمام ہنگامے سے لاعلم رکھا تھا۔ پوچھنا تو درکنار مجھے بتایا بھی نہیں گیا ورنہ میں یہ غلط فہمی اس وقت دور کر دیتی۔“

”تم نہیں جانتیں سنبل! اس غلط فہمی نے میرے دوست اور اس کی محبوبہ سنگیت کے درمیان خوب جھگڑے کروائے ہیں۔“ شنادر اسے ہتھ پتھ ساری تفصیل بتا رہا تھا۔

”میں نے حدِ شرمندہ ہوں ارقم بھائی۔ مگر آپ بے فکر رہیں۔ گھر پہنچتے ہی میں سب کی غلط فہمی دور کر دوں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے ارقم سے وعدہ کر رہی تھی۔ ارقم نے فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”یہ محترمہ کے والدین بھی ناں۔ اولاد سے پوچھنا گوارا نہیں کیا اور بس بالا ہی بالا فیصلہ کر کے اتنا بڑا فساد کھڑا کر دیا۔ پھر بھلے کسی کی زندگی برباد ہو۔ ان کا حال تو سانوں کی والا ہوتا ہے۔“ ارم سوچے بنا نہ رہ سکا۔

☆☆☆

”یہ مختصر سے دن میری زندگی کے سب سے یادگار دن ہوں گے۔ یہ دن دو انجان لوگوں نے ہم سفر بن کر گزارے..... یہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔“ وہ دونوں کشمیر پوائنٹ کی بل کھاتی سڑک پر ایک ساتھ

”ان چند دنوں میں میں نے زندگی کا ہر ایک رنگ دیکھ لیا۔ سڑکیں بھی دیکھ لیں اور پریشانی سے بھرپور دن بھی دیکھ لیے۔ ان تمام وقتوں میں تمہارا ساتھ ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔“ سنبل اسے ممنون نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتی تھی۔

”اور اب یہ سفر کو ختم ہوا جاتا ہے۔“ مری میری زندگی کا سفر اب اپنے ہمراہی کا منتظر ہے۔“ شاید اسے جواب طلب نگاہوں سے تکی رہا تھا۔ وہ ایک خوب صورت وعدہ کا خواہاں تھا۔

”مجھے ہمراہی بنانے کے لیے تمہیں میرے گھر تو آنا ہوگا شان۔“ اسے آج ہی بتا چلا تھا کہ اس کے اپنے اسے شان کہتے ہیں اور وہ لکھنؤ کے میدان میں بھی اسی نام سے اترتا تھا..... اور جب وہ اس کے اپنوں میں شامل ہو چکی تھی تو استحقاق والے انداز میں اس نے اسے شان کہہ کر رکھا تھا۔

”میں جلد آؤں گا تمہیں لینے..... یہ تمہارے
شان کا تم سے وعدہ ہے۔“ اس نے بخت یحییٰ
نکاحوں سے اس کے رخسار کو چھڑتے ہوئے کہا۔
عہد و پیمان جو نکاح توہ شاہور کے ہمراہ کچھ فاصلے پر

کھڑی کوشر کی جانب بڑھنے لگی۔ جہاں دادو بھائی اور مسز صدیقی، ارم اور نور محمد کا خاص طور پر شکریہ ادا کر رہے تھے۔ دادو بھائی نے ارم سے درخواست کی تھی کہ میڈیا پر خبریں چلیں تو اس میں ان کے اسکول کا نام نہ آئے۔ ارم نے بے فکر رہنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ سنبھل نے نور محمد کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور وہ لوگ کوشر پر سوار ہو گئے۔ کوشر اپنی منزل پر روانہ ہو گئی۔

”میرے دوست! میرا قصہ تو حل ہوا اب تم اپنی داستانِ محبت کی جلد ابتدا کر ڈالو۔ ورنہ آپ کی محبت کے جو نگراں ہیں وہ بڑے ہی جلد باز ہیں۔“ اُرم اسے گلے لگا کر نصیحت کرتا اپنی راہ کو ہولیا۔

دھنک رنگوں کی صورت
کن من پھوار کی صورت
الہیلیٰ کرنوں کے سنگ
کوہسار پر اتری محبت

<https://www.urdubooks.org/>

کہاں تھا ناں دوست! تمہارے اندر مجھے
تو لکھا ہے، "تو مجھ نے اس کی پشت پر چھلک
بیٹے ہوئے شوخ لہجے میں کہا وہ ہنستا چلا گیا۔

میرے دوست اس اور میں پھسائے ہیں
 اور مجھ کو قہقہہ بھی شاور کی ہنسی میں شامل
 کیا ہے۔

☆☆☆☆

تو کہہ کر نکل گیا

جب افراتفری کا عالم تھا۔ ارم کی ایک یون کال کرنے لگا۔ ان سب کے گھروں میں ہل چل مچا دی تھی۔

ہماری بڑی دلچسپی ہے کہ اس وقت بھی آج شام کھیر پر
 لکھنے کا حکم جاری کر ڈالا ہے۔ ”مرمن احمد بھنائے
 نے انرا آڑ میں بڑبڑا رہے ہیں۔ انیس بار بار بازار
 کا کھانا پھر ہاتھار۔

میں نے کہا ہے۔ مجھے لگتا ہے ارم کوئی اہم فیصلہ کرنے والا ہے۔ دادی اماں نے جھٹ پوتے کی حاکمیت کی۔ حسن احمد سر جھٹک کر باہر سامان لینے چلے گئے۔ کچھ اسی طرح کے محضے میں شاملہ بھی پڑی ہوئی تھی۔

”اُردم نے کہا تھا کہ اس لڑکی کے آنے پر فیصلہ ہوگا۔ وہ تو ابھی آئی نہیں پھر اُردم نے سب کو ایک جگہ بلا کر اُردم نے اُردم کو کہا کہ مجھے بہت تنہائی ہے۔“

اسی۔۔۔ جب سے اس نے ارثم کی فون کال کی

”اوہو..... میمونہ چلی گئی مگر ہر طرح کے شکوک پالنے کا شوق تمہارے اندر چھوڑ گئی۔ ارے بیٹا کبھی مثبت بھی سوچ لیا کرو۔ حکومت نے اب تک اچھا سوچنے پر ٹیکس نہیں لگایا ہے۔ کیا بتاؤ رقم کوئی اچھا فیصلہ کرے آج۔“ راحت آرانے یہی کوڈ پٹنے کے ساتھ ساتھ سمجھا۔

اور یہی کچھ کیفیت اشتیاق عالم کے گھر میں بھی تھی۔ سنبل کے آنے میں تو ابھی بھی دودن باقی ہیں۔ ہمارے آج ہمس گھر، مالدار، اکاؤنٹنٹ، سہارا،

”اری نیک بخت —! کچھ باتوں کو وقت پر

ی پتھر دیا کرو۔ مہارانی اپنی جلد بازیوں کی بدولت
و اتنا بڑا کھڑاگ پیدا ہوا ہے۔ شام ہوگی تو
یکھا جائے گا۔ ارقم نے کیوں بلایا ہے آج ہمیں اب
راخو بھی ہولنا بند کرو اور مجھے بھی مشعل ہولانے کا

مسلک سے صریح کرو۔ "استیقا" عالم بری طرح چوانا پا
 وتے ہوئے بلوے تو حبیبہ بیگم منہ بسور کر رہ گئیں۔
 اور پھر شام کے سرخی پر پھیلاتے ہی رحمن احمد
 کے گھر سب جمع ہو بیٹھے۔ بڑے سے لڑکوں کی

میں نے پر بیٹھے تھے۔ خیر و خیریت کے علاوہ فی الوقت
ان سب کے پاس مزید بات کرنے کو کچھ نہ تھا۔
یہاں خواتین کے چہرے پر بارہن نکارے تھے۔ وہیں
مرد حضرات بھی شدید رچنے کا شکار نظر آئے۔

رف دادی اماں تھیں جو پاندان میں سے پان
کا لے چونا کھا لگانے میں مصروف تھیں۔ البتہ اس
وران ایک طائر نہ گاہ سامنے بیٹھے، منہ لبورے مجمع

”اوہو۔ نہ جانے کب آئے گا ارقم۔“ تیمور حسن ہلہولہ دیتے ہوئے بے چینی سے بولے اور اسی بل گھر کی کھٹی بجی۔

1 فروردی 1399

”لو آگیا ارم.....!“ عفت آرا بے قرار سی دروازہ کھولنے کو اٹھیں۔ شائلہ کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔

نہ جانے ارم آج کیا فیصلہ کرے گا۔ اسے یہی ایک فکر کھائے چلی جا رہی تھی اور پھر لاؤنج میں پہلے حیران پریشان سی عفت آرا کی اسٹری ہوئی اور ان کے پیچھے تازہ دم، خوش باتوں میں مکن سنبھل اور ارم اندر داخل ہوئے۔

”السلام علیکم.....!“ ان دونوں نے مسکرا کر سلام چھاڑا۔ مگر حاضرین و ناظرین کو ساپ سونگہ گیا۔ وہ لوگ ہکا بکا سے نکل گئے۔

”سنبھل تم؟“ حبیبہ کی قوت گویائی سب سے پہلے بحال ہوئی۔

”کیا..... یہ سنبھل ہے؟“ شائلہ کو شدید ذہنی دھچکا لگا۔ اس کا پریشان حال ذہن تیزی سے نئی کہانی بننے لگا۔

”خارازم یہ کسی بے ٹکی تصوراتی دنیا میں پہنچنے سے قبل چند لمحے مکمل سنجیدگی سے حقیقت میں جی لیں اور ہم دونوں کی بات بھی بغور سن لیں۔“ ان سب کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کر ارم نے انتہا کرنا ضروری سمجھا۔ وہ سب منہ کے زاویے بگاڑے مجبوراً ہر تن گوش ہوئے۔

”یہ سنبھل ہیں، اشتیاق صاحب کی بیٹی اور ہماری پڑوس۔ ان ہی کے خطوط کی وجہ سے خاندان میں پھوٹ پڑی تھی اور آج سنبھل ان خطوط کی حقیقت آپ سب کو بتانا چاہتی ہیں۔ ذرا دل تمام کر سیتے گا۔“ آخری جملہ اس نے بطور خاص حبیبہ بیگم کی جانب دیکھتے ہوئے اچھا لگتا۔ وہ گڑ بڑا کر رہ گئیں۔ ”وہ خطوط نہ تھے۔ وہ جو آپ لوگ سمجھ بیٹھے تھے۔ دراصل وہ خطوط میری کہانی کا حصہ تھے۔“ سنبھل سر جھکائے ہوئے ان خطوط کے حوالے سے ساری تفصیل سناتے لگی۔

وہ سب شرمندہ، شرمندہ سے اپنی بظلوں میں جھانکنے لگے۔ ارم کی نگاہیں مسلسل شائلہ کے شرمندہ

شرمندہ وجود کا طواف کر رہی تھیں۔ شائلہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شرم سے پانی ہو کر کسی کونے میں جا چھے۔

سنبھل کی بات مکمل ہوئی تو ارم وادی کو ہمارے پیچھے والے واقعے اور سنبھل سے ہونے والی ملاقات کا احوال بتاتے لگا۔

ان سب کے دلوں سے شکوک کے بادل چھپ چکے تھے۔ دل بھرتے بھرتے۔ اشتیاق عالم اور حبیبہ کے پاس سے سخت شرمندہ تھے۔ البتہ وہ اس کے شکر گزار بے حد تھے۔ جسے وہ مسلسل بدنام کرتے رہے۔ وہی ان کی بیٹی کی حفاظت کرنے والا نکلا۔ وہ دونوں میاں بیوی ان سب سے معذرت کر کے سنبھل کو ہمراہ لیے گھر کو ہو لیے۔

”اب میرے خیال سے شادی کی تاریخ پر بھی بات ہو جانی چاہیے۔“ رحمن احمد نے گلا کھکارتے ہوئے سب کو متوجہ کیا۔

”آپ لوگ سب بھول رہے ہیں کہ میری اور شائلہ کے درمیان کچھ شرطیں طے پائی تھیں۔ وہ بھناتا ہوا بولا اور پیرچ کر کرے میں چلا گیا۔ شائلہ چپکوں پہلوں رونے کی تیاری کرنے لگی۔

”اف اللہ! اس لڑکی کو کوئی عقل سکھائے، یہ وقت رونے کا نہیں، جاؤ جا کر مناؤ ارم کو، معذرت کرو اپنے بڑے رویے کی۔“ عفت آرا نے سمجھا کر اسے ارم کے پیچھے بھیجا۔

شائلہ کمرے میں داخل ہوئی تو ارم آنکھوں پر بازو رکھے بستر پر دراز تھا۔

”اب ان شرطوں کا کیا معاملہ ہوگا؟“ وہ انگلیاں ترختے گوگو کی کیفیت میں پوچھ رہی تھی۔

”آج تمکا ہوا ہوں۔ شادی سے انکار کر دوں گا۔“ اس نے ذرا سا بازو ہٹا کر شائلہ کو دیکھا اور پھر بازو آنکھوں پر واپس رکھ کر شان بے نیازی سے جواب دیا۔

”دیکھو ارم! جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔ اب ان شرطوں کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔“ وہ ہمت کر کے مزید آگے بڑھی۔ مگر ارم سنی ان سنی کر گیا۔

”دیکھو، میں مانتی ہوں میری غلطی ہے تو معاف کر دو ناں۔ ہو جاتی ہے غلطیاں بشرے، مجھ سے بھی ہو گئی۔“

اس کی بے نیازی پر مزید جذباتی ہو کر وہ بستر کے کنارے لیٹ گئی۔ ارم نے آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر پھر سے منگیتر صاحبہ کی لوکیشن کا جائزہ لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ کینہ تو زنگا ہوں سے پوچھ رہی شائلہ کو گھور رہا تھا۔

”محبت تو تم مجھ سے ہی کرتے ہو اور میں بھی۔“ دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے پھر اتنا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت۔“ اس کے اٹھ بیٹھنے پر شائلہ مزید ہمت کر کے گویا ہوئی۔

”اچھا! تو میں ڈراما کر رہا ہوں۔ اتنے دنوں سے میرے دامن پر پیچڑ اچھالنے والوں کو آج میرے پاس ہونے کا شوقیت ملے ہی محبت کم گشت رہے گی۔“ وہ شائلہ کی نگاہ رنگ بدلنے سے تو تم نے کرنا کبھی بات دے ڈالی۔“ اللہ اللہ کر کے چپ کا لڑکھو نا ارم کی زخمی شری طرح گر جا۔

”دیکھو تم نے مجھے گرت کر کہہ لیا ناں، اب بس معاملہ رفع دفع کرو۔“ بھاڑ میں ڈالو شرطوں کو۔ ذرا مونداس وینا کے بارے میں جو ہم جلد ہی شادی کے بعد بسانے والے ہیں۔“ شائلہ پٹری سے اترتے زخمی شیر کو پھر سے پٹری پر واپس کھینچ لائی۔

”اور تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ نئی دنیا میں تم جیسی نادان اور عقل سے بیدل لڑکی کے ساتھ بساؤں گا۔“ وہ کمر پر دونوں ہاتھ جما کر لڑاکا عورتوں کی طرح منہ بگاڑ کر کہنے لگا۔

”اچھا تو پھر کس کے ساتھ بساؤ گے۔ ذرا صاف صاف بتانا مجھے۔“ اس بار وہ بھی آستین چڑھائی، میدان میں کودی۔

”جس کے ساتھ بھی گزراؤں زندگی، تمہیں اس

سے کیا؟“ وہ منہ پھیر کر بے مروتی سے بولا۔ ”سنو ارم رحمن! یہ جو تمہارے دل کے راستے ہیں ناں۔ وہ ہزار بھول بھلیاں گھوم کر بھی مجھ تک آتے ہیں۔ ان راستوں کا رخ موڑنا تمہارے بس میں نہیں۔ ایسا بھر پور قبضہ ہے تمہارا میرے دل پر۔“

وہ سیدھے ٹھوک کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ”ہونہہ! بڑی آئیں قبضہ مافیا کی جانشین۔ کوئی عام بندہ نہیں ہوں میں۔ ایسے چھوٹے موٹے قبضے تو میں چنگی بجاتے ہی صاف کر دوں۔“ وہ اس کی محبت میں ماری بڑھک کو آئینہ دکھا رہا تھا۔

”اچھا تو تم میرا قبضہ صاف کر دو گے۔ ہمت ہے تو کر کے دکھاؤ۔“ اس بار شائلہ نے بھی کھلا چیلنج دے ڈالا۔

”ویسے سچ کہوں..... اگر جس انداز میں ابھی تم میری محبت کی دعوے دار بنی میرے لیے مجھ سے ہی لڑ رہی ہونا، اگر یہ ساتھ تم اس وقت دیتیں جب میں مصیبت میں کھڑا تھا تمہیں اپنا سر کا تاج بنا کر رکھتا شادی کے بعد۔“ ارم نے پھر سے اس کی نادانیوں کا طعنہ دے مارا۔

”کوئی بات نہیں..... سر کا تاج نہ سہی۔ گلے کا ہار بنا کر رکھ لینا مجھے اپنی شادی کے بعد۔“ وہ بھی مکمل طور پر ڈھٹائی پر اتر آئی۔

”گلے کا ہار..... خوش فہمی ہے تمہاری..... گلے میں پڑا ڈھول لگنے لگی ہو تم مجھے جیسے اتارنے کے لیے میں بے حد بے چین ہوں۔“ ارم کی اکثر کم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ وہ اسے سناتا ہوا کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا شائلہ کے سر پر لگی ٹکوں پر بھی شدید غصے کے عالم میں وہ بڑبڑاتے ہوئے ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگی۔

”یہ لڑکا پیار سے سننے والا نہیں۔ اب زور زور بدستی تو کرنی ہی پڑے گی اس کے ساتھ۔“ بڑبڑاتے ہوئے اس کی نگاہ کارڈ سنبھل پر پڑے پھلوں کے ساتھ رکھے جا تو رجا پڑی۔ ایک شیطانی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آدھکتی۔ چاقو اٹھا کر وہ دبے پاؤں اس کے

پیچھے جا کھڑی ہوئی اور نوک گردن پر رکھتے ہوئے اسے دھمکاتے ہوئے بولی۔

”کہوں مجھ سے شادی منظور ہے۔ بولو جلدی..... ورنہ یہ چاقو..... اس چاقو سے میں تمہارے سارے بال اڑا دوں گی۔“

”واہ واہ واہ..... نشانہ کر..... جھکی میرے زلفوں کی..... جاؤ جاؤ، میں نہیں ڈرتا تم سے۔“ وہ اس کی دھمکی کو بے پرکی جان کر ہوا میں اڑاتے کہنے لگا۔

”ایسے نہیں مانو گے تم۔ ڈیو تو دکھانا پڑے گا۔“ یہ کہتے ہوئے نشانہ نے اس کے سیاہ گتے بالوں کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ ارم ارادوں کو بھانپتا تو راول اٹھا۔

”اچھا..... اچھا رکھو..... مجھے منظور ہے۔ تم جیسی چیز کے ساتھ زندگی گزارنا مجھے منظور ہے۔“ وہ بادل نا خواستہ اقرار کر رہی بیٹھا۔

”ہائے اللہ.....!“ نشانہ کے ہاتھوں سے مارے شرم کے چاقو زمین پر جا گرے۔ ”میں ابھی سب کو بتا کر آئی ہوں۔ وہ کیسی ہیروئن کی طرح مل کھا کر پلی ٹی کی کہ ایک جھکے سے واپس آ کر ارم کے چوڑے سینے سے جا لگی۔ اس کی حیران سی نگاہ بے ساختہ اپنے بازو پر جا پڑی جو ارم کی مضبوط گرفت میں گرفتار تھا۔ اور اس کی سیاہ مخموری آنکھیں اس کے چہرے پر جھکی ہوئی تھیں۔

”چاقو کے زور پر مجھ سے اقرار تو کروالیا ہے مگر اب خود بھی اقرار کرو کہ آئندہ میری محبت پر شک نہیں کرو گی۔“ ارم اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”نہیں کروں گی.....“ نشانہ نے جھکی جھکی نگاہوں سے اقرار کیا۔

”ٹھیک ہے پھر مابودت جا کر سب کے سامنے شادی کے لیے ہائی بھرتے ہیں۔“ اس کی ناک کو پیار سے چھینٹتے ہوئے دروازہ کھولنے لگا۔ نشانہ محبوب سی اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک وہ پلٹا اور اس کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ نشانہ اس انداز پر گھبراتے ہوئے کھڑکی سے جا لگی۔

”وہیے ہونے والی بیگم صاحبہ مستقبل میں اپنی بات منوائی ہو تو محبت کا استعمال زیادہ کیجیے گا بجائے ان چھری چاقو کے.....“ وہ شرارت سے اسے باور کراتا دروازے کی طرف پلٹ گیا۔

”بدتمیز، باطل، دیوانہ.....“ وہ زربل بڑبڑاتی رہ گئی۔ ایک شرخی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر چلی تھی۔ ارم نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ عفت آرا اور راحت آرا دروازے کے کھلتے ہی وہ دونوں لڑکھڑکھ کر رہ گئیں۔

”وہ ہم باتیں تو نہیں سن رہے تھے تم لوگوں کی؟“ راحت آرا نے گڑبڑا کر کہا۔ عفت آرا نے جلدی سے بہن کو ٹھوکا مارا.....

”وہ بیٹا..... ہم تو بس پوچھنے آئے تھے کہ کیا ہوا۔ کوئی بات بنی۔“ راحت آرا نے بات سنہلاتے ہوئے کہا اور ٹوہ لینے کو اندر جھانکنے لگیں۔

”جی بن گئی بات۔“ جانیے مٹھائیاں بانٹتے۔ مابودت شادی کے لیے تیار ہیں۔“ ارم خوشی سے اعلان کرتا نیچے جا پہنچا اس کے منظر سے بڑھتی ہی نشانہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

”ہائے خالہ بڑی مشکل سے چھری چاقو دکھایا تو مانا ہے۔“ وہ مظلومیت اور مصیبت دونوں چہرے پر سجائے بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں بیٹا۔ غم نہ کر، ٹھیک ہو جائے گا شادی کے بعد۔“ عفت آرا اپنی بہو رانی کو سینے سے لگائے کہہ رہی تھیں۔ بہو رانی کی نگاہ ٹھیک اس بل چلی منزل پر تیمور حسن سے لگے ملتے ارم پر جا پڑی تھی..... وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نشانہ نے ٹوہ لینے پر اس نے شرارتا دامن آٹھ دبا دی۔ نشانہ نے شرم مار کر منہ پھیر لیا۔ سب کچھ خوابوں جیسا حسین تھا۔ ارم کا ساتھ اس کی محبت، بس اک ذرا سی دھند چھٹ جانے سے اس کی دنیا کتنی حسین ہو گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

عشق لفظوں کی صورت ہو یا جذلوں کی صورت،

تاریخ ضرور رقم کرتا ہے۔ وہ لفظوں کی شہزادی تھی۔ اس کے الفاظ میں اتنی تاثیر تھی کہ وہ عشق لکھے اور پڑھنے والے کو عشق ہو جائے۔ جن کی ذات خود عشق میں ڈوب چکی ہو..... عشق ان کا وجود بن جاتا ہے۔ لکھتے لکھتے اس نے ایک گہری نگاہ شے کے اس پار سے نظر آتے منظر کے اندر کی جھیلی جھیلی سی وادی کو ہمار کی دوشیزہ کی صورت نکھڑا رکھی تھی۔ اور اس کی آنکھ میں برف کی بارش کی طرح چاندنی کی صورت چھیلی تھی۔ ملکہ کو ہمار کی بانہوں میں جھٹی جولائیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اس نے دھیرے سے پٹ کھولا۔ ہواؤں کا میچلا سا جھونکا اٹھلا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور بستر پر نیم دراز شاہو کے بالوں کو شرارت سے سہلا گیا۔ اس کی آنکھیں دھیرے سے وا ہوئیں تو کھڑکی کے پٹ سے جھانکی شر پر کھنوں نے مسکرا کر صبح کا سلام بھیجا۔ وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر کھنوں کی پشت پر آ کھڑا ہوا۔ وہ اس کی قربت سے بے خبر وادی کی دلکشی میں کھوئی ہوئی تھی۔

”ان نظاروں سے زیادہ حسین نظارہ اس وقت میری نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے۔“ اس کی دراز زلفوں کو نرمی سے ایک طرف کر کے اسے اپنی بانہوں کے

سنبھل کر لایا کہہ رہا تھا۔

”سنبھل کر لایا کہہ رہا تھا۔“ اس کی مسکراہٹ میں احساس طمانیت کا رنگ گھلا ہوا تھا۔ ”بھئی بھئی میں سوچتی ہوں۔ اس وادی نے مجھے دنیا کی دفتر ہی سے بھی ملوایا اور دنیا کے فریب سے بھی۔“ سنبھل نے گہرے احساس تلے کو ہمار کے سینے پر مل کھاتے راستوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”فریب وقتی تھا۔ ان گھوٹوں سے تم آزاد ہو چکی ہو اور جو فریب تھا وہ اب بھی تمہارے ساتھ، ہمیں اپنی بانہوں کے حصار میں لیے کھڑا ہے۔“ شاہو اس کی بات کی گہرائی میں جا پہنچا تھا۔

”میں اس قید سے جسمانی طور پر تو آزاد ہوں مگر وقتی طور پر اب بھی مقید ہوں۔ وہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ با آسانی بھلا دیا جائے۔“ سنبھل نے شاہو کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

”جانتا ہوں، فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں تم معاشرے کے ان سیاہ بھیڑیوں کے حوالے سے کہانی بھی لکھ رہی ہو۔ جس میں تم والدین کو ان کالے دھندوں کے خوفناک پہلو کے حوالے سے آگاہ کرنا چاہتی ہو۔ تم لوگوں کو اس شیطانی آسیب سے بچاؤ کے لیے اپنا حصہ ڈال رہی ہو سنبھل پھر کیوں پریشان ہوئی ہو۔“ شاہو نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اس کا سر اپنے شانوں پر ٹکائے ہوئے پیار سے سنبھایا۔

”کیا لوگ میری اس تحریر سے سمجھ پائیں گے۔ کیا وہ جان پائیں گے کہ ان کے خاندان کے لیے کتنا اہم ہے۔ اس افراتفری سے بھرپور زندگی میں ایک ہی گھر کے فرد ایک دوسرے سے اس قدر دور ہوتے جا رہے ہیں جیسے کہ اجنبی ایک دوسرے کے جذبات احساسات، پریشانیوں، دکھوں سے بے خبر، والدین اپنے بچوں کو استاد مولوی کے سپرد کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک مرغی بھی اپنے چوزوں کو پروں میں سمیٹ کر رکھتی ہے۔ پھر ماں باپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان سے بڑھ کر ان کی اولاد کو کوئی خیر خواہ نہیں۔“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔ شاہو نے اپنی جان حیات کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اتنی حساس دل کی مالک تھی یہ تو اسے شادی کے بعد معلوم ہوا تھا۔

”پتا ہے شان ان اسمگلرز کا سب سے آسان ٹارگٹ ہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو زندگی سے، اپنوں سے، مایوس ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہم اپنوں کو خود سے کیوں مایوس ہونے دیتے ہیں۔ کیا ہم انسان اتنے کمزور ہیں بے بس ہیں کہ کسی کی اندھیری زندگی میں امید کی کرن نہیں جگا سکتے۔ ایسا نہیں ہے اللہ نے ہم انسانوں کو بے حد مضبوط ڈور سے باندھ رکھا ہے۔ ہم سب کو ایک دوسرے کا سہارا بنایا ہے۔ اور ہم اگر اس حقیقت سے منکر ہوئے تو دنیا میں تمہارے جائیں گے۔“ سنبھل! دنیا میں کئی عظیم فلاح گزرے ہیں۔ جنہوں نے بھی سلطنتوں کو فتح کیا تو کبھی قوموں کو..... مگر بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو دلوں کو شیر کر لینا

<https://www.urdu-tube.com/>



☆☆

شناور کی تباہ بستی کے اس مقام پر جا اُھی جہاں وہ

”ٹومیہ..... ٹومی..... پلیر میری بات تو سنو۔“ نگار گھر بھر میں اس کے آگے پیچھے پھرتی ہار گئیں تو تھک کر کوچ پر جا بیٹھیں۔

”اوہو! میں نے کہہ دیا تھا کہ نہیں..... تو بس نہیں۔“ جو اب ٹومیہ کا وہی اک انکار۔
”مگر کوئی وجہ بھی تو ہو۔“ وہ ہفتہ بھر سے اس کا گھیراؤ کیے تھیں۔ ان کی کولیگ، آسیہ درانی کا اکلوتا بیٹا شارق..... اور یہ رشتہ اتنا پر فیکٹ تھا کہ دل کی طور انکار پر آمادہ نہ تھا۔

”بتایا تو ہے مجھے ماسٹرز کرتا ہے..... اور بس!“ اس کا لہجہ قطعی تھا۔
نگار آخر کار ہار گئیں تو سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ یہ ماسٹرز کا کیز اس کے دماغ میں اسلام آباد سے لوٹ کر ہی کھلایا تھا..... ورنہ اس سے پہلے تو ایسے کوئی۔ ارے سامنے نہ آئے تھے۔ وہ بی اے کے بعد سے ہی اس کے بیاہ کے لیے کوشاں تھیں۔

نگار بیٹھ کر اس گھڑی کو، کویتیں جب ان کی بھولی بری مند صولت کو جانے کیسے ان کی یاد آستانی..... صولت کا اکلوتا بیٹا معیز، بہن کی شادی کا دعوت نامہ لایا تو ساتھ نگار کے لیے ریڑن کٹ بھی تھا۔ نگار کی لچکر شب، گھر بھر کی ذمہ داری کا بار اور پھر جڑوں کی تکلیف کو اسلام آباد کی کھلی آب و ہوا کہاں راس آئی..... سب سے بڑھ کر صولت سے ان کی ان بن رہی تھی۔

”جی تو یہ تھا کہ اس بھولے بھٹکے بلاوے پر بلیک کہہ اٹھنے کو ان کا دل ہی نہ آمادہ تھا..... انہوں نے بیوگی کی کڑی دھوپ سہتے یہ اولاد پروان چڑھائی تھی..... جب کون تھا جو اس کڑی مسافت میں ان کا ساتھ دیتا۔ سارے نام نہاد رشتے غفلت کی نیند پڑے سوتے رہے۔ اب جب وقت سکھ کی چھاؤں میں سستانے کا تھا تو یہ بھولا ہوا رشتہ جاگ پڑا تھا۔ اب ان سے کون پوچھتا؟ کہ اپنے مقدر کے آزار، دوسرے کہاں سمیٹتے ہیں..... اپنا دکھ تو بس اپنا ہی دکھ ہوتا ہے۔ خود انہوں نے بھی تو ہر رابطہ، واسطہ اپنی خود

داری کے نام پر ختم کیے رکھا اور ان سب کے لیے گھمنڈی کھلائیں۔
تب ہی انہوں نے معیز کے ہمراہ ٹومیہ کو بھیج دیا تھا۔ جوان دونوں بی اے کے سپر زڈے کر تقریباً فارغ ہی تھی اور شاید یہیں آ کر وہ مات کھا گئیں..... ٹومیہ نے وہاں سے لوٹ کر جو ماسٹرز کی ضد پکڑی تھی تو اس سے ایک انچ ہٹنے کو آمادہ نہ تھی۔
اور یہ تو..... ٹومیہ کے بعد اس کی عزیز از جان سہیلی..... تابندہ میں جا بیٹھی تھی، جس کی ہار گئی تھی۔
وجہ کیا ہے؟

”نگار جب ہار جاتیں تو تابندہ کا گھیراؤ کرتیں۔“
یا تو اسے آمادہ کرو..... یا انکار کی وجہ معلوم کرو۔“ اور تابندہ یہ جانتی تھی کہ اس کے انکار کی وجہ ہے معیز اور صرف معیز.....! جس کے پاس اس کے لیے بس ایک ہی جملہ تھا۔
”تم سب کے تعاقب میں اپنی فونڈ کی داؤ ب لگا رہی ہو۔“

”تابندہ! کم از کم تم تو ایسا نہ کہو۔“
”ٹومی پلیر! آئی کے لیے سوچو..... انہوں نے اپنی اولاد کے لیے کچھ خواب دیکھے ہیں اب ان کی تعبیر پانے کا وقت ہے۔ تو تم دیوار گھڑی کر رہی ہو؟“

”اور اپنے دل کا کیا کروں جو کسی اور کے لیے آمادہ ہی نہیں ہے؟“

☆ ☆ ☆
تابندہ سے بڑھ کر کون واقف تھا کہ اس کی زندگی کن کڑے حالات کی تصویر تھی۔ باپ سے محرومی..... ماں کی پچھر رشپ کی بدولت گھر میں بھی کالج جیسا لگا بندھا ماحول..... انہوں نے ایسا کڑا مزاج نہ پایا ہوتا تو الگ بات تھی مگر معاشرہ میں خنیا، تین بچوں کے ساتھ، سروا نیو کرنا، یہی کڑا بین ذاتی زندگی کا بھی جزو تھا، سو اس نے اب تک کی زندگی میں محبت کا بس پایا ہی کب تھا۔

ایسے میں کسی کا معمولی سا التفات، توجہ و اہمیت دیے جانا اس کے دل کی دنیا بدل گیا تھا تو کیا عجب تھا..... خیر یہاں تک بھی درست تھا مگر معیز نے اگر اسے اس کا کوئی جگنو، محبت کا کوئی پھول تھا یا ہوتا، تب تو بات فنی تھی۔ مگر اس ایک طرف محبت کی لا حاصل مسافت! اپنا کسی امید کے اس شاندار رشتے کو مسترد کرنا..... حماقت نہیں تو اور کیا کہلاتی۔

مگر اگر کتنے تھے جو اس کے انہیں نہ سمجھ کر بیٹھ کر کہتے تھے.....
”جس نے راہ دکھا کر..... اس کی محبت بخشی..... میں نے اس کا ساتھ بھی نہیں دیا..... نہیں ضرور لکھ رکھا ہو گا۔“
”تو بس اب کونا سننا اور بیٹھی معیز کے نام کی بلا چھو رہو۔ میری بات لکھ کے رکھ لو۔ یہ ایک طرف محبت نہیں کچھ نہیں دینے والی.....“ تابندہ بڑک اٹھی۔

اور اسے اس سب سے بڑھ کر اپنے جذبے کی راکتی پر یقین تھا۔ بھلا کہاں اسلام آباد اور وہاں بسنے والی صولت پچھو کا گھر..... اب تک ہر رشتے سے بس ایک ایک واقفیت تھی..... پچھو تو جیسی، یونہی تو نہیں، بھولی بھلا، پچھو کے دل میں اس کی یاد نے انگڑائی لی۔ یا شاید سب نے عطا کا کوئی حرکت بتایا تھا۔ جواک بھولا بھلا..... راہی ادھر آ کر بھٹکا۔

تابندہ جھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹومیہ مسکرا کر کہیں موند گئی۔ محبت کا ایک دلکش خواب..... دل تھا کہ اس خیال سے محبت کر کہیں اور بھٹکنے پر آمادہ ہی نہ تھا معیز کی چاہت کا نقش..... اور اسلام آباد کی کھلی کب دھوا۔

وہاں گزرا رہے ہوئے وقت نے ہی اسے احساس دلایا کہ زندگی کا ایک رخ یہ بھی ہے۔ اسے لگتا وہ تازہ، کھلی ہوا میں سانس لے رہی ہے۔ کیسا صاف شفاف..... لپکا چھلکا ماحول تھا صولت پچھو کے گھر کا، اور وہاں کے مکین..... جیسے سارے جہاں کی نرمی، حلاوت اس گھر آنے کے رویے میں آن

ہی ہو۔ اک دوسرے کا خیال، سب سے بڑھ کر پیسے کی فراوانی..... اور وہ معیز۔ آہ! شاید یہی وہ اینڈیل تراشی تو ایسا ہی ہوتا۔ کیسی نرمی، تہذیب و حلاوت بھرے لہجے میں بات کرتا، اک بڑے بھیا تھے، ان سب کا دل ان کی تیوری کے بل میں ہی پڑا رہتا..... انہی کا ہر خواب ان سے وابستہ تھا۔ ان کی بینکنگ کی اعلا عظیم کے لیے ان کی انکم کا بڑا حصہ جاتا اور ان کا کڑا لہجہ دروید۔

مگر پچھو کیسی سویرا باوقار اور دریا دل تھیں..... نہ بچٹ میں ٹین رکھنے کے لیے خواہشات کا قفل عام، نہ گھر بھر میں کالج کا سا لگا بندھا ماحول۔ اس کی کزن..... فرحین اب تک پھوپھا جان کے کندھے سے لٹک کر فرمائشیں گنوائی اور وہ دونوں اولاد کی ایک نگار پر بلیک کہہ اٹھتے..... پچھو پچھا جان ہر ویک اینڈ پر گھر بھر کو آؤنگ کے لیے لے کر جاتے..... فرحین میں تو ان کی جان تھی۔ صولت پچھو نے فرحین کو اس کے جھیز کی ہر چیز..... اس کی پسند سے دلوائی تھی۔ اس نے بھی دل بھر کے شاپنگ کی تھی۔

ان سب کو کہاں میسر تھیں..... یہ دل داریاں.....!

بھیا تک تو خیر تھی، ٹومیہ اور رانیہ ہزار بار دل کو مارتیں اور اب معاملہ زندگی کے فیصلے کا تھا۔ تو وہی اسی کا کڑا رویہ اور مزاج کا کرار اپن۔ ان کی کولیگ، آسیہ درانی نے کس چاہ اور مان سے ٹومیہ کا ہاتھ اپنے لائق فائق، اکلوتے بیٹے شارق کے لیے مانگا تھا۔ جو ایم بی اے کے بعد کسی غیر ملکی فرم میں اکاؤنٹنٹ تھا ٹومیہ کو بیاہ کر وہیں سدھارتا تھا۔ انہیں اور کیا درکار تھا؟ شارق کا رشتہ اتنا پر فیکٹ تھا کہ انکار کے لیے جواز میسر تھا، نہ دل آمادہ تھا۔

وہ ٹومیہ کو آمادہ کرتے ہار گئیں تو روہانی ہو گئیں۔

”ٹومیہ!..... کچھ تو میری مشکلات کا خیال کرو۔ تمہارے بعد مجھے رانیہ کے لیے بھی تو سوچنا ہے۔“

تب ہی اس نے برملا کہا۔ ”تو آپ رانیہ کی کر دیں نا۔ اسے بھی تو آخر آپ نے بیاہنا ہی ہے۔“ اور نگار اسے سختی رہ گئیں۔ اس کی بات دل کو گتی تھی۔

رانیہ نے انٹر بھی بشکل کیا تھا۔ فیشن زمانے بھر کے کروالو..... اور جب طے تھا کہ کچھ اور کرنا ہی نہ تھا تو پھر اک شادی ہی رہ جاتی ہے..... اور رانیہ کو بھی تو آخر انہوں نے بیاہنا ہی تھا..... سو وہ جانے کس طرح آسیہ درانی کو اس تک لے آئیں..... اور رانیہ بھی جھٹ پٹ مان گئی۔

اور تابندہ نے ٹومیہ کو فون پر کیا رکھ رکھ کر سنائی تھیں..... مگر وہ مسکرائی ہی رہی دل کو معیز کا نام الاپتے رہنے کی عادت ہو گئی تھی زندگی جیسے ان چند دنوں میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ جب معیز نے رفتہ رفتہ دل کے ایوانوں میں قدم رکھا تھا۔

☆☆☆

وہ فرحین کی رسم کے لیے زرد، گہر دار لمبی فراک، سرخ پاجامہ پر گھیرے بال پشت پر پھیلائے، کانوں میں جھمکیاں ڈالتی غلت میں کوریڈور عبور کرنی ہوئی بے اختیار معیز سے ٹکرائی تو شوخی و شرارت سے بھر اس کا بس اک جملہ ٹومیہ کے دل کی دنیا اٹھل پھل کر گیا تھا۔

ارے..... یہ تم ہو یا کوئی آسمان سے اتری حور.....!“

شاید اس رات، اس نے خود کو پہلی بار آئینہ میں بغور دیکھا تھا۔ بلاشبہ وہ خوب صورت تھی..... مگر بھی کسی نے بتایا ہی نہیں اور سراہنا کس کو کہتے ہیں..... یہ پہلی بار ہی پتا چلا تھا۔

پھر وہ اکثر یونہی آتے جاتے اس پر فخرے کتا۔

”تم بچ مچ آسمان سے اتری کوئی مخلوق ہو، جو بھٹک کر ارم پھیس آگئی ہے۔“

کبھی کہتا اسے پرنسز خردار جو تم اپنی دنیا میں لوٹیں۔ کہیں کوئی ظالم دیو تمہیں نہ لے اڑے۔“

اگرچہ وہ خود چھا جانے والی دلکش شخصیت کا مالک تھا۔

شاید یہ تبسم و تکلم اس کی عادت ہی رہا ہو، وہ نے پیار کا انداز سمجھ بیٹھی تھی۔ مگر صولت پھپھو کے گھر کا ہلکا پھلکا ماحول..... اس کے اندر اتر گیا ہو جیسے..... وہ سب مل کر بننے لگتے..... موج میلہ کرتے محفل جساتے اور کبھی جو گھر کو یاد کر کے اس کی پلکیں جھپکنے لگتیں۔ تو معیز کی گردان۔

مٹکاؤ، کراچی جاؤں گا۔“ اور فرحین اسے چرائی۔ ”کیوں، کراچی تمہارا سرال لگتا ہے کیا؟“ وہ روانی میں کہہ گئی تھی اور ٹومیہ کا دل دھک دھک کرنے لگا..... تب صولت نے محبت سے اسے سیٹ لیا تھا۔

”اے معیز! میری بیٹی کو تنگ نہ کیا کرو۔“ اور وہ سوچتی کہ اتنا عرصہ ان محبتوں سے دور رہ کر انہوں نے کیا خسارہ اٹھایا تھا۔ کیوں وہ سب ان لوگوں کو امی کے دکھائے گئے آئینہ میں دیکھتے رہے۔ پھوپھو تھیں تو وہ جان دارنے کو تیار..... پھوپھا جان نری و شفقت کا پیکر اور معیز و فرحین کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ سب میں اس کی خبر گیری کرتے۔ اس کی فیصلہ کوئی پروا کرتے..... سب سے بڑھ کر معیز جو ساتھ چلا تو دل کہتا کہ یا تو وقت ختم جائے یا مسافت طویل ہو جائے۔

وہ اپنے خول میں بند، لیے دیے رہنے والی حساس لڑکی تھی، جو اس اہمیت و اہمیت پر بچ بچ اپنا آپ بھول بیٹھی تھی۔

☆☆☆

رانیہ کے سدھارنے کے بعد اس نے ماسٹرز کے لیے ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اور وہی ہر رشتے پر اس کا انکار۔ اور یہ کہاں ممکن تھا کہ تپش محبت کی ہو۔ اور آج معیز تک نہ پہنچی..... بلاشبہ وہ اک بھر پور لڑکی تھی جس کا ساتھ اس کی زندگی کو مکمل کر دیتا..... سو اس بار شادی کے ذکر پر اس نے ٹومیہ کا نام ماں کے سامنے

اگرچہ وہ خود چھا جانے والی دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اور شاید یہیں سے سارا رنگاڑ پیدا ہوا۔ نگار نے بھی سرال کو منہ نہ لگایا تو ان پر گھمنڈی کی مہر تھی..... نند بھادج کے مزاج کہاں ملتے تھے۔ بر رشتہ اک عذاب بن جاتا۔ نگار کو سرال کو چھو کر آئی ہوا تک سے بیر تھا، تو صولت بھی کون سا ان کے سامنے جنونی پھیلائے پر آمادہ تھیں..... سو ہار کا مقدور بھی صولت نے اس کے لیے من پسند بہو کے

نذر سارا کر دیا تھا۔ اور فرحین اسے چرائی۔ ”کیوں، کراچی تمہارا سرال لگتا ہے کیا؟“ وہ روانی میں کہہ گئی تھی اور ٹومیہ کا دل دھک دھک کرنے لگا..... تب صولت نے محبت سے اسے سیٹ لیا تھا۔

”اے معیز! میری بیٹی کو تنگ نہ کیا کرو۔“ اور وہ سوچتی کہ اتنا عرصہ ان محبتوں سے دور رہ کر انہوں نے کیا خسارہ اٹھایا تھا۔ کیوں وہ سب ان لوگوں کو امی کے دکھائے گئے آئینہ میں دیکھتے رہے۔ پھوپھو تھیں تو وہ جان دارنے کو تیار..... پھوپھا جان نری و شفقت کا پیکر اور معیز و فرحین کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ سب میں اس کی خبر گیری کرتے۔ اس کی فیصلہ کوئی پروا کرتے..... سب سے بڑھ کر معیز جو ساتھ چلا تو دل کہتا کہ یا تو وقت ختم جائے یا مسافت طویل ہو جائے۔

وہ اپنے خول میں بند، لیے دیے رہنے والی حساس لڑکی تھی، جو اس اہمیت و اہمیت پر بچ بچ اپنا آپ بھول بیٹھی تھی۔

رانیہ کے سدھارنے کے بعد اس نے ماسٹرز کے لیے ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اور وہی ہر رشتے پر اس کا انکار۔ اور یہ کہاں ممکن تھا کہ تپش محبت کی ہو۔ اور آج معیز تک نہ پہنچی..... بلاشبہ وہ اک بھر پور لڑکی تھی جس کا ساتھ اس کی زندگی کو مکمل کر دیتا..... سو اس بار شادی کے ذکر پر اس نے ٹومیہ کا نام ماں کے سامنے

اگرچہ وہ خود چھا جانے والی دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اور شاید یہیں سے سارا رنگاڑ پیدا ہوا۔ نگار نے بھی سرال کو منہ نہ لگایا تو ان پر گھمنڈی کی مہر تھی..... نند بھادج کے مزاج کہاں ملتے تھے۔ بر رشتہ اک عذاب بن جاتا۔ نگار کو سرال کو چھو کر آئی ہوا تک سے بیر تھا، تو صولت بھی کون سا ان کے سامنے جنونی پھیلائے پر آمادہ تھیں..... سو ہار کا مقدور بھی صولت نے اس کے لیے من پسند بہو کے

اتنے انٹ تھے کہ کبھی دم تک نہ پڑ کے دیے۔

☆☆☆

جانے کتنا وقت بیتا..... کتنے موسم گزرے۔ اک اس کی نہ..... ہاں میں نہ بدلی۔ اک زمانہ اس کی عظمت کو سلام کرتا۔ اس کا صاف و شفاف کردار..... کوئی معمولی بات تھی۔ زندگی کی کے نام کر دینا۔ وقت کا بہرہ چل رہا تھا کچھ گزر گئی تھی، کچھ گزر جاتی تھی۔ یہی اس کا فیصلہ تھا اور شاید یہیں آ کر وقت کی روش بدلتی درج تھی۔ یہ اس کے جذبے کی راستی، محبت کی انتہائیں تھیں، تو اور کیا تھی۔ وہ زندگی کے انہی گھٹنے بڑھتے دنوں میں سے اک دن تھا۔ جب صولت، ٹومیہ کے لیے دامن پھیلائے چلی آئیں..... وقت نے ان کی آن کا بت توڑ دیا تھا، ان کی من پسند بہو نے انہیں تنگی کا ناچ نچایا۔ آخر کار شکست ان کا مقدور تھی..... ٹومیہ ان کے لیے بہترین بہو ثابت ہوگی۔ یہ بات آخر کار ان کی سمجھ میں آئی گئی۔

ٹومیہ اور معیز کا ملن اک کڑی مسافت کے بعد ہی ممکن ہو سکا تھا۔ یہ سب یوں ہی ہونا لکھا تھا۔ سو یوں ہی ہو کر رہا۔

شاید یہ فیصلے بہت پہلے کہیں ہو چکے ہوتے ہیں۔ محبت اک وسیلہ ہے۔ قدرت جب کسی کا ساتھ لکھ دیتی ہے تو اس کا ایک وقت بھی مقرر ہوتا ہے اور تب تک کوئی نہ کوئی وجہ بن کر سامنے کھڑی رہتی ہے..... اور یہ بات کافی دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔

☆☆☆

دوست مہیا

مکھ میما

قیمت - 400 روپے

کتبہ معراج ڈائجسٹ: 37 - ادیبان سرگرمی - ڈان نمبر 32735021

خجندی

سیرت کی حر

<https://www.urdutubes.com/>

”سليم منزل“ کے اکوڑے چشم و چراغ سليم الدين کی والدہ حمیدہ علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو اپنے والد کے دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ پسند آجاتی ہیں۔ لیکن حمیدہ خاتون دل سے اپنی تعلیم یافتہ بہو شگفتہ بیگم کو قبول نہیں کرتیں۔

ظہیر احمد ایک سرکاری افسر ہیں مزاج انتہائی بد مزاج، اکھڑ۔ ظہیر احمد کے اور رقیہ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں۔ اسامہ شمیم، نکیل اور جمیل۔ ظہیر احمد کے بڑے بھائی کبیر احمد کے دو بیٹے عابد اور ساجد جن کی شادیاں اسامہ اور شمیم سے ہوئی ہیں اور تین بیٹیاں جن میں دو نکیل اور جمیل کی بیویاں ہیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔

پھر موسم آتے جاتے رہے، رتیں بدلنے لگیں۔ سليم منزل میں ابا جان، اماں جان رخصت ہو چکے تھے البتہ ام کلثوم پھولوں اور کلیوں سے مہک اٹھا تھا۔ زہیر اور شہلا گھر چھوڑ کر چاچے تھے۔ ان کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ وسیم، کلیم اور غفر کے بیٹے بیٹیاں، شگفتہ بیگم اور سليم میاں کو دادا جان اور دادی جان کہہ کر لپٹا کرتے۔ منیرہ کے بچے نانا جان اور نانی جان کہتے۔

غفر اور گلشن کا ایک بیٹا سفیر اور چار بیٹیاں شفق، مہک، عاتکہ اور صبا تھیں۔ وسیم کی دو بیٹیاں عاتکہ اور فائزہ اور تین بیٹے روکیل، فیصل اور جمیل تھے جبکہ کلیم اور نفیسہ کے دو بیٹے ہارون، شمعون اور بیٹیاں ثناء اور زیب تھیں۔ منیرہ کی دو بیٹیاں شابی اور تاندہ تھیں اور ایک بیٹا غفرین تھا۔

ساجد نے شمیم کی اجازت سے منیرہ سے دوسری شادی کر لی تھی لیکن گھر والے اس شادی سے لاعلم تھے۔ ساجد کی شمیم سے تین بیٹیاں سارہ، زارا اور عمارہ تھیں اور منیرہ سے سے تین بیٹے ارمغان، داؤد اور زین تھے۔ ساجد کے بیٹے اپنے



باپ سے ناراض رہتے ہیں کیونکہ انہیں اپنے دادا کے گھر میں پہچان اور رشتے چاہئیں۔ خاص کر کے ارمغان باپ کو بہت ناپسند کرتا ہے۔

سارا کی مکتبی اسامہ اور عابد کے بیٹے سعد سے ہو جاتی ہے لیکن فہد کو زارا انکار کر دیتی ہے۔ اسے فہد پسند تو ہے پر خاندانی غصے اور غور توں کو ان کا حق نہ دینے کی وجہ سے وہ فہد سے شادی کرنے سے انکاری ہے۔

ارمغان کا دوست سرد جس کی دو بہنیں ہیں، حادیہ اور سعدیہ۔ ان کے والدین وفات پا چکے ہیں۔ سعدیہ اپنے کزن ہمایوں کو پسند کرتی ہے۔

راہی اور روبیکا کی ایک بیٹی ٹی ہے جو مغربی ماحول میں بگڑ گئی ہے۔ جس کا ذمہ دار راہی، روبیکا کو سمجھتا ہے۔ اس کا ایک دوست ہے انور جس کی ان کی بیٹی سے دوستی ہے۔

راہی اپنے اسٹور میں ایک پاکستانی فرجاناتی لڑکے کو نوکری دیتا ہے جو بہت ایمان دار ہے۔ فرجادی کو دیکھتے ہی اس کو پسند کرنے لگتا ہے۔

ایک رات فرجادی راہی کے گھر پہنچتا ہے تو ٹی اس کو مدہوشی کی حالت میں گھر سے باہر ملتی ہے۔

گیارہویں قسط

دونوں بہنوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ فہد اپنے اندر کی توڑ پھوڑ کو اپنی مرادگی کی مٹی میں دبائے دونوں کو دیکھنے لگا۔ عجیب سی سرد گہری شام کا دھواں تھا جس نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ کثافت سے سب کا دم گھٹا وہ قہقہہ لگا کر ہنستا ہوا دونوں کے قریب آ گیا۔

”اوہ! تم آگم لڑ! میں نے ایسا کون سا راکٹ سائنس کا فارمولا پوچھ لیا ہے کہ آپ دونوں ایسے گم ہو گئی ہیں بالکل ایسے اسٹوڈنٹ کی طرح جس کا فاضل ایکزام ہو اور اس نے رتی برابر تیاری نہ کی ہو اور میں سمجھتا ہوں اس وقت آپ دونوں کی کیا کیفیت ہوگی۔“

اس نے تو اپنے لہجے کے چاروں طرف ضبط کی فضیلیں کھڑی کی تھیں پھر بھی سسکیاں کیوں ابھر رہی تھیں۔ ”بکو! مت ٹیکہ کیا اول فول بک رہے ہو۔“ کوئی کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔ ”اسامہ نے اسے ڈانٹا تو وہ ٹھینے کے قریب آیا۔ جو بس رو دیئے کوئیں کیونکہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ فہد کی باتیں بے مقصد نہیں ہیں۔“

”سن لیجیے والدہ! میں بک نہیں رہا حقیقت بیان کر رہا ہوں اور اس حقیقت کو میں نے بھی انکاروں پر چل کر تسلیم کیا ہے آپ لوگ بھی کرو اور بے چاری بچی کو آزاد چھوڑو..... اور کرنے دو جو کرنا چاہتی ہے۔“ فہد کی نظر دیوار کی اوٹ میں کھڑی زارا کے پیروں پر جمیں جو اسے ادھر آتے دیکھ کر وہیں آگئی تھی اور اندر آنے کے بجائے اوٹ میں چھپ کر باتیں سن رہی تھی۔

”ہونہ! ڈرا سے باز اس قسم کی باتیں کر کر کے امی کو ہراساں کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔“

”تم دونوں میری جان لے کر رہو گے۔“

ٹھینے کے آنسو کو دھو دھو سر رکھ کر لپٹے فہد کے ماتھے پر گرے تو بل بھر کو فہد کا دل چاہا۔ انا، خود داری کی دیوار کو گرا کر مولوی کو لائے زارا سے زبردستی نکاح کر لے۔ مگر بھوری یہ تو تھی کہ نکاح میں زبردستی نہیں رضامندی ہے،

دونوں فریقین کی اور دوسری فریق تو اس حوالے سے اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی اور زبردستی میں نکاح اسے گوارا نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے زارا سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”کم آن سائی ملکہ جذبات بننے کی قطعی ضرورت نہیں آپ کی لڑکی ہے بہت بد مزاج خود سر منہ پھٹ، بک چڑھی، بھل جھڑی اور نجانے کیا کیا۔ اور میں ٹھہرا ایک خوب رو جیہہ شکل۔ پیٹنڈم، خوش شکل، خوش گفتار خوشبودار پھولوں سے پیار کرنے والا۔ بھلا پھر یہ نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ دل کا درد چھپائے ٹھینے کے آنسوؤں کو دیکھتا ہوا غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اوٹ میں کھڑی زارا کو دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اس نے پاؤں پیچھے کیے تو فہد جس کی نظریں ہی اس کے پیروں پر جمیں زخمی سے لہجے میں بولا۔

”ایک بات تو یقیناً یار سائی حالت بدی کے آنسو معتبر ہوتے ہیں جو آنکھ سے گرتے ہیں یا جھول پر گرتے ہیں۔“ اس کا بھڑو دیا تو ٹھینے نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر ماتھا چوم لیا۔

”خیر بے لیے صرف وہ آنسو معتبر ہیں جو میرے فہد کے دل پر گر رہے ہیں۔“ ٹھینے نے فہد کو ساتھ لگا لیا تو ضبط کی ساری دیواریں گرا کر لے ٹھہرا آنسو ٹھینے کی ساڑھی میں جذب ہو گئے۔ اسامہ کو دونوں کی تکلیف ہو رہی تھی۔ ”بند کرو یہ جذباتی ڈرامہ تم دونوں خالہ بھانجے تو پاگل ہو۔ جب دیکھو بھانجا ڈائلاگ بول رہا ہوتا ہے، غلام صلیب رو رو کر بلکان ہو رہی ہوتی ہیں۔ دونوں کو اس بات کی پروا نہیں کہ شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ اسامہ کو دانتی غصہ آ گیا تو فہد نے ساڑھی سے آنسو صاف کیے اور جھپکے سے اٹھا۔

”تو یہی تو ہیں جی کہہ رہا ہوں خواتین کہ شادی والا گھر ہے شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں کوئی تیاری نہیں..... کوئی شور ہنگامے نہیں..... ڈھول تاشے نہیں۔ میں ابھی جا کر ڈھول لے کر آتا ہوں۔ ارے بھی تو جوان نسل کہاں ہے۔ خصوصاً لڑکیاں کہاں ہیں۔ وہ بیگی پلکیں بڑی صفائی سے خشک کر کے باہر نکالتا تو زارا گھبرا کر پیچھے ہٹتی تھی۔

”ایک لڑکی کی ایک لڑکی کر تے ہوئے بولا۔“ ”ارے! تم کب آپس میں سڑیل خاتون۔“ ”میں ابھی ابھی آئی ہوں۔“ ”ابھی ابھی..... اوہ! اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا تو وہ ہٹا گئی۔“ ”ہوں! تو نہیں کیا ہے۔ جب بھی آؤں۔ کوئی اعتراض ہے۔“ ”ہاں ہے ناں ارے بھئی، میسے کی بات اور ہوتی ہے۔ اب نجانے تمہارا سسرال کہاں بنے۔ نجانے کس کے ساتھ شادی ہو تمہاری۔“ اس کا لہجہ سرد پڑ گیا۔ ”یہ نہیں شادی کا اتنا شوق کیوں ہے؟“

”بے نہیں..... تھا۔ کیونکہ دل کو جلانا ہم نے چھوڑ دیا۔ چھوڑ دیا۔ پھرتے تھے مارے مارے تیری گلی میں پیار سے لے آنا جانا ہم نے چھوڑ دیا۔ چھوڑ دیا۔ اب خوش“ وہ دل کا درد چھپائے گنگنا تا ہوا آگے بڑھا پھر پلٹا۔ ”یہ حازار کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تو وہ اندر سے مل گئی۔“

☆☆☆

سعدیہ کے لیے ہمایوں کا ساتھ بہت بڑی خوش قسمتی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے ہر جگہ کی سیر کر رہی تھی سنگا پور کا کون سا مال، پارک یا تفریح گاہ نہیں تھی جہاں وہ نہ گئے ہوں۔ اس وقت بھی وہ لوگ سنگا پور کے سب سے اچھے شاپنگ مال میں گھوم رہے تھے ہمایوں اور سعدیہ نے سعدیہ اور حادیہ کو ڈھیروں شاپنگ کرا دی تھی۔

”حادیہ! دیکھو یہ ساڑھی مجھ پر سوٹ کرے گی ناں۔“ ساڑھیوں کی ایک شاپ پر سعدیہ کو ایک ساڑھی پسند آگئی تو وہ حادیہ سے رائے لینے لگی۔

”بہت زیادہ سوٹ کرے گی میری گڑیا یہ ساڑھی اور یہ رنگ!“ حادیہ سے پہلے سرمہ نے اپنی رائے دی تو ہمایوں منہ بنا کر سرمہ اور سعدیہ کو گھورنے لگا۔

”آپ بتائیے ناں کیسی لگے گی؟“

”ہوں! زیر دست تمہاری پسند تو ہمیشہ لا جواب ہوتی ہے۔“ ہمایوں نے سرمہ اور حادیہ کی نظر بچا کر کہا اور وہ ساڑھی خود سعدیہ کے لیے خرید لی۔

”ارے! ہمایوں یہ کیا تم نے عینٹ کیوں کی؟“ سرمہ کے اعتراض پر ہمایوں نے جواب دیا کہ ”میرے پاس جو بھی اللہ کے بعد تمہارے ابا کا ہے تو تم لوگوں پر ہی خرچ کر دیا تو روک ٹوک کر مجھے حیثیت مت یاد دلایا کرو یا رے۔“

ہمایوں نے دیکھا سرمہ کے چہرے پر شرمندگی اور سعدیہ حادیہ کے چہروں پر ہمدردی کی اس شام کے سائے اتر آئے۔ سعدیہ کی تو باقاعدہ پلکیں بھیگ گئیں۔ حادیہ ہمایوں سے ناراض ہونے لگی۔

”ہمایوں بھیا۔ میں آپ سے ناراض ہوں۔“ وہ ہمیشہ سے ناراض ہو کر بچوں کی طرح چھوٹی انگلی اسے دکھائی تو وہ جان دار قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”مجھے کیا حاسد لڑکی! معلوم تھا مجھے کہ تم سعدیہ سے جل گئی ہو کہ ہمایوں نے آپ کی ساڑھی دلا دی مجھے نہیں۔ چلو تم بھی کوئی اچھی ساڑھی پسند کر دو تاکہ میری سعدیہ، وہ..... وہ میرا مطلب ہے سعدیہ کی ساڑھی کو نظر نہ لگے.....“ ہمایوں کو بات کا رخ اور مطلب بدلنا خوب آتا تھا۔ حادیہ پیار سے ہمایوں سے لپٹ گئی۔

”بھیا! آپ بھی ناں اور کچھ بھی نہیں لیتا۔ ساڑھی تو ہرگز بھی نہیں.....!!“

”کیوں بھئی، ساڑھی تو تم پر ہی سوٹ کرے گی اتنی حسین ہو۔ اسارٹ ہو اور تو تمہیں مناتے مناتے آتے ہیں دوست کو منانا بھول گیا وہ دیکھو کیسے منہ پھلا کر مجھے گھور رہا ہے۔“ ہمایوں، حادیہ کو چھوڑ کر چند قدم دور ناراض کھڑے سرمہ کی طرف بڑھا۔

”کم آن یا ر! تم خفا کیوں ہو۔ آؤ تم بھی ساڑھی خرید لو اپنے لیے۔ خوب سچے گی تم پر۔ چلو اپنی جیب خاص سے لے کر دوں گا اور تمہیں خاص رعایت ساتھ میں میچنگ سینڈل بھی ہائی ہیل والی لے کر دوں گا وعدہ۔“

ہمایوں شوخی میں کہے جا رہا تھا اور ساتھ قہقہہ لگا کر ہنس دیا تو سرمہ نے اس کے شانے پر دمکا مارا اور گلے لگا لیا۔

”بہت کمینے ہو تم۔ مت کیا کرو یا ر دل جلانے والی باتیں ارے تم تو ہمارے گھر کی زندگی ہو۔ جان ہو ہم سب کی۔“

”سب کی؟“ ہمایوں نے شہارت سے پلٹ کر سعدیہ کو دیکھا۔ جس کے شام جیسے رخساروں پر دھنک اتر آئی تھی۔ اس نے اثبات میں سر اور پلکیں جھکا لیں۔

”یا اللہ! یہ شخص میرے مقدر میں لکھ دے۔ آمین۔“ دھڑکنوں کی دعا پر لبوں نے آہستگی سے آمین کہا۔

”آپ! کہاں کم ہیں۔ بتا دوں سعدیہ!“

”مجھے پتا ہے یہ کہاں کم ہیں۔ بتا دوں سعدیہ!“

ہمایوں بہت شوخ ہو رہا تھا۔ سعدیہ نے لپکا کر انکار میں گردن ہلا دی۔

”ہونہہ! میری نہ جانا اس خوش فہمی میں۔ لنگڑی بد شکل لڑکی۔“ ہمایوں کی سوچ سے کوسوں دور سعدیہ شرمائے جا رہی تھی۔ اپنی قسمت پر رشک کرتی، اللہ کا شکر ادا کرتی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اس کے تیز قدموں کا ساتھ نہیں دے پاتی تو حوصلے ڈھے سے جاتے۔ تو وہ مکاری سے ہاتھ بڑھاتا۔

”چلیے میڈم! وہ اس کے بڑھے ہاتھ دیکھتی پھر سرمہ کو جواب ایک جیولری کی شاپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کتنی خوب صورت جیولری تھی کہ سرمہ کے قدم بے ساختہ اس کی طرف بڑھے۔ زارا کا خیال کسی خوشبو کی طرح دل کو چھو گیا۔

”اوسر نہیں سرا! ہمیں پارکنگ کی طرف جانا ہے۔“ ہمایوں نے ٹوکا۔

”ارے! ہمایوں یہ کیا تم نے عینٹ کیوں کی؟“ سرمہ کے اعتراض پر ہمایوں نے جواب دیا کہ ”میرے پاس جو بھی اللہ کے بعد تمہارے ابا کا ہے تو تم لوگوں پر ہی خرچ کر دیا تو روک ٹوک کر مجھے حیثیت مت یاد دلایا کرو یا رے۔“

ہمایوں نے دیکھا سرمہ کے چہرے پر شرمندگی اور سعدیہ حادیہ کے چہروں پر ہمدردی کی اس شام کے سائے اتر آئے۔ سعدیہ کی تو باقاعدہ پلکیں بھیگ گئیں۔ حادیہ ہمایوں سے ناراض ہونے لگی۔

”ہمایوں بھیا۔ میں آپ سے ناراض ہوں۔“ وہ ہمیشہ سے ناراض ہو کر بچوں کی طرح چھوٹی انگلی اسے دکھائی تو وہ جان دار قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”مجھے کیا حاسد لڑکی! معلوم تھا مجھے کہ تم سعدیہ سے جل گئی ہو کہ ہمایوں نے آپ کی ساڑھی دلا دی مجھے نہیں۔ چلو تم بھی کوئی اچھی ساڑھی پسند کر دو تاکہ میری سعدیہ، وہ..... وہ میرا مطلب ہے سعدیہ کی ساڑھی کو نظر نہ لگے.....“ ہمایوں کو بات کا رخ اور مطلب بدلنا خوب آتا تھا۔ حادیہ پیار سے ہمایوں سے لپٹ گئی۔

”بھیا! آپ بھی ناں اور کچھ بھی نہیں لیتا۔ ساڑھی تو ہرگز بھی نہیں.....!!“

”کیوں بھئی، ساڑھی تو تم پر ہی سوٹ کرے گی اتنی حسین ہو۔ اسارٹ ہو اور تو تمہیں مناتے مناتے آتے ہیں دوست کو منانا بھول گیا وہ دیکھو کیسے منہ پھلا کر مجھے گھور رہا ہے۔“ ہمایوں، حادیہ کو چھوڑ کر چند قدم دور ناراض کھڑے سرمہ کی طرف بڑھا۔

”کم آن یا ر! تم خفا کیوں ہو۔ آؤ تم بھی ساڑھی خرید لو اپنے لیے۔ خوب سچے گی تم پر۔ چلو اپنی جیب خاص سے لے کر دوں گا اور تمہیں خاص رعایت ساتھ میں میچنگ سینڈل بھی ہائی ہیل والی لے کر دوں گا وعدہ۔“

ہمایوں شوخی میں کہے جا رہا تھا اور ساتھ قہقہہ لگا کر ہنس دیا تو سرمہ نے اس کے شانے پر دمکا مارا اور گلے لگا لیا۔

”بہت کمینے ہو تم۔ مت کیا کرو یا ر دل جلانے والی باتیں ارے تم تو ہمارے گھر کی زندگی ہو۔ جان ہو ہم سب کی۔“

”سب کی؟“ ہمایوں نے شہارت سے پلٹ کر سعدیہ کو دیکھا۔ جس کے شام جیسے رخساروں پر دھنک اتر آئی تھی۔ اس نے اثبات میں سر اور پلکیں جھکا لیں۔

”یا اللہ! یہ شخص میرے مقدر میں لکھ دے۔ آمین۔“ دھڑکنوں کی دعا پر لبوں نے آہستگی سے آمین کہا۔

”آپ! کہاں کم ہیں۔ بتا دوں سعدیہ!“

”مجھے پتا ہے یہ کہاں کم ہیں۔ بتا دوں سعدیہ!“

ہمایوں بہت شوخ ہو رہا تھا۔ سعدیہ نے لپکا کر انکار میں گردن ہلا دی۔

پیراوی



نسیم حسینی
قیمت - 400 روپے

دستِ دوگر



فوزیہ رحیمین
قیمت - 750 روپے

دل لاری
گلشن



رضیہ جمیل
قیمت - 300 روپے

چلمن



نادرہ خاتون
قیمت - 300 روپے

فون نمبر:
32735021

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

”ہائے ہوی بھیا! وہ وقت تو آئے کہ میرے بھیا کوئی کوئی لڑکی پسند آئے۔ تو ہم دونوں ہمیں خوشی سے پاگل ہو جائیں گی اور اپنے بھیا کی چاندی پسند کو وہیں بنا کر گھر لے آئیں گے اور..... اور آپ ہم بھیا کی شادی کی شاپنگ نہیں آکر کریں گے۔“ حادیہ نے خیالی پلاؤ بنانا شروع کر دیا۔ سرد مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بہنوں کو دیکھ رہا تھا ان کی محبت میں زارا کو وہیں بنے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ ہمایوں کوئلہ ہو گیا جل کر۔

”ہونہ! چاندی وہیں لڑکیوں حواسوں میں آؤ۔ چاند کے ساتھ سورج ہونا چاہیے۔ میرا مطلب فی الحال ہمیں اس سورج کو اپنے چاند کے لیے شاپنگ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔ کم گزرتے۔“ حسد پر اکتیا نہیں تھا ہمایوں کو مگر بات سنبھال لیتا تھا۔

”اوہو! ہمایوں تم اور یہ لڑکیاں بالکل غلط سوچ رہے ہو۔ ارمغان کو تو تم تینوں جانتے ہو۔ اس لیے وہ اس کے لیے دیکھ رہا ہوں۔“ سرد پھر نظر سچا گیا وہ تو جھوٹ اور غلط بیانی کا قائل نہیں مگر پھر یہ کیسا جذبہ تھا زارا کے لیے کہ وہ ان تینوں کو جھوٹ بول کر مطمئن کر گیا تھا۔

”اوکے! چلو لڑکیوں۔“ وہ تینوں آگے بڑھے لڑکیاں مزید آگے بڑھیں تو ہمایوں شوخی سے پلٹا اور سرد کے قریب آکر آہستگی سے بولا۔

”سنیے! ادال میں کچھ تو کالا ہے۔ وہ میرا مطلب ہے مجھے ضرور بتانا اس کا نام۔“ سرد نے جھجک کر اسے دھکیلا اور ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تو سرد کی نگاہیں پرل موتیوں کے ست لڑی ہارنا پس اور رنگ پرچی ہوئی تھیں۔

”تم تو قدرت کا حسین شاہکار ہو زارا! تمہارے لیے یہ گفٹ لوں یا نہ لوں وہ کیا سوچے گی۔ یقیناً اس کی رائے بھی میرے بارے میں وہی ہوگی جو دوسری لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ کالا کو۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہارے کسی انداز کی بات سے میری ظاہری شخصیت کے بارے میں تاثر نہیں جھلکا۔ مگر.....“

”ایلیکسیو! سر! آپ کو کچھ بائے کرتا ہے تو کرو ورنہ نام نماز کو جانا ہے۔“ بنگالی دکان دار نے سرد کی محویت توڑی تو وہ بری چونک کر خوابوں کی راہ گزر سے واپس ماحول میں لوٹ آیا۔

”سوری پلیر! اسے پیک کر دیں۔“

اس نے ہاتھ میں پکڑا پرل سیٹ دکان دار کو دیا۔ اس کے بعد اس نے ارمغان اور منیبہ کے لیے گفٹ لیے اور کار پارکنگ کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

”نئی سے شادی! تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو ایسا سوچنا بھی مت۔“ ندیم کو تقریباً سات آٹھ سال ہو گئے تھے ان لوگوں کے ساتھ اس نے توبس اپنے کان اور آنکھیں حوصلہ رکھی تھیں منہ پر تالا لگا رکھا تھا۔ تب ہی توباک ان کے پاس نکلا ہوا تھا ورنہ روپکا تو وہ ناگن بھی کہ اندر ہی اندر ڈس کر بندہ مار دیتی اور رائی کو کانوں کا تجربہ ہوتی۔ اس لیے ندیم فرجاد کو سمجھا رہا تھا۔ جو اتنی بڑی بات کر گیا تھا چہرے پر اعتماد اور یقین تھا۔

”وہ محبت ہی کیا جو بندے کو پاگل نہ کر دے۔“ فرجاد گہری سوچ میں تھا۔

”یار! محبت تو وہ جذبہ ہے جو کسی اجازت کا باند نہیں ہوتا اس کے لیے تو دل خود در دل وا کیے چشم براہ ہوتا ہے۔ مگر شادی کے لیے..... وہ بھی پسند کی شادی ہے تو موسو پاؤ بیٹنے پڑتے ہیں۔ میری طرف دیکھ بیٹا کو کتنا چاہتا ہوں مگر شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ ندیم نے بے بسی سے حال دل کہہ دیا تو فرجاد اسے دیکھنے لگا۔

”ڈونٹ وری ہو جائے گی تمہاری بیٹا سے شادی۔“

”سچ سائیں بابا! ہو جائے گی بیٹا سے میری شادی اچھا پھر کوئی تعویذ بنا دیں تاکہ کوئی رکاوٹ نہ آئے۔“

ندیم شوخی سے ہنسا تو فرجاد نے بھی اسی انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”رب کو راضی کر بیچ..... رب راضی تو سب راضی۔“ دونوں ہنسے۔

☆☆☆

”اچھا تو اب تم بالکل سیٹ ہوتا۔ رائی!“ انور نے گرم گرم کافی کاسپ لے کر پوچھا۔ تو ٹی ماں کے اشارے سے اٹھ کر رائی کے شانے سے آگئی۔

”اف کورس انگل! ڈیڈ باکسل ٹھیک ہیں اور پلیر آپ بار بار مت کہیں مجھے ڈر لگتا ہے ڈیڈ کی بیماری سے۔ ڈیڈ سوپ لے آؤں گرم کر کے، یہ تو ٹھنڈا ہو چکا ہے۔“ ٹی کا حد سے زیادہ خیال رکھنے سے رائی کا خون بڑھ رہا تھا۔

”کیوں کام کرے۔“ رائی نے روپکا کو دیکھا۔ تو وہ اپنی کوششوں کو کامیاب ہوتے دیکھ کر مصنوعی ناراضی سے لگی۔

”ٹی اپنی بیٹی ہے ناں اس لیے اس کا خیال ہے مگر میں تو پرانی بیٹی ہوں ناں میری تو پردائی نہیں۔“

”روپکا! یہ شوہر برادری ایسی ہی ہوتی ہے اپنی بیٹیوں کو تولد میں چھپا رکھتے ہیں، چاہتے ہیں کہ دنیا جہاں کی خوشیاں ان کے دامن میں بھر دیں جبکہ پرانی بیٹیوں کو.....“ نجمہ نے طنزیہ نظروں سے انور کو دیکھا جس سے شادی تو محبت کی بھی اس کے بعد نفرت اور عداوت ہی نہ پائی دووں نے نظریاتی اختلاف کی وجہ سے انور کا شمار بھی ایسے مردوں میں تھا کہ محبت میں اندھے ہو وہ بھی کر گزرتے ہیں جو نہیں کرنا چاہیے تھا اور بعد میں احساس جرم سلگنا پڑتا ہے۔

”تم تو نجمہ بیگم جی ہی رہو۔ سب جانتا ہوں تم جیسی پرانی بیٹیاں کہے تباہی چاتی ہیں۔ زندگی کی بساط ہی الٹ دیتی ہیں۔ گوشت کو ناخنوں سے الگ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ انور کا ماضی جنون بن کر اس کے سر پر سوار رہتا وہ سوچ میں۔“

”نجمہ! یہ شروع کرنا شروع۔ تمہیں تولد کی بھڑاس نکالنے کا موقع چاہیے۔ آؤ روپکا ہم کچن میں چلتے ہیں۔“ نجمہ بھی ایسی ڈھٹ کر گئی جو اپنی غلطی مانی ہو کہ اپنی ذات سے اتنے لوگوں کو دکھی کر کے بھی ناشکری نہ تھی۔ ناشوہر کی قدر کی، ناپاک کر دیکھنے کی اجازت۔ دو اپنا بیگ اٹھا کر روپکا کے ساتھ کچن میں جا چکی تھی انور نے دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا اور ٹائٹل صوفے پر گر کر کمرل میں لیٹ لیں۔ رائی بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ اک ٹیس سی اس کے دل میں اٹھی۔ تو ٹی چونگی۔

”آریو! اوکے ڈیڈ؟“ ٹی نے ماں کی ہدایت کے مطابق باپ کا ہاتھ چوم کر ضرورت سے زیادہ پریشانی ظاہر کی تو رائی اسے دیکھنے لگا۔

”ہوں! میں ٹھیک، دل بیٹا۔ تم ایسا کر وفر جا دیا ہر ہوگا اس کو بلا کر لاؤ۔“

”فر جا د.....؟“ ڈیڈ اسی شخص کو تو آپ کی زندگی سے نکالنا ہے۔

”جی ڈیڈ! فر جا د تو اسی وقت چلا گیا تھا۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اطلاع دی تو رائی کچھ حیران ہوئے۔

”چلا گیا باوجود اس کے کہ میں نے کہا تھا کہ نہ جائے۔“

”آئی ڈونٹ نو ڈیڈ! وہ چکا ہے۔“

”اوکے! اجاؤ دیکھو سوپ گرم ہو گیا ہے تو لے آؤ۔“

”جی ڈیڈ!“ ٹی خوش تھی کہ اس نے فرجاد کے خلاف باپ کے دل میں بدگمانی کا بیج بو دیا تھا وہ حکم کی بجا

آوری کے لیے چلی گئی تو راہی نے تکیے کے نیچے رکھا موبائل نکالا۔ فرجاد کا نمبر ملایا۔
”السلام علیکم سر!“ جو آیا وہی مودب لہجہ۔

”فرجاد بیٹا کہاں ہو تم؟“

”سر! میں آپ کے گھر کے گیٹ پر کھڑا ہوں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔“

”کیا؟ مگر میں نے تو بتایا تم اسی وقت چلے گئے تھے۔“

”نہیں۔ ٹی بی ایم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ کے حکم کے بغیر کہیں مل سکتا ہوں بھلا۔ البتہ اب اگر آپ

اجازت دیں تو کافی ہاؤس چلا جاؤں ندیم بھی نہیں گیا۔ تو باقی سب بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔“

”نہیں تم دونوں اندر آؤ بارش ہونے والی ہے۔ کھانا کھا کر چلے جانا۔“

”سر! وہ اقبال ابھی چھوٹا ہے، تعلیم بھی کم ہے تو وہ کافی ہاؤس نہیں سنبھال سکتا یوں بھی ورکرز اس کی بات

نہیں مانتے۔ مگر آپ اجازت دیں تو.....“

دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا کہ اپنی حریف کو جلانے مگر کام اور باس کے ساتھ وفاداری ہر چیز پر جذبے پر

حاوی تھی۔

”میں نے کہہ دیا ناں کہ آ جاؤ کھانا کھانے، میری خاطر۔“

”سر! آپ کی خاطر تو جان حاضر ہے۔ آپ کا حکم ہے تو آتے ہیں ہم۔ اللہ حافظ۔“ وہ موبائل آف کر کے

ندیم کو دیکھنے لگا۔

”چلو باس کھانا کھا کر جانے کا کہہ رہے ہیں۔“

”اچھا ان کی ٹیکم اور بیٹی ہماری بوٹی کر کے کھا جائیں گی۔“

”پانچہر شری بنا کر اڑا دیں گی۔“ دونوں خوش گوار موز میں اندر کی طرف بڑھے۔

”جی! تم وہ سوپ لے کر آئی اور کھ کر جانے لگی تو راہی نے قدرے برہم انداز میں اسے پکارا۔ وہ بیٹی

”لیس ڈیڈ!“ وہ حیران نظروں سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

”تم نے جھوٹ کیوں بولا کہ فرجاد چاچا ہے۔ جبکہ وہ گیٹ پر ٹھنڈ میں کھڑا ہے۔“ فرجاد کے نام پر بیٹی

کے تختے پھول گئے۔

”وہ ابھی تک کیوں نہیں گیا۔ ماں نے اسے اسی وقت اسٹور اور کافی ہاؤس جانے کا کہا تھا۔ وہ اس قدر غیر

ذمہ دار ہے اور ڈیڈ آپ اس کی سائنڈ لیتے ہیں۔ میں ابھی جا کر اس کی خبر لیتی ہوں ڈھیٹ آ دی۔“ وہ غصہ سے

باہر کی طرف بڑھی۔

”جی! کم بیک ابھی میں زندہ ہوں اس لیے تمہارا یا تمہاری ماں کا حکم نہیں چلے گا۔ ندیم اور فرجاد ڈنر کر کے

جائیں گے۔ ماں کو بتا دو احساسا کھانا تیار کریں۔“

”ڈیڈ!“ وہ احتجاجا بولی۔

”گوا!“ راہی نے سختی سے کہا۔ تو کچھ دیر قبل ایک ٹنگ والی فرمان برداری بھی ہوا ہوگئی۔ وہ پاؤں پٹختی چلی

گئی۔

”راہی۔ تم غصہ نہ کرو..... طبیعت خراب ہو جائے گی یہ عورتیں ایسا ہی کرتی ہیں۔ خود تو جو کرنا ہے انجام

دیتی ہیں۔ سو دیتی ہیں بیٹیوں کو بھی اپنے رنگ میں ڈھال لیتی ہیں۔ یہ میری تمہاری نہیں یہاں موجود تقریباً ہر

پاکستانی کے گھر کی کہانی ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ ہم مرد اپنی ہی کمزوریوں کے ہاتھوں ان کے ہاتھوں خوار

ہوتے رہتے ہیں۔“ انور بھی جی کی آڑ میں اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

”تم نے بالکل ٹھیک کہا یہ ہم مردوں کی کمزوریاں ہیں جن سے کم ظرف خواتین فائدہ اٹھاتی ہیں۔“ راہی

نے کبل کھینچ کر سینے تک کر لیا۔ بے شمار یادیں دل میں پھاس بن کر چبھی ہوئی تھیں۔

”واٹ! دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارے ڈیڈ کا۔ میں اور بھی کسی کے لیے نہیں، فرجاد کے لیے ڈنر ٹیبل

لگاؤں گی! تمہیں باپ سے کہنا تھا، فرجاد ہمارا سرونٹ ہے بڑس پارٹنر نہیں۔ ہونہہ..... ڈنر تیار کرو ملازم کے

لیے۔“ اطلاع ملتے ہی روپکا ہتھے سے اکھڑ گئی۔ مجھ بڑی دل چسپی سے دونوں ماں بیٹی کی باتیں سن رہی تھی اور

خوش ہو رہی تھی کہ جو چاہ رہی تھی وہ اب ہو جائے گا۔

”پو آ راسٹ نام! مجھے بھی اس گدھے پر بہت غصہ آتا ہے۔ آئی وٹ کہ میں اسے اس کٹری سے نکال

دوں۔“ جی دانت پیں کر کہہ رہی تھی۔

”جی! دانت پیں کر کہہ رہی تھی۔“

”ایک لڑکی بھی اس کے خلاف سن جائے۔“

”ڈنٹ وری ماں! میں نے سوچ لیا ہے کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ مائیکل جینی اور جان سے کہہ کر ایسا

گرام اس پر چارج کروائیں گے کہ اسے یا تو بی جیل ہو جائے گی یا ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔ اینڈ آئی وٹ۔“

”جی! بی جیل ہو جائے گا یا ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔“

”کاش ایسا ہو جائے جتنے مجھے اس سے اتنی نفرت کیوں ہے۔“

”روپکا۔ ایسا تو نہ کہو اتنا اچھا لڑکا، بڑھا لکھا خور و، چاب سے نکال دو مگر اس کے ساتھ ایسا کچھ برامت

کرنا۔“ مجھ کو فرجاد سے سخت ہمدردی ہوئی تو روپکا نے اسے ملگلی نظروں سے گھورا۔

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

☆☆☆

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

”جی! بی جیل ہو رہی ہے تو لے جاؤ اپنے اسٹور پر رکھ لو، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”ہیں، ج! لکھ کر دے دو یہ بات، میں تو آج اور اسی وقت اسے لے جانا چاہوں گی۔“

”جی! وہ تصویر میں مگن تھا کہ لڑکے کا باپ آگیا وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوا مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
عبدالرحیم صاحب نے ہاتھ ملا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کیسے ہیں آپ سر؟“

”الحمد للہ! آپ سناؤ کہسے ہو۔ کون ہو اور اباجان سے کیوں ملنا تھا؟“

عبدالرحیم صاحب نے ایک ہی سانس میں مٹی سوال کر ڈالے تو غزین کچھ بوکھلا سا گیا۔ وہ تو زیر کے بارے میں ڈھیر ساری معلومات لے کر اس کو تلاش کرنا چاہتا تھا مگر انکل کا انداز، لہجہ و چہرے کی تختی نے ایک بات بھی کرنے کی جرات نہ دی۔

”مرد خوردار! مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔ بتائیں گے۔“

”جی سر وہ دراصل میں۔ میں زیر صاحب کا بھانجا ہوں مطلب وہ میرے ماموں ہیں۔“

”تو!“ عبدالرحیم صاحب نے انتہائی سخت لہجے میں تو کہا کہ مزید سوال کی ہمت اندر ہی دم توڑ گئی۔

”تو..... تو سر یہ کہ آپ ان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں کہ.....“

”مرد خوردار! وہ تمہارے ماموں ہیں معلومات تم مجھ سے لینے آئے ہو۔ کیا چاہ رہے ہو؟“

”سر! وہ..... وہ بات یہ ہے کہ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کے والد صاحب ماموں کے وہ دوست تھے جو

ماموں کے ہرراز سے واقف تھے۔“

”واٹ! تم سے یہ سب کس نے کہا۔“ عبدالرحیم یوں چونکے گویا چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔

”وہ سر! میری امی جی سے ماموں نے ایک بار بات کی تھی اور ذکر کیا تھا انکل اشرف اور اپنی دوستی کا۔“ وہ

آہستہ آہستہ اصل مدعا پر آنے کی ہمت پیدا کر رہا تھا۔

”میں نے نہیں بتایا تاں مجھے بہت ضروری کام ہے۔ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

”سر! ان کا تپا کہ وہ کہاں ہیں کس حال میں ہیں۔“

غزین کے منہ سے یہ جملہ نکلتا تھا کہ عبدالرحیم صاحب کے چہرے پر شدید تناؤ آگیا جھکے سے کہنے لگے۔

”اسٹینڈ اپ! وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

”جی سر کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟“ وہ سمجھ نہیں پایا اس جلال کا سبب۔

”تم جاسکتے ہو۔“ عبدالرحیم حکم دے کر خود بھی اندر کی طرف بڑھے۔

”سوری سر۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا کہ آپ خفا ہو جائیں۔ آپ کو کچھ معلوم ہے تو بتا دیجئے کیونکہ میری

والدہ اور میری نانی جان بہت دھمی ہیں ماموں کے لیے۔“ اس نے ہمت کر کے کہہ دیا تو وہ پلٹے اب کی بار

چہرے پر وہ سختی اور جلال نہیں تھا۔

”معذرت چاہتا ہوں نو جوان۔ امانت میں خیانت گناہ ہے، میں گناہ کر نہیں سکتا۔ تم اب جاسکتے ہو۔ اگر

زندگی میں ملاپ لکھا ہوا ہوگا تو زیر بھائی جہاں بھی ہوں گے آن ملیں گے تم لوگوں سے۔ اب تم جاسکتے ہو۔“

اور امید کرتا ہوں کہ تم دوبارہ اس سلسلے میں نہیں آؤ گے۔ اللہ نگہبان۔“

عجیب سا لہجہ تھا جتنی بھی تھی قطعیت بھی تھی حکم بھی تھا۔ درخواست بھی۔ غزین مردہ قدموں سے لوٹ آیا۔

طبیعت بہت مضطرب تھی آتے ہی اس نے لاؤنچ کارخ کیا جہاں نانا نانی کا تخت تھا منظرہ یکدم نے بیٹے کو دیکھا۔ وہ

نظریں چرا گیا۔

☆☆☆

کرن 206 فروری 2019

”اس بار بزنس ٹور پر چچا کی جگہ تم چلو گے میرے ساتھ بنکا ک۔“

آفس سے آتے ہی گویا سعد نے ہمد سے کہا جو اسے اسائنمنٹ کی فائل دیکھ رہا تھا۔

”سوری! یہ مجھ سے نہ ہو پائے گا۔“ ہمد برجستہ کہہ کر مصروف رہا۔

”کیوں نہیں ہو پائے گا؟ میں تمہاری ساری ذمہ داریاں نہیں نبھاسکتا۔ آفس سنبھالوں۔ ٹور پر جاؤں۔

بزنس لاؤں کیا کیا کروں۔“

”میں نے کہا تاں بھائی میں نہیں جاسکتا، میرے فائلنگ ایگزیکٹو ہیں اور مجھے بہت اسٹڈی کرنی ہے۔“

”اچھا تو پھر کون کرے گا.....! چچا جان کا تو بھی پی پی ہائی تو بھی داغ وہ میرا مطلب ہے۔ اب چچا سے

انتہا کا نہیں ہوتا۔ جتان کا کوئی نہیں۔“

سعد کو کوک دیا تو وہ چڑ گیا۔

”اس میں دل آزاری کی کیا بات ہے اباجان جو حقیقت ہے سو ہے۔“

”یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس کے بیٹے نہیں ہیں۔ وہ میرا مطلب ہے.....“

غالب بولتے بولتے رگ گئے جانتے تھے کہ جیسے ہی یہ حقیقت آشکار ہوگی۔ تو ایسا طوفان آئے گا کہ بہت کچھ

تباہ کر جائے گا۔ بہت کچھ بھالے جائے گا اور کم از کم ابھی وہ یہ رسک نہیں لے سکتے تھے۔ اسی وقت ساجد آگئے

ماحول پر مبرا ایسکی چھا گئی، ہر کوئی اپنی جگہ سنبھل گیا سعد چور بنا بیٹھا تھا۔

”آئیے چچا جان بیٹھے۔“ سعد کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا۔

”سعد وہ ایسا ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم پر کام کا بہت لوڈ ہے۔ اسی لیے میں

نے بنکا ک جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تم مجھے ڈیٹیل بتا دو۔“

”جی چچا جان!“ سعد کچھ کھسیا ہو کر بتانے لگا۔

☆☆☆

یہ کیا بات ہوئی آپا! آپ نے ہماری چاندی بیٹی کے ساتھ شادی سے انکار کیوں کیا؟ بہت دکھ ہوا ہے

مجھے۔“

رشتوں کو اگر خلوص دل سے ان کی حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے تو تلخ رشتوں کی تلخی بھی مٹھاس میں تبدیل

ہو جاتی ہے۔ منیبہ اور شمینہ نے اپنے درمیان رخ رشتے کو خلوص دل سے تسلیم کر لیا تھا۔ منیبہ کو فہد کی بات سن کر

بہت دکھ ہوا تھا۔

”انکار میرے بیٹے نے نہیں کیا منیبہ! تم لوگوں کی بیٹی نے انکار کیا ہے۔“

”آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں منیبہ! فہد تو میرا بچہ بچپن ہی سے زارا کی جان سے فدا ہے۔ یہ ہی ہے نیک چڑھی،

ہر عزیز، ہمدی لڑکی۔ باب چھٹی۔“ شمینہ دھمی ہو گئیں۔ کئی آنسو ساڑھی کے پلوں میں سمٹ گئے۔

”اچھا! تم زیادہ اثر نہ لو شمینہ! اللہ مالک ہے۔ فی الحال سارہ اور سعد کی شادی ہونے دو، ویسے ساجد کو فہد کی

یہ بات معلوم ہے۔“

”نہیں، ابھی انہیں کچھ نہیں معلوم۔ یہ بھی ٹینشن ہے ان کو پتا چلے گا تو وہ ہنگامہ الگ کریں گے۔“

”یہ بات تو ہے۔ ساجد تو قیامت برپا کر دیں گے۔“

”تم دونوں فکر نہ کرو، نہ تو فہد کا انکار دیتی ہے اور نہ ہی زارا کی ضد۔ وقتی طور پر میں سعد کو سمجھا دوں گی، وہ

اپنے باپ سے کہہ کر بات سنبھال لے گا۔ لیکن اب تم لوگ کچھ ایکٹو ہو جاؤ، کہانی کو ہمیں تک تو روکے نہیں رکھنا

کرن 207 فروری 2019

”جی جی، بھیا بھی نہیں گے اور بھیا کی لاڈلی بہنا حادیہ بھی ہے گی۔“
”تم خواہ خواہ میں شامل ہو جانی ہو دعوت کے بغیر۔“ سعدیہ نے اسے چڑایا تو وہ ہمایوں کے شانے سے لگ گئی۔
”دیکھ رہے ہیں ناں بھیا آپ دونوں! آپ کی لاڈلی بہن کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے۔ مجھے ایک تو آفر نہیں کی اوپر سے مانتے رہیں انکار کر دیا گیا۔“
”ارے میری گڑیا! فکر نہ کرو، ذرا کافی تو آنے دو۔ دیکھنا ہم وہ کافی نہ پی کر ان کو مزادیں گے۔ کیسا، ہا ہا ہا۔“
”اپنی اہمیت کو جتایا تو وہ روہانی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔“

<https://www.urdu-tubes.com/>

”بالکل ٹھیک..... اس طرح شادی تک تم لوگ گھر میں اچھی طرح متعارف ہو جاؤ گے۔“
”ارے آپ! داؤد تو آپ کے ہاں جانے کے لیے پاگل ہے۔ اس روز باپ سے خوف زدہ ہو گیا تھا، اس لیے نہیں گیا۔ پتا ہے تمہیں! زین اور داؤد رات کو بیٹھ کر لڑکیوں کی طرح سارہ اور سعدیہ کی شادی کی باتیں کر رہے تھے۔ مہندی پر شرارتوں کے پروگرام بناتے ہیں۔“
”ہاں تو ان شاء اللہ یہ سب سوچنا، کرنا ان کا حق بھی ہے۔“
”اچھا تو پھر خواتین اس ہفتے کو ہم سب ایک ساتھ ڈنر کر رہے ہیں۔“
”ان شاء اللہ۔“ منیبہ اور شمینہ ایک ساتھ بولیں تو تینوں ہنس پڑیں۔

☆☆☆

”جھینک بوبھیا! آپ لوگوں نے اتنا اچھا نوکر روایا، شاپنگ کروائی، جھینک یو سوچ۔“ سنگاپور سے واپسی پر حادیہ بہت خوش تھی۔ سرد سے لپٹی شکر یہ کہہ رہی تھی۔
”یو آر ویلم بیٹا! تم لوگ اپنے ہی خوش رہو، میں یہی چاہتا ہوں۔“ سرد نے سعدیہ اور حادیہ کو ایک ساتھ ساتھ لگا کر پیار کیا تو ہمایوں بھی شوقی سے آگے بڑھا۔
”میں بھی تو ہوں۔ جھینک بوبھیا.....“ وہ بھی سرد سے آ لپٹا۔ سعدیہ سمٹ کر الگ ہو گئی۔
”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔ چشم بدور کتنے اچھے لگ رہے ہو اس طرح خوش باش۔ اللہ تعالیٰ نظر بد سے بچائے۔ بیٹا! کھانا لگو آؤں؟“
”کیونکہ بوا، ان کے والدین کے وقتوں کی ماں جیسی ملازمہ تھی۔ کتنے ہی جذباتی لمحات میں بوانے اپنی گود میں ان چاروں کو سمیٹا تھا۔ آنسو پونچھے تھے، بوا کے آنے پر سب الگ ہو گئے۔“
”نہیں بوا! ابھی تو اچھی سی کافی پیئے کدول چاہ رہا ہے۔“
”میں ابھی بخوانی ہوں ہمایوں بیٹا۔“

”ارے نہیں بوا! جوڑا اپنی سعدیہ کے ہاتھوں کی کافی میں ہے، وہ خانسا ماں کے ہاتھ میں کہاں۔“
”ارے بیٹا! سعدیہ بیٹی جھینک گئی ہوگی میں.....“
”ارے جانے دیں بوا! کس بات پر جھینک گئی آپ کی سعدیہ بیٹا! پیدل آئی ہیں کیا، کیوں سعدیہ؟“ ہمایوں نے شوخ نظروں سے سعدیہ کو دیکھا تو وہ سوجان سے قربان ہو گئی۔
”جی جی، کیوں نہیں۔ ابھی بنا کر لائی۔ بھائی آپ بیٹیں گے؟“

”جی جی، بھیا بھی نہیں گے اور بھیا کی لاڈلی بہنا حادیہ بھی ہے گی۔“
”تم خواہ خواہ میں شامل ہو جانی ہو دعوت کے بغیر۔“ سعدیہ نے اسے چڑایا تو وہ ہمایوں کے شانے سے لگ گئی۔
”دیکھ رہے ہیں ناں بھیا آپ دونوں! آپ کی لاڈلی بہن کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے۔ مجھے ایک تو آفر نہیں کی اوپر سے مانتے رہیں انکار کر دیا گیا۔“
”ارے میری گڑیا! فکر نہ کرو، ذرا کافی تو آنے دو۔ دیکھنا ہم وہ کافی نہ پی کر ان کو مزادیں گے۔ کیسا، ہا ہا ہا۔“
”اپنی اہمیت کو جتایا تو وہ روہانی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔“

”جانے دیں بھیا! بھلائی بھی لولی سزا ہوئی۔“
”لولی! تمہیں اندازہ نہیں کسی کے لیے یہ کتنی بڑی سزا ہے۔ کیوں میڈم! ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔“ ہمایوں نے سرد کے سینے سے آؤٹ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سعدیہ کو معنی خیز شوخ نظروں سے دیکھا تو وہ اثبات میں پلکیں جھکا کر رہ گئی۔
”ٹھیک ہے۔ چڑیل اس طرح شطکیں بنا بنا کر ایسے لوگوں کی ہمدردی نہ سمیٹو، جن کی ناراضی برداشت سے باہر ہو۔“
”یہ بھائی ناں بات، تو جائے سعدیہ میڈم! ہم دونوں بہن بھائی کے لیے اچھی سی کافی بنا کر لایے۔“
”ہمایوں، سعدیہ کی بات سمجھ کر مزید شوخ ہو گیا۔“
”جی صاحب! ابھی لانی ہوں۔“ سعدیہ نے قدرے جھک کر اسی انداز میں کہا اور دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

”بوا! میں سعدیہ کو سب کچھ دوں گا جو اللہ نے مجھے عطا کر رکھا ہے۔ اپنے حصے کی جائداد بھی اس کے نام کر دوں گا۔ بس ایسا کوئی رشتہ ڈھونڈیں جو بغیر کسی لالچ کے سعدیہ کو عزت اور قدر کے ساتھ بیاہ لے۔ میں جلد از جلد سعدیہ کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری بہن کو بے شمار خوشیاں عطا فرمائے۔“
”آمین۔ آمین بیٹا! تم نے جس طرح اپنی بہنوں کو ماں اور باپ کا پیار دیا ہے ایسا بہت کم دیکھا ہے بوانے اپنی زندگی میں۔ کوشش تو میں کر رہی ہوں بیٹا مگر اب کیا بتاؤں لوگوں کی سوچ کتنی گھٹیا ہے۔ تصویر دیکھ کر، سعدیہ کا باؤں کا سن کر فوراً انکار کر دیں گے، جب میں اس کے ساتھ ملنے والی دولت جائیداد کا بتاؤں تو ہزاروں ڈیماڈ کر دیں گے۔ اب ایسا کوئی رشتہ مل جائے اللہ کرے کہ جس کو سعدیہ سے پیار ہو، اس کے پیچھے جائداد کے انبار سے نہیں۔“

”اچھا تو یہ کارروائیاں ہو رہی ہیں، ارے کلومیماں اپنی بہن کے برابر سونا رکھ کر بھی اس کی شادی کرنا چاہو گے تو کوئی مائی کالا اس ادھوری اور بد شکل لڑکی کو اپنی دہن نہیں بنائے گا۔ ہاں ہم ہیں ناں، اگر تم اپنے حصے کی جائداد بھی دینے کو تیار ہو تو ہم ہیں ناں۔“ ہمایوں میڑھیوں کے پتھوں بیچ کھڑا ہوا اور سرد کی باتیں سن چکا تھا اور سعدیہ تو اس کا وہ کارڈھی جس سے وہ سرد کے اس سارے بزنس ایمپائر کا مالک بن سکتا تھا اور سرد چلا تھا اپنا

بزنس ہی کسی اور کے نام کرنے۔ وہ ہنستا ہوا نیچے اتر ا۔

”ارے بوا! ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں، سب کی شادیاں کرادو، اک ہم پر نظر نہیں پڑتی۔ کیا میں اتنا برا ہوں۔“

ہمایوں جانتا تھا کہ وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ ہے اور اپنی قدر اور تعریف کروانے کا ہنر بھی جانتا تھا۔ اس بات پر سرد نے اسے گلے لگا لیا۔

”تم..... ارے تم تو شہزادے ہو، شہزادے۔ تمہارے لیے رشتوں کی کیا کمی ہے۔“
”اور نہیں تو کیا۔ ہمایوں میاں تم تو شہزادے ہو، تمہارے لیے تو ایک سے بڑھ ایک حسین لڑکی مل سکتی ہے شہزادی۔“

”ارے جانے دو بوا! میں سیدھا سادا عام سا نو جوان ہوں، نہ شہزادی کی طلب ہے۔ مجھے تو بس ایک شریف، سیدھی سادی لڑکی چاہیے اس کے لیے حسین ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ اگر ایسی کوئی لڑکی ہو تو مجھے بتانا۔“ اس بات کے دوران ہمایوں سرد کو دیکھتا رہا کہ شاید ایسی بات کے پس منظر میں سرد اس پر غور کرے مگر سرد اس کی بات پر ہنس پڑا۔

”اس کی باتوں میں مت آئیں بوا! مذاق کر رہا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی اس کی گرل فرینڈ ہے، جس سے چاہے شادی کر لے۔“

”ارے بیٹا جانتی ہوں، جانتی ہوں۔ بھلا اس کو رشتے کے لیے بوا کی ضرورت کیوں پڑنے لگی۔ ماشاء اللہ چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے بوا! یہ سچ ہے کہ حسین لڑکیوں کی کمی نہیں مگر میں ایسی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا جو شادی سے پہلے مردوں سے دوستی کرتی ہیں، ان کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں۔ مجھے تو ایسی لڑکی چاہیے کہ..... اچھا بوا! میں بعد میں آپ سے بات کروں گا۔ اے کے پاس، میں لکھتا ہوں۔“ ہمایوں دانستہ طور پر بات ادھوری چھوڑ کر باہر کی طرف بڑھا۔
”ارے ماشاء اللہ، کتنی اچھی سوچ ہے ہمایوں بیٹے کی۔“

”جی بوا! ہمایوں بہت اچھا انسان ہے۔ وہ لڑکی بڑی خوش نصیب ہوگی جو اس کی شریک حیات بنے گی۔ خیر آپ سحریہ کے لیے اچھا سار شہنشاہیہ جو میری بہن کی قدر کریں۔“ سرد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمایوں ابھی جو بات کر کے گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔
”اچھا بیٹا! بندہ تو کوشش ہی کر سکتا ہے، اللہ مالک ہے۔“ بوا اپنا بھاری بھر کم وجود سنبھالتی چلی گئیں۔

☆☆☆

”تم دونوں اول درجے کے پاگل ہو۔“ جب سے حنا کو پتا چلا تھا کہ فہد نے نکاح سے انکار کر دیا، وہ ہنسنے لگی تھی۔ زارا چپ بھی، فہد دل کا درد چھپائے ہنسے جا رہا تھا۔

”پاگل ہیں اسی لیے تو ہمیں دوست بنایا۔“ وہ زارا کو دیکھ کر ہنسا۔
”جو کم فہد! تم سے کم از کم مجھے اس حماقت کی امید نہیں تھی۔ کیوں انکار کیا تم نے نکاح سے۔ دل چاہ رہا ہے سر تو ڈروں تم دونوں کے۔“ پیچھے پیچھے حنا نے فہد کے سر پر فال ماری تو زارا بڑبڑاتی۔

”زندگی میں ایک ہی تو اس نے اچھا کام کیا ہے، تم اس پر بھی سرزنش کر کے اسے احساس ندامت یا پچھتاوے میں مبتلا نہ کرو، پلیز۔“

”سن لیا تم نے اپنی دوست کا بیان۔“ فہد نے زارا کو دیکھا۔
”سن لیا..... تم دونوں کے بیانات کو سن لیا۔ اب میری بات بھی سن لو بلکہ گرہ لگا کر رکھ لو۔ جب اس جذباتی

فیصلے کی سنگینی کا احساس ہوگا تو قسم سے سر پکڑ کر روؤ گے۔ خصوصاً زارا تم۔“
”ارے لڑکی تم سر پکڑ کر رونے کی بات کرتی ہو، یہ مختصر مدد مل تھام کر رو دیا کریں گی۔ محبت کے حصار پر انھوں کے دیے جلایا کریں گی۔“

”شٹ اپ۔ سب کی اپنی اپنی زندگی ہے، سب کو اپنی سوچ اور اپنے اعزاز میں جیسے کا حق ہے اور حاتم بھی ناں۔“ زارا نے بیک وقت دونوں کو گھورا۔

”میں فہد کی بات سے متفق ہوں، تم جو چاہو سمجھو۔ ہونہر احمق لڑکی لوگ ایسے رشتے دعائیں مانگتے ہیں اور یہ.....“ زارا کو گھورتے ہوئے، حاتم نے اس کی بات سے بڑبڑا رہی تھی، جو باہر دیکھ رہی تھی کہ اس کی نظریں سرد پر

<https://www.urdu-tubes.com/>

”شہزادہ! میں سرد صاحب بھی نظر آئے۔“
اس کا کہنا تھا کہ فہد کے باؤں کا دباؤ بریک پر پڑا، گاڑی جھٹکے سے رکی۔
”سنو.....“ زارا اترنے لگی تو سیٹ پر گر گئے اس کے ہاتھ پر فہد نے ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

”میرا رقیب میرے اسٹینڈرڈ کا ہونا چاہیے، یہ کوئی انہیں۔“
”تم..... تم.....“ اور فہد اس کے کہہ کوئی جواب دیتی وہ فل اسپید میں گاڑی بڑھا گیا۔

”السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ لوگ؟“ سرد خاصا فریٹش موڈ میں تھا۔
”بالکل ٹھیک، الحمد للہ۔ تم سادہ کیسا رہا سنگاپور کا ٹور؟“

”ہاں، الحمد للہ بہت زبردست میں تو وہاں پر سیر سے زیادہ اپنے ملک کا موازنہ کرتا رہا کہ وہاں پر مسائل سے زیادہ وسائل ہیں۔ خوش حال معاشرہ، سچ میں دل خوش ہو گیا اور زارا آپ چپ چپ ہیں، سب خیریت تو ہے ناں۔“ بات کرتے ہوئے سرد کی نظریں زارا کے متعلق چہرے سے ہٹ کر ہاتھوں پر گئیں، انھیں کے اظہار سے لگ رہا تھا وہ بے چین ہے۔

”نہیں تو، میں بالکل ٹھیک ہوں..... تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا کہ آ جاؤ تو شادی سے پہلے اسائنمنٹ بنا لے جائیں۔“

”شہزادہ! شادی.....“ سرد کی دھڑکنیں رکنے لگیں، ہر چند کہ زارا کے بارے میں وہ خود کو صرف سوچ کی حد تک ہی رکھنا چاہتا تھا خود کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے ساتھ شادی کا سوچے مگر پھر بھی شادی کا سن کر ایک بار تو دل میں بھی آ گیا۔

”ہاں میری بڑی بہن سارہ کی شادی ہے، اس لیے میں یہ پروجیکٹ پہلے ہی کر لینا چاہتی ہوں۔“ زارا اس کے دل میں اترتے سکون سے بے خبر ہو لے گئی۔

”اوہ، اچھا اچھا۔ بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔“ سرد کے دل پر چھائی دھند ایک دم چھٹ گئی۔
”کاش تم بھی جی پیٹا سکتیں کہ میرا بھی نکاح تھا جس سے میں نے انکار کر دیا ہے۔“ حنا نے غصے سے زارا کو گھورا جو سرد کے ساتھ باتیں کرتی لائبریری کی طرف جا رہی تھی، حنا غصے میں پیچھے رہ گئی۔

”اچھا تو ہمارے اسائنمنٹ کا ٹاپک ہے، تیزاب اور حیزاب کا شمار خواتین۔“ لائبریری میں اپنے مخصوص کونے میں بیٹھتے ہوئے زارا نے گویا سرد کو بتایا۔

”گڈ، بہت اچھا ٹاپک ہے۔ نہیں اس پر بہت ریسرچ اور کام چاہیے۔“
”ہوں، بالکل میں تو مستقبل میں اس ٹاپک پر کتاب بھی لکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں یعنی کہ ظلم اور بربریت کی حد ہے۔ مرد اپنی خواہش پوری نہ ہونے یا کرنے پر عورت کا چہرہ مسخ کر دیتا ہے۔ آئے دن سننے پڑنے میں آ رہا

ہوتا ہے، فلاں مرد نے شادی سے انکار پر لڑکی کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا۔ ساری زندگی عورت کی برباد کر ڈالی، میں تو ان شاء اللہ اس پر بہت کام کروں گی۔“

”اور اس میں آپ مجھے اپنے ساتھ کھڑا نہیں گی زارا۔“

زارا کے خیالات اس کی سوچ اسی طرح خوب صورت تھی، سرمد تاثر لہجے میں بولا۔

”اف تو یہ ہے، کچھ اگر تم دونوں کچھ دیر اور میرے اور سچ کے درمیان آئے تو میں تم دونوں پر تیزاب ڈال دوں گی۔ حد ہو گئی ہے مسلسل دو گھنٹوں سے تم لوگ ایک ٹاپک پر بات کر رہے ہو۔“ حتیٰ کی بات پر سرمد ہنسنے لگا، زارا اسے گھورنے لگی۔

”تم تو یہی بے حس، خود غرض نہ ہو تو۔ یعنی کہ کام سارا ہم کرتے ہیں تم مفت میں رہا س ہو جاتی ہو۔ بس باتیں بکھارنی آتی ہیں۔“

”ارے زارا آپ اور حنا جا کر کچھ کھا پی لیں۔ اتنے میں، میں گزشتہ سال ہونے والے تیزاب کے واقعات والے اخبار نکالتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے سرمد تم کچھ کھاؤ تو لے آؤں۔“

زارا بیک لٹا کر اس کی پلٹ کر سرمد کو دیکھا جس کی خواہش تھی کہ زارا کہے کہ تم بھی ساتھ چلو تو وہ فوراً اٹھ جاتا۔

”نن..... نہیں زارا! شکر یہ آپ لوگ جاؤ۔“

”اب سرمد! اگر تم نے مجھے یا اسے آپ کہہ کر وادی نانی بنایا تا تو یہ پیسہ ویٹ مار کر تمہارا انفلاطونی دماغ نکال کر اس کی بجایا بنا کر اس میڈم ستراط و بقراط کو کھلا دوں گی۔ کتنی بار منع کیا مگر تمہیں تو چوچا بننے کا زیادہ شوق ہے۔“ حتیٰ کی باتوں پر سرمد اور زارا ہنسنے لگے۔

”سچ حنا میں دانستہ نہیں کہتا، بس عادت سی ہے۔ ہر عورت بہت معزز اور محترم لگتی ہے مجھے۔ میں تو اپنی چھوٹی کو بھی بشکل ہی تم کہتا ہوں۔ خیر آئندہ کیسے کرنی پڑے گی کیا کریں، سرمد بھی تو عزیز ہے۔“

”تو چلو پھر ہمارے ساتھ اچھا سا سچ کر دو اپنی جیب خاص سے۔“

”او کے میڈم اچیلے..... مطلب چلو۔“

تینوں مسکراتے ہوئے لائبریری سے نکلے، اسی وقت ارمغان کا فون آ گیا۔

”کہاں ہو یا سرمد۔“

”ہاں ارمغان! تم ایسا کرو، ہم کیفے ٹیریا کی طرف جا رہے ہیں، تم بھی آ جاؤ۔“

”او کے، اللہ حافظ۔“

اگلے آدھ گھنٹے میں یہ لوگ کیفے میں بیٹھے تھے۔

”اب کیا یہاں بیٹھ کر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتی ہیں کہ کچھ منگوانا ہے۔“ حنا چڑ گئی، تو سرمد ہنسنے لگا۔

”لگتا ہے حنا تمہیں بہت بھوک لگی ہے۔“

”بہت نہیں، بہت زیادہ لگی ہے، یہاں آؤ بیچے آؤ رولز۔“

حنانے اشارے سے ویٹر بیچے کو بلایا، وہ فوراً بھاگا آیا۔

”جی باجی۔“ وہ ہاتھ میں چھوٹی سی ڈائری لیے پوچھ رہا تھا۔

”میرے لیے تو بیچے پاکستانی، چائینز راس لے آؤ۔“

”میرے لیے صرف سلاد۔“ زارا کا کچھ کھانے کا موڈ نہیں تھا۔

”ایکسیکو زئی، شادی سارہ آپا کی ہو رہی ہے، تمہاری نہیں تو ڈاسٹ کیوں؟“ حنانے چڑ کر زارا کو دیکھا۔



زارا سرمد کو دیکھ کر اسے گھورنے لگی۔

”میری مرضی ہے، کچھ نہیں جو کھانا ہے کھاؤ۔“

”بھئی حنا! زارا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، اپنی اپنی مرضی ہے۔ کم از کم کھانے میں تو انسان کو اپنی مرضی کرنی چاہیے۔“

”چپ کر دیجئے! اور بیچے یہاں کھڑے ہو، جاؤ لے کر آؤ۔“

”رگو، بیچے میرا آرڈر بھیج لے لو۔“ ارمغان کی آواز پر سب نے پلٹ کر دیکھا، سرمد خوش ہو کر اس کے گلے لگ گیا۔

واہ! خوب فیشن لگ رہے ہو، نگار پور کا اچھا اثر ہوا ہے۔

یہ نگار پور کا نہیں بلکہ اپنی ہی ہے۔ وہ..... وہ میرا مطلب ہے واقعی میں بھی بہت اچھا فیشن کر رہا ہوں۔ خیر

”او، کیا کھاؤ گے۔“

سرمد نے اسے ساتھ والی کرسی اس کو پیش کی۔ زارا نے اس واقعے کے بعد اسے دیکھا تھا، ہنس مکھ سایہ تو جوان کیوں اپنا اچھا لگتا تھا جس نے بے ساختہ اسے بہن کہہ کر اس کی مدد کی تھی۔

”چلو، تم بتاؤ کیا لو گے ارمغان۔“ سرمد اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”صرف سلاد۔“

”ہوں، صرف سلاد کیوں؟“ سرمد نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ارے بھئی اس کی مرضی۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہ ہی کہا تھا تاں تم نے۔“ حنانے برجستہ کہا تو سرمد ہنس پڑا۔

”ان کا کھانا اختتام کو پہنچا کر فہد کی کال آ گئی۔“

”آج ہم لیٹ ہو جائیں گے، تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔“ سرمد اور حنا لہجے میں زارا نے کہا تو فہد کا دل چاہا

موبائل ہونک پر دے مارے۔

”کہاں شریف فرما ہو؟“

”کیفے ٹیریا میں بیچ کر رہے ہیں۔“

جواہر موبائل آف ہو گیا۔ اگلے ہی پانچ منٹ میں فہد وہاں موجود تھا۔ سرمد اور ارمغان سے رکی ہاتھ ملا کر

زارا کو گھورنے لگا۔

”آپ کچھ لیں گے فہد۔“ سرمد اخلاق سے پوچھ رہا تھا۔

”جی نہیں، شکریہ۔ وہ دراصل گھر پر کام ہے تو نہیں جلدی جاتا ہے، چلیں زارا۔“ سخت لہجے میں زارا سے مخاطب ہوا۔

”کہاں فہد مجھے ابھی کام ہے، کچھ دیر ہو جائے گی، تم چلے جاؤ۔“

”ابھی چلو، میں دوبارہ لینے نہیں آ سکتا، بہت کام ہے گھر پر۔“

”آپ اپنا کام کریں، میں چھوڑ دوں گا زارا کو۔“

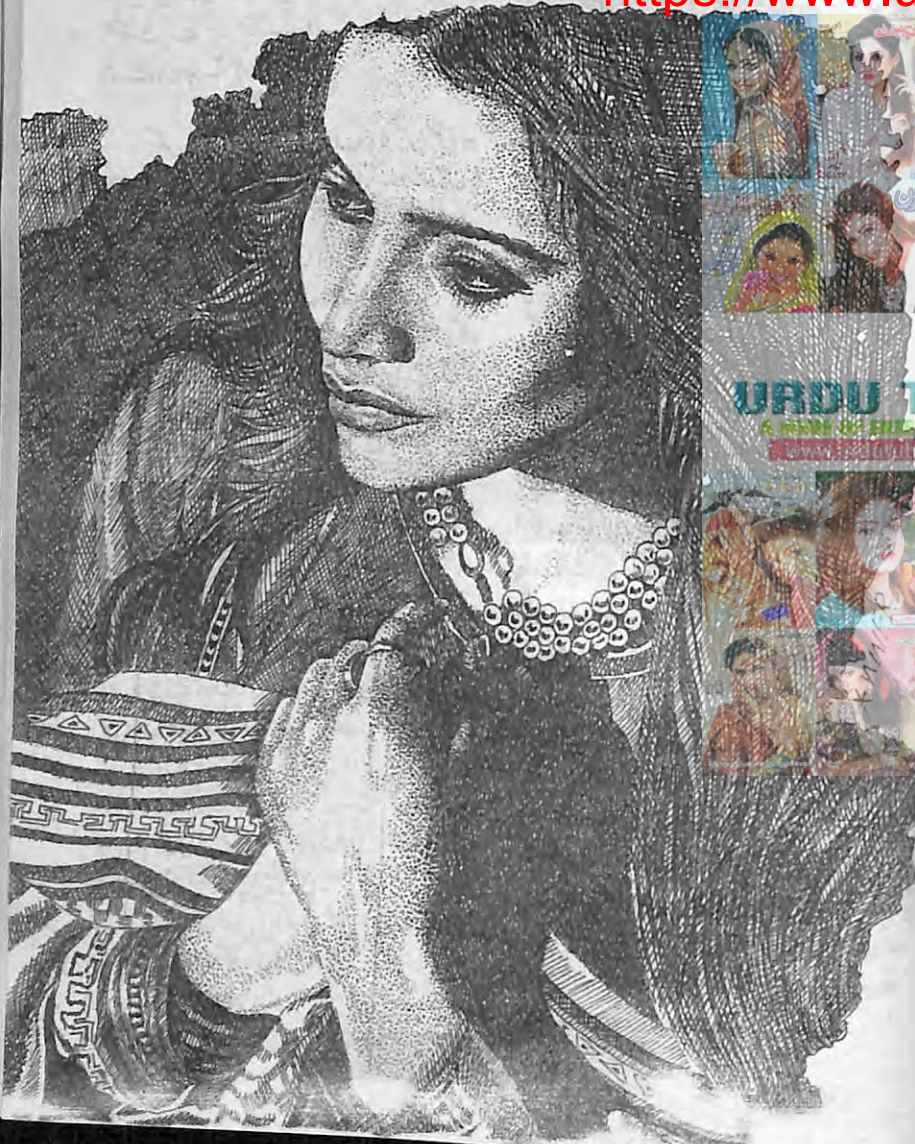
جانے کس جذبے کے تحت ارمغان کے اندر کا بھائی بول اٹھا تو سرمد تو حیران ہوا ہی تھا۔ زارا حنا بھی اسے دیکھنے لگیں۔ فہد کا پارہ ہائی ہو گیا۔

”کیوں؟ چھوڑ دیں گے آپ کس حیثیت سے؟“

”بھائی کی حیثیت سے۔ وہ میرا مطلب ہے زارا میری بہن جیسی ہے۔“

”بہن..... بہن جیسی ہے ناں۔ بہن تو نہیں ہے نا۔“ فہد نے منٹھیاں جھنجھکیں۔

”بہن ہے فہد صاحب!“ ارمغان بھی تن کر کھڑا ہو گیا، کسی بھی ممکنہ جھگڑے نے حنا اور زارا کو پریشان



کر دیا۔ سرمد نے فہد اور ارمغان کو دور کیا۔
”چلو حنا!“ زارا رو دینے کو گئی۔ حنا بھی اٹھ کھڑی ہوئی، سرمد اور ارمغان کو گھورتا فہد بھی ان کے پیچھے چلا گیا۔

”یہ سب کیا ہے ارمغان؟“ سب کے جانے کے بعد سرمد نے ارمغان سے پوچھا۔

”ہم اس موضوع پر پھر بھی بات کریں گے۔“

ارمغان کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ سرمد خاموش ہو گیا اور پھر زارا اسرار استہائے آنسو پیتی رہی اور وہ جو دکھ ہوا تھا کہ فہد نے نکاح سے انکار کر دیا ہے۔ اب وہ اس کے اس فیصلے پر مطمئن ہو گئی تھی۔

”فہد! تمہیں ایسا ہی ایک نہیں کرنا چاہیے تھا، اس نے زارا کو بہن ہی کہا تھا ناں کچھ اور تو نہیں۔“ حنا نے فہد کی کلاں لے ڈالی۔

”کیوں؟ کیوں کوئی کسی بھی قسم کا تعلق جوڑے زارا سے کہ جب وہ بھائی ہے نہیں، تو شخص لڑکی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بہن بھائی کا یہ ڈھونگ مجھے ہرگز پسند نہیں۔“

”تھینک یو سوچ فہد! تم نے میرے اس ملال کو خود ہی ختم کر دیا۔“ زارا کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ وہ حنا کو دیکھ بغیر اندر چلی گئی، حنا بھی اپنی گھبراہٹ سے فہد شیدہ بنی تباؤ کا شکار تھا، اس نے زور سے اپنا سر دروازے سے مارا۔

”زارا.....“ وہ زور سے چیخا۔

☆☆☆

”میں تو کہتی ہوں انور، موقع اچھا ہے۔ روبیکا اور ٹی، فرجاد کے بہت خلاف ہیں۔ روبیکا نے تو پلان بنا رکھا ہے کہ ایسا کچھ کر کے اسے ڈی پورٹ کر دیا جائے تو اس سے پہلے کیوں نہ ہم فرجاد کو اپنی سرپرستی میں لے لیں۔“ نجمہ تو اس دن سے اڑی پھر رہی تھی فرجاد جیسا داماد مل جاتا تو باقی دو بھی اسی کی جیلی سے مل سکتے تھے۔

”دیکھو نجمہ! میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر راہی فرجاد کو بہت پسند کرتا ہے۔ اس پر انحصار کرتا ہے اور میں اس کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ وہ کیا سوچے گا کہ میں خود غرض ہو گیا ہوں۔“

انور راہی سے فرجادی بات کرنے سے کتر ہا تھا۔

”اوہ تم تو ہمیشہ لحاظ میں ہی مارے جانا۔ میں خود روبیکا کے ساتھ بات کر لوں گی، ارے مجھے اتنے اچھے لڑکے کو ڈی پورٹ کرنے سے بہتر ہے، ہم اسے اپنے ہاں کام دے دیں۔“

نجمہ، ماریہ کے دل کا حال جان چکی تھی، اس لیے وہ فرجاد کو کسی صورت ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں اس قصے میں راہی کی وجہ سے انوا لو نہیں ہوتا۔ تم اور بھابھی مل کر کوئی سلسلہ بنا لو۔ اس سلسلے میں تمہیں میری حمایت حاصل ہے۔“ انور نے دل کھول کر اجازت دی تو نجمہ خوش ہو گئی۔

”ہاں، ہیلو روبیکا۔“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سانحہ ارتحال

ہماری مصنفہ فصحی آصف خان کے بہنوئی اظہر محمود قضاے الہی سے وفات پا گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ہم دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

زندگی کے ہزاروں رنگ ہیں اور ہر رنگ کو حقیقت پسندی سے قبول کرنے میں ہی عافیت ہے۔ اکثر لوگ کیوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خطرہ مل گیا یا وقت بدل جائے گا مگر یہی سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے، جب تک آنکھیں کھلتی ہیں تب تک ہر منظر بدل چکا ہوتا ہے، آنکھیں اس منظر سے آشنا نہیں ہوتیں اور پھر آب اندھوں کی طرح ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔ فیصلے کی گھڑی میں حقیقت سے منہ موڑنے والے ہمیشہ کے لیے اندھے بن جاتے ہیں۔

☆☆☆

کمرے میں ٹہل ٹہل کر اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں مگر کوئی حل اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اپنی انجینئرس سے بیان کرے کیونکہ نظار کوئی خاص بات نہیں تھی اگر کسی سے کہتی بھی تو شاید اس کی کم عمری یا نادانی کو ہی دوش دیا جاتا۔

ہمیشہ سے سنی آئی تھی کہ سرال کسی امتحان گاہ سے کم نہیں، آپ سو میں سے سو نمبر لینے والی تیاری کر کے بھی کمرہ امتحان میں آؤ تو بھی پاس نہیں ہو سکو گے، سرال وہ جگہ ہے جہاں اونٹ کو سوئی کے سوراخ میں سے گزارا جاتا ہے۔

بھابھی کہتی تھیں خاوند سرہانے کا سانپ ہوتا ہے جو کسی وقت بھی ڈس لیتا ہے، خاوند پہ اندھا اعتماد اس کے ڈنک کو اور زہریلا بنا دیتا ہے۔

وہ سرال سے متعلق کہاوتیں سچ ہوتی دیکھ چکی تھی اور اب چاہتے ہوئے بھی شہر یار سے بات نہیں کر رہی تھی کیونکہ وہ خاوند کا بدلتا روپ دیکھنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ ہر روز بات کرنے کا قصد کرتی اور ہر روز ارادہ ٹٹی کا ڈھیر ثابت ہوتا۔ زندگی عجیب کشش میں پھنس چکی تھی، کوئی راہ بھائی دے رہی تھی اور نہ کوئی راستہ نظر آ رہا تھا۔ وہ تھک ہار کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

سنیائیں بھائیوں کی اکلونی بہن تھی۔ ماں بچپن میں وفات پا گئی تو گھر کی ذمہ داری عظیم صاحب پہ آن پڑی، تنہا اولاد کی پرورش نہایت مشکل تھی۔

سارے خاندان نے مل کر دوسری شادی پہ زور ڈالا، سارے حالات سمجھتے ہوئے بھی وہ دوسری شادی پہ آمادہ نہ ہوئے تھے۔ وہ معصوم بچوں پہ سوتیلارشتہ نہیں تھوپنا چاہتے تھے، کسی نہ کسی طرح دو سال نکالے اور بڑے بیٹے کے انٹر کرتے ہی تیجی سے شادی کروا دی۔ ان کا فیصلہ سب کو درطرح حیرت میں ڈال گیا مگر

وقت نے ثابت کیا کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔ مریم نہایت سلیجہ اخلاق کی ماں تھی اور سنیائیں بھی ان میں عورت کی کی کو پورا کر دیا۔ عظیم صاحب کا خیال رکھنا، دیوروں کی ضروریات پوری کرنا مگر جس بات نے ان سب کو مطمئن کیا تھا وہ سنیائیں کے متعلق اس کا رویہ تھا اور یہ رویہ ہمیشہ قائم رہا تھا۔ عظیم صاحب کی وفات کے بعد بھی وہ سنیائیں کی پرچھائیں بنی رہی اور دیورائیوں کی آمد کے بعد بھی اس کی حیثیت مسلم رہی تھی۔

وقت کا کام گزرتا ہے اور وہ گزرتا چلا گیا، وہ کالج میں پہنچ گئی، بھائیوں کے بچے اسکول جانے لگے مگر جو درخت عظیم صاحب لگا گئے تھے اس کی گھٹی چھاؤں اتنے سال گزرنے کے بعد بھی قائم تھی۔ اس کی شادی کا وقت آیا تو مریم نے وہ کچھ کیا کہ دیکھنے والے دم بخود رہ گئے، وہ بھابھی کم اور ماں زیادہ گئی تھی۔ رشتہ مہم شروع ہوئی تو بہتر سے بہتر تین کا انتخاب کیا گیا۔ مریم نے سنیائیں کو صرف چار نہیں دیا تھا بلکہ تربیت بھی کی تھی، ہر وہ سبق جو ماں اپنی بیٹی کو دیتی ہے وہ اس نے ایسے پڑھا تھا۔ سرال رخصت کرتے ہوئے وہ یوں روئی تھی جیسے جگر کا ٹکڑا نکال دیا ہو۔

☆☆☆

بیار اور لاڈ میں پلی سنیائیں سرال میں گھر رہی تھی۔ مریم کی لاڈی ہر ہنر میں طاق تھی مگر سرال کے اسباق نہیں پڑھ پارہی تھی۔ جب بھی شہر یار سے بات کرنے کا سوچتی تب ہی نئے دوسرے دل میں ذریہ ڈال لیتے تھے۔ اتنے دن کی سوچ بچار سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا اور اب اس کا صرف ایک ہی حل تھا اور وہ مریم کی گودھی۔ ایسے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے وہ عشا کے بعد ساس کے کمرے میں چلی آئی۔

”آؤ بیٹی! وہاں کیوں کھڑی ہو؟“ اسے دروازے کے پاس کھڑے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھیں اور بیڈ پہ اپنے ساتھ اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنانے لگیں۔ ”جی امی دراصل مجھے آپ سے اک بات کرنی تھی۔“ شہر یار کے بے حد اصرار پہ اس نے ساس کو اسی کہنا شروع کر دیا اور ان کا رد عمل اسے بھی مطمئن کر گیا تھا۔

”تو بتاتی تھی کہ باندھنے کی ضرورت ہے،“ اس نے گھر ہو کر بات کر دی۔ سردی کے باعث اس کے اوپر بھی کپل اور حادیا، ان کے خیال پہ وہ بے ساختہ مسکرائی۔

”امی کافی دن ہو گئے میں گھر رہنے نہیں گئی،“ مریم کی بہت یاد آ رہی ہے۔ کیا میں کچھ دن رہنے چلی گئی؟ اس نے پوچھا ہے۔ ”اس نے بچی کے ہونے بات مکمل کی تھی۔“ ”ارے بیٹی اس میں بھلا پوچھنے والی کیا بات ہے، تم شہر یار سے کہتیں وہ چھوڑ آتا۔“ اس کا یوں اجازت ماننا انہیں نہال کر گیا۔

”نہیں امی! مریم کہتی ہیں بڑوں سے اجازت لیتے ہیں۔“ انہوں نے کہے۔ ”اس نے مریم کے کہے

”ماشاء اللہ۔ اللہ ایسی بہو سب کو دے، یقین کرو شہر یار لاکھ سو فی صورت تھی مگر مجھے تو مریم کی صلاحیتوں نے باندھ لیا اور اسی لیے میں نے تمہارے میکے کا در پکڑ لیا کہ جس کے زیر سایہ تمہاری تربیت ہوئی اس کی فہم و فراست کا تو سارا زمانہ قائل ہے۔“ وہ بھی مریم کی تعریفیں شروع کر چکی تھیں اور سنیائیں کا چہرہ ہمیشہ کی طرح مکمل اٹھا۔ ”پر بیٹی مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ تم مریم کا نام کیوں لیتی ہو؟ وہ تم سے کئی سال بڑی ہے، ماں کی ہر کی طرح انہوں نے بھی وہی سوال کیا۔

”امی مجھے شروع سے مریم کہنے کی عادت ہے۔ میں خود نہیں سمجھ پاتی کہ میں کیوں ایسا کرتی ہوں حالانکہ باتوں کو بھابھی ہی کہتی ہوں اور پھر مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ میری ماں،

بھابھی، دوست اور دنیا کا ہر رشتہ ان کے وجود سے منسوب ہے، میں ان کو ہر رشتے کے حوالے سے مخاطب نہیں کر سکتی اس لیے میں صرف مریم کہتی ہوں۔“ اس نے تفصیل سے ساس کو جواب دیا اور شہر یار سے بات کرنے کے لیے کمرے میں واپس آ گئی۔

☆☆☆

”انف..... شہر یار اتنا پھیلاوا کیوں پھیلا یا ہوا ہے؟ پتا نہیں آپ کے وہ طور طریقے کدھر گئے جس کی دھوم پہلے دن سے ہر بندے کے منہ سے سن رہی ہوں۔“ اس نے کوفت بھری نظروں سے شہر یار کو دیکھا۔ شہر یار الماری میں سر دیے کھڑا تھا اور کپڑوں کا ڈھیر بیڈ پر کھڑا تھا۔

”مرد جتنا بھی کھڑے ہو بیوی ملنے کے بعد بگڑ جاتا ہے اس لیے تم میرے طور طریقوں کی کہانیاں بھول جاؤ، مجھے اچھا لگتا جب تم میری پھیلائی ہوئی چیزیں سمیٹتی ہو۔“ شہر یار شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تو اپنے اس شوق سے پرہیز کریں ورنہ میرے بعد آپ کو بھی مشکل ہوگی۔“ اس کی مطلوبہ شرٹ نکال کر باقی کپڑے دوبارہ تہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”کیا مطلب تمہارے بعد؟ تم کدھر جا رہی ہو؟“ اس کی بات سے وہ چونکا تھا۔

”یہ ہی بتانے آرہی تھی مگر آپ کا پھیلاوا دیکھ کر بھول گئی، میں اداس ہو رہی تھی تو سوچا گھر آئی ہوں۔ ابھی امی سے اجازت لے کر آ رہی ہوں اور اب آپ صبح جاتے ہوئے مجھے گھر چھوڑتے جائے گا۔“ باتوں کے دوران سارے کپڑے سٹ گئے تھے اور کھلتے چہرے کے ساتھ شہر یار کو صبح کا پلان بتانے لگی۔

”تمہاری شادی مجھ سے ہوئی ہے یا امی سے؟“ اس نے اچانک سنیائیں سے سوال کیا۔

”کیا مطلب؟“ اس کے سوال پہ وہ مدھم سا مسکرا دی۔

”میں مذاق نہیں کر رہا، تم میری بیوی ہو مجھ سے اجازت لینی چاہیے مگر یہاں الٹا ہی حساب ہے۔ ساری

<https://www.urdu-tubes.com/>

منصوبہ بندی ہو چکی ہے اور مجھے اب صرف اطلاع دی جا رہی ہے، ہمیں مجھے آگاہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں اُمی کو یہ کہنا چھوڑ آئیں گی۔“ وہ غصے سے بولتا واش روم میں گھس گیا اور وہ جراتی سے منہ دیکھتی رہ گئی۔

اس گھر میں سب کچھ ہی عجیب تھا۔ اس نے ہمیشہ دیکھا تھا کہ جب بھی مریم نہیں جاتی ابو سے اجازت لیتی اور بھائی بلا چوں جڑاں حکم بجالاتے اور ابو کے بعد چھوٹی بھابھیاں مریم کو بتاتیں اور کس کی جرات کرنا کرے۔ مریم نے ہمیشہ بڑوں کی عزت کرنا سکھایا اور وہ عزت اس نے شہر یار کی ماں کو دی تھی مگر یہ کوشش اس کے گلے پڑ رہی تھی۔ وہ جب بھی ساس سے کچھ کہتی تو اس کا رویہ یوں ہی ہوتا پر اب تو وہ محل کے بول گیا تھا۔ اس صورت حال میں اس کا جانا فطری مناسب نہیں تھا، ساری خوشی خاک ہو گئی تھی۔

وہ سونے سے پہلے ہی دفعہ شہر یار سے بات کرنے کی کوشش کر چکی تھی مگر ناراضی ہنوز قائم تھی۔ صبح بھی اس کا رویہ دیا ہی رہا، ناشتے کی میز پر ساس نے جانے کی بابت پوچھا تو وہ اپنی جگہ چوری بن گئی۔

”امی میں پھر کبھی چلی جاؤں گی۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ چپن میں چلی آئی۔ اس کی غیر موجودگی میں جانے ماں بیٹے میں کیا بات ہوئی کہ جب وہ چائے لے کر باہر نکلی تو خاموشی زیادہ بڑھ چکی تھی۔

”بہنی تیار ہو جاؤ شہر یار چھوڑ آتا ہے اور خبردار اب تم نے سننا کو کچھ کہا۔“ شہر یار نے سر ہلادیا تو نہ چاہتے ہوئے وہ تیار ہونے چل دی۔ آدھے گھنٹے کا سفر خاموشی سے کٹا، اس کے اترنے کے بعد بنا اک لفظ کے وہ گاڑی بھگا لے گیا۔ اس کا دل کٹ کے رہ گیا، آنکھوں کی می خشک کرتے ہوئے وہ عظیم ہاؤس میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

اسے دیکھ کر سب بچے خوش ہو گئے، وہ بھی کافی عرصے بعد آئی تھی تو بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھ گئی اور وہ سارے کھیل کھیلنے شروع کر دیے جو شادی سے پہلے اس کا معمول تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ اتنی مگن رہی

کہ دوپہر سے رات ہونے کا پتا ہی نہیں چلا اور بچوں کے سونے کا وقت ہو گیا۔

”سننا رہو گی یا شہر یار لینے آئے گا۔“ بچہ پارٹی جا چکی تھی اور اب سب بڑے اکٹھے بیٹھے تھے۔ خشک میوہ جات کی ٹرے باری باری سب کے پاس جا رہی تھی، وہ کاؤچ پر بیٹھ کے سانسے بیٹھی تھی جب بھائی جان نے شہر یار کے متعلق پوچھا۔

”بھائی جان آج تمہارے پاس آنا کا کوئی وعدہ کچھ مصروف تھے، میں تو یہ بات کر کے مریم کو بلوایا۔“ وہ کئی دفعہ شہر یار کو کال کر چکی تھی مگر کال نہیں اٹھائی تھی اور اب تو نمبر ہی بند جا رہا تھا۔ بھائی جان سے بہانہ کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

”چلو تمہارا اپنا گھر ہے جب تک جی کرے رہو۔“ فی وی سے نظر ہٹا کر چھوٹے بھائی نے کہا۔

ایک ایک کر کے سب اٹھتے گئے اور لاؤنج میں وہ اکیلی اپنی سوچوں کے ساتھ بیٹھی رہ گئی۔ کئی لمحوں بعد اس نے دوبارہ موبائل پکڑا اور شہر یار کو کال کی مگر دوسری طرف صرف تیل کی کرخت آواز سنائی دے رہی تھی مطلوبہ آواز کا دور، دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے وقت دیکھا تو بارہ کا ہندسہ موبائل اسکرین پر روشن تھا، اس وقت تک شہر یار سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے اور یہ ہی تسلی اس نے خود کو دی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر مگن تھی کہ مریم کے آنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔

”نیتا تمہیں باتیں چھپانے کی عادت کب سے پڑ گئی؟“ مریم اکثر اسے نیتا کہتی تھی۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ لہجہ کو مستدل کرتے ہوئے اس نے ان کی طرف چہرہ کر لیا۔

”بہانا بنانا ہر وقت سو مند نہیں ہوتا۔“ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، شندے ہاتھ

پہ اس کا ہر جدت لکس بہت بھلا محسوس ہوا۔

”مریم! الجھنیں بہت ہیں مگر بتانے کی کوشش کرو تو ہر الجھن بے نام ہو جاتی ہے۔“ وہ اب بھی کشمکش میں تھی۔

”ہر الجھن بے نام ہی ہوتی ہے مگر جب سلجھتی ہے تو اسے کوئی نہ کوئی نام مل جاتا ہے۔ تم بات کا آغاز کرو انجام خود ہو جائے گا۔“ اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ دبا کر تسلی دی تھی۔

”مریم زندگی کے نئے سفر پر ہر لمحہ آپ کی ہدایات میرے ساتھ رہیں، میں نے آپ کی ہر بات پر عمل کیا۔ مگر کچھ امتحان میں پاس نہیں کر سکی، اب یہ سب کچھ دوبارہ کرنا ہے۔“

”سننا رہو گی یا شہر یار لینے آئے گا۔“ بچہ پارٹی جا چکی تھی اور اب سب بڑے اکٹھے بیٹھے تھے۔ خشک میوہ جات کی ٹرے باری باری سب کے پاس جا رہی تھی، وہ کاؤچ پر بیٹھ کے سانسے بیٹھی تھی جب بھائی جان نے شہر یار کے متعلق پوچھا۔

”بھائی جان آج تمہارے پاس آنا کا کوئی وعدہ کچھ مصروف تھے، میں تو یہ بات کر کے مریم کو بلوایا۔“ وہ کئی دفعہ شہر یار کو کال کر چکی تھی مگر کال نہیں اٹھائی تھی اور اب تو نمبر ہی بند جا رہا تھا۔ بھائی جان سے بہانہ کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

”چلو تمہارا اپنا گھر ہے جب تک جی کرے رہو۔“ فی وی سے نظر ہٹا کر چھوٹے بھائی نے کہا۔

ایک ایک کر کے سب اٹھتے گئے اور لاؤنج میں وہ اکیلی اپنی سوچوں کے ساتھ بیٹھی رہ گئی۔ کئی لمحوں بعد اس نے دوبارہ موبائل پکڑا اور شہر یار کو کال کی مگر دوسری طرف صرف تیل کی کرخت آواز سنائی دے رہی تھی مطلوبہ آواز کا دور، دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے وقت دیکھا تو بارہ کا ہندسہ موبائل اسکرین پر روشن تھا، اس وقت تک شہر یار سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے اور یہ ہی تسلی اس نے خود کو دی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر مگن تھی کہ مریم کے آنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔

”نیتا تمہیں باتیں چھپانے کی عادت کب سے پڑ گئی؟“ مریم اکثر اسے نیتا کہتی تھی۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ لہجہ کو مستدل کرتے ہوئے اس نے ان کی طرف چہرہ کر لیا۔

”بہانا بنانا ہر وقت سو مند نہیں ہوتا۔“ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، شندے ہاتھ

پہ اس کا ہر جدت لکس بہت بھلا محسوس ہوا۔

”مریم! الجھنیں بہت ہیں مگر بتانے کی کوشش کرو تو ہر الجھن بے نام ہو جاتی ہے۔“ وہ اب بھی کشمکش میں تھی۔

”نیتا تمہیں باتیں چھپانے کی عادت کب سے پڑ گئی؟“ مریم اکثر اسے نیتا کہتی تھی۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ لہجہ کو مستدل کرتے ہوئے اس نے ان کی طرف چہرہ کر لیا۔

”بہانا بنانا ہر وقت سو مند نہیں ہوتا۔“ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، شندے ہاتھ

میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

”مریم آپ بھی تو بہو تھیں مگر اب آپ کا کتنا خیال رکھتے تھے، ہم سب بہن بھائی آپ کی دل آزاری کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، ہمارا ہر معتبر حوالہ آپ ہیں۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے مریم کو دیکھا تو ان کے تاثرات ناقابل فہم محسوس ہوئے۔

”زندگی کا کیا سرسری کے لیے آسان نہیں ہوتا یوں سمجھو کہ لڑکی اک طویل سڑک کی مسافر بن جاتی ہے جس کے اختتام سے بھی نااہل ہوتی ہے، کب خطرناک موڑ آجائیں، کب دشت میں کھو جائے کب نخلستان میں قدم رکھ دے، کب پہاڑوں کی قید میں پھنس جائے اور کب برقی چٹانوں میں چنوا دی جائے، اسے کچھ علم نہیں ہوتا۔“ مریم کسی سوچ میں کھولی ہوئی جا رہی تھی۔

”میں نہیں جانتی تانی کے ساتھ میری امی کی کیا رشتہ تھی یا یورانی جیٹانی میں کیا تعلق تھا مگر وہ رشتیں آج تک میں بھگت رہی ہوں۔ تانیا جان بہت اچھے تھے ان کے دل میں مجھے اس گھر میں پناہ کے لانے کی وجہ کوئی انتقامی کارروائی نہیں تھی مگر پھر بھی میں نے رشتوں کا قصاص ادا کیا، دس سال میں اس گھر کی کوئی چیز استعمال نہیں کر سکی کہ کہیں تانی کی نشانیاں سنھال نہ پاؤں، میں نے پانی بھی پیا تو اپنے گھر سے لائے گلاس میں مگر کبھی اف تک نہیں کی۔ کئی سال ہر رات میں یہ سن کے سوئی تھی کہ تانی کی موت کی ذمہ داری میری ماں تھیں، ماں دُنیا کے لیے کتنی بھی بری ہوں مگر بچوں کی جنت ہوئی ہیں۔ کئی سال لگے سننا مجھے اس مقام پہنچنے کے لیے، سب کا اعتماد جیتنے کے لیے میں نے اپنی اتنا داری اور اگر رشتوں کو بچانا ہو تو سب سے پہلے ان ہی ماری جانی ہے۔ میں راستے میں پڑا پتھر پرتی رہی اور لوگوں کی ٹھوکر دینے نے مجھے یارس بنادیا۔“ اندھیرے لاؤنج میں صرف سننا کی سکایاں گونج رہی تھیں، مریم بالکل خاموش ہو چکی تھی۔

”مریم ہم سب کو معاف کر دیں، یہ آپ کی خاموش صدا میں ہیں جو آج پلٹ کر مجھ تک آ گئی۔ آپ کی کھائی ہر ٹھوکر کی زد میں آج میں ہوں۔ پلیز

”مریم! الجھنیں بہت ہیں مگر بتانے کی کوشش کرو تو ہر الجھن بے نام ہو جاتی ہے۔“ وہ اب بھی کشمکش میں تھی۔

”نیتا تمہیں باتیں چھپانے کی عادت کب سے پڑ گئی؟“ مریم اکثر اسے نیتا کہتی تھی۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ لہجہ کو مستدل کرتے ہوئے اس نے ان کی طرف چہرہ کر لیا۔

”بہانا بنانا ہر وقت سو مند نہیں ہوتا۔“ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، شندے ہاتھ

پہ اس کا ہر جدت لکس بہت بھلا محسوس ہوا۔

”مریم! الجھنیں بہت ہیں مگر بتانے کی کوشش کرو تو ہر الجھن بے نام ہو جاتی ہے۔“ وہ اب بھی کشمکش میں تھی۔

”نیتا تمہیں باتیں چھپانے کی عادت کب سے پڑ گئی؟“ مریم اکثر اسے نیتا کہتی تھی۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ لہجہ کو مستدل کرتے ہوئے اس نے ان کی طرف چہرہ کر لیا۔

”بہانا بنانا ہر وقت سو مند نہیں ہوتا۔“ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، شندے ہاتھ

پہ اس کا ہر جدت لکس بہت بھلا محسوس ہوا۔

”مریم! الجھنیں بہت ہیں مگر بتانے کی کوشش کرو تو ہر الجھن بے نام ہو جاتی ہے۔“ وہ اب بھی کشمکش میں تھی۔

کہانی گھر کی

کزنز آتی ہوئی تھیں، جو اسے مبارک باد دے رہی تھیں، جب ممانی نے کہا۔

آج ماہ رو بہت خوش تھی، اس نے ایم بی، اسکے بہترین کارکردگی کے ساتھ کلیر کر لیا تھا، ماہ رو کی

<https://www.urdutubes.com/>



URDU TUBE
& HOME OF ENTERTAINMENT
urdutubes.com



”اچھا بنو! باجی کچھ دنوں کے لیے رہنے آ رہی ہیں، تم کبھی میسرے نہیں گئیں۔ امی کے پاس باجی ہوں گی، تم تیری کرلو میں رات میں چھوڑ دوں گا۔“
ناشتا کرتے ہوئے شہر یار نے اسے کہا۔
”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ چائے کپ میں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم پہلے امی سے پوچھ لینا پھر تیری کرنا۔“ اس نے مدھم آواز سے کہا مگر آواز اتنی ضروری جو سننا کے کانوں تک پہنچ گئی۔

”آپ نے کہہ دیا تو کافی ہے نا۔“ سننا نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا اور اسی بل شہر یار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ادھر بیٹھو، میری بات سنو۔“ سننا نے ناہم نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مجھے اور اک ہو گیا ہے کہ اپنے حقوق کا پرچار کرتے میں کتنے فرائض سے بھاگ رہا تھا، اپنی مردانگی کے دھم میں نہ صرف تمہارا گناہ گار بنا بلکہ دل ہی دل میں امی کے متعلق بھی غلط سوچتا رہا۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ میں تمہارے حق میں بہترین بننے کی کوشش کروں گا۔“ اس کے ہاتھ تھامے وہ شکستہ لہجے میں بول رہا تھا۔

”اچھا چھوڑیں۔ آپ بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے، میں امی سے پوچھ لوں گی۔“ اپنی خوش چہانتے ہوئے وہ جلدی سے بولی کیونکہ شہر یار کی شرمندگی بھی اسے گوارا نہیں تھی۔

”مجھے آپ کی تابعداری کا اندازہ تھا اس لیے میں پہلے ہی پوچھ چکا ہوں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا تو اس نے مصنوعی کھوری سے شہر یار کو دیکھا اور ہنس دی۔ اس کی واپسی کا فیصلہ زندگی کو بہت بدل بنا گیا تھا۔ وہ جتنی مٹی بن گئی اور ہر وہ شکل اختیار کرتی تھی جو مجازی خدا کو پسند تھی۔ آج شہر یار کی بات سے اسے احساس ہوا کہ وہ بھی مریم بن گئی تھی۔ پھر سے پارس بننے کا سفر مشکل ضرور ہوتا ہے مگر اچھا رہنما اور دعائیں ساتھ ہوں تو پارس بننا ممکن نہیں ہے۔

☆☆

مریم معاف کر دیں۔“ وہ ایک دم اٹھ کر مریم کے پاؤں میں بیٹھ گئی، اپنے خاندان کا مثالی مجسمہ چھن سے ٹوٹ گیا تھا۔

”میری صدائیں تم تک نہیں آئیں پاگل بلکہ میری دعائیں آتی ہیں۔ تمہیں بھی وہی راستہ ملا جس کی میں مسافر تھی اور جو ایک دفعہ کی راستے پہ سفر کر لے وہ رہنما بن جاتا ہے۔“ اس نے اسے اٹھا کے اوپر بٹھا لیا تھا۔

”صبح سویرے تمہارے بھائی کو کہوں گی کہ تمہیں گھر چھوڑ آئیں، شہر یار کو ہماری گڑیا کے بغیر تیار ہو کر آؤں جانا مشکل لگے گا نا۔“ مریم نے محبت سے اسے گلے لگا لیا۔

”بیٹیاں اتانے پر چم تان کر کڑی اچھی نہیں لگتیں اور اچھی بنی چکنی مٹی کی طرح ہوتی ہے جسے کسی بھی سانچے میں ڈالو وہ اسی شکل میں ڈھل جائے۔“ مریم کی مدھم آواز خاموشی میں گونج رہی تھی اور لاؤنج کے اندھیرے میں کھڑا اک وجود مطمئن سا واپس مڑ گیا۔

☆☆☆

وہ دے قدموں کرے میں داخل ہوئی تھی۔ صبح کا وقت اس کے لیے نہایت مشکل ہوتا تھا، امی جوڑوں کے درد کے باعث چلنے میں دشواری محسوس کرتی تھیں تو سب سے پہلے ان کو وضو کروا کر نماز پڑھانی اور پھر ناشتا کھلا کر کمرے کا رخ کرتی تھی۔ شہر یار کو اس کے لیے اٹھانا جان جو کھوں کا کام تھا کیونکہ ہلکی سی آہٹ سے شہر یار کے پہلو میں سوا ایک سالہ احمد بھی اٹھ جاتا اور پھر سنہا ایک منٹ کے لیے بھی نہیں مل سکتی تھی۔

اس وقت بھی شہر یار کی ساری چیزیں سیٹے دوسرے کمرے میں آگئی اور شہر یار کے تیار ہونے تک ناشتا تیار کر لیا تھا۔ اتنی تیزی سے سب کرتے وہ چکر اکر رہ جاتی تھی۔

”کیا افلاطون پیدا کیا ہے تم نے؟ کمرے سے ہی ہجرت پہ مجبور کر دیا۔“ شہر یار روز صبح احمد کے متعلق ایسے ارشادات نازل فرماتا اور وہ صرف مسکراتے پہ اکتفا کرتی۔

”بس ماہ رو بیٹا بہت کر لی پڑھائی، اب تم بھی اگلے گھر جانے کا سوچو، یہ دیکھو یہ فریضہ تم سے پورے چار سال چھوٹی ہے، صرف بیس سال کی ہے اور لی۔ اے کرتے ہی شادی کر دی تھی اب دیکھ لو اے گھر کتنی خوش ہے ماشاء اللہ، بھی لہیا نے آکر تو مانو فریضہ کی زندگی میں مزید خوشیاں بھری ہیں۔“

ماہ رو چپ رہی اور مدد طلب نظروں سے ماں کو دیکھا تو شاہینہ بیگم فوراً بیٹی کی مدد کو آگے بڑھیں، اور بھانج سے کہنے لگیں۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے صبیحہ! اللہ فریضہ کو ہنسا بستا رکھے، لیکن جیسا آج کل زمانہ ہے تو اچھا ہے کہ لڑکی اپنے بیروں پر کھڑی ہونے کے قابل تو ہو، اتنی تعلیم تو ضرور ہو جو مشکل وقت میں وہ کسی کی محتاج نہ ہو۔“

صبیحہ نے کہا۔

”ہاں شاہینہ کہتی تو تم ٹھیک ہو، لیکن دیکھو شادی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، اب ماہ روستائیں کی ہو گئی ہے، جلدی سے کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر کر ڈالو، مزید دو، تین سال گزرے تو یہ نہ ہو کہ مشکل ہو جائے۔“

”ہاں بھابی بس اب ان شاء اللہ ایسا ہی کرنا ہے، احسان صاحب بھی یہ ہی کہہ رہے تھے۔“

شاہینہ نے جلدی سے کہا۔

اب ماہ رو سے برداشت نہ ہوا، ماں کے گلے میں نا بنیں ڈالتے ہوئے بولی۔

”پیارے امی! ابھی تو پڑھائی سے جان چھوٹی ہے، تھوڑا سانس تو لینے دیں۔ آزادی سے جینے تو دیں، پھر کر لیجیے گا اپنا شوق پورا۔“ شاہینہ بیگم ہنسنے لگیں۔

☆☆☆

آج یہ تیسرا رشتہ تھا جو ماہ رو کے لیے آیا تھا، ماہ رو ماشاء اللہ اچھی خاصی خوش شکل لڑکی تھی، پڑھی لکھی، ہنس مکھ، دورانِ تعلیم کافی رشے آئے، لیکن ماہ رو کی ضد یہ کہ مجھے ایم، بی، اے کرنا ہے۔ سب سے

معذرت کر لی گئی۔ اب جبکہ بی، بی، اے کے بعد ایم، بی، اے کی ڈگری بھی ماہ رو کی دسترس میں تھی تو لگتا تھا کہ جیسے وقت دسترس سے نکل گیا تھا۔

پہلے دو لوگ جو آتے، اچھی طرح پرکھا، وہی انداز جیسے قصائی بھیڑ، بکری کو جانچتا ہے اور آنکھوں آنکھوں میں آپس کے اشارے کر کے۔ ”ہم بعد میں بتائیں گے۔“ جیسا مخصوص فقرہ کہہ کر چلتے تھے، اب بھی ایسا ہی ہوا اور کافی دن بھر کے بعد ہی

جواب نہ آیا، پھر ایک دن جن کی وسالت سے وہ لوگ آئے تھے ان کی زبانی پتا چلا۔

”انہیں لڑکی تو پسند آئی تھی لیکن کہہ رہے تھے لڑکی نے ایم، بی، اے کیا ہے لہذا عمر کافی ہو گئی، جبکہ ہمارا بچہ تو اُس سے چھوٹا ہے، لڑکی زیادہ نہیں تو کم سے کم پانچ سال تو ضرور چھوٹی ہو۔“

شاہینہ بیگم، احسان صاحب کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”کہا تھا نہ بس بی بی اے کافی ہے، مناسب تعلیم اور مناسب عمر میں بچیاں وقت پر اپنے گھر کی ہو جائیں تو اچھا ہے، پر آپ نے میری ایک نہ مانی، اور ماہ رو کی ضد مان لی، بچے تو ضد کرتے ہی ہیں۔“

اب ہر ضد تو نہیں مان لی جاتی نہ، ابھی ہمیں ماہ پارہ تو بھی بیا ہنا ہے، وہی فرسٹ ایئر میں آئی ہے۔

احسان صاحب نے رمان سے شاہینہ بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بیگم اس طرح پریشان نہیں ہوتے، اللہ کے یہاں دیر ہے پر اندھ نہیں، اس مالک کا سات نے ہر چیز کا جوڑ بنایا ہے اور ان شاء اللہ ہماری بیٹی کا بھی نہیں بہتر جوڑ ہی بنایا ہوگا، بس ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے، جو بھی ہوتا ہے اسی مقررہ وقت کے وقت ہوتا ہے، اس سے ایک لمحہ آگے نہ ایک لمحہ پیچھے، بس یہ دعا کرو جو بھی ہو ہماری بیٹی کے حق میں اچھا ہی ہو

☆☆☆

پورا ایک سال ان ہی تسلی، دلاسوں میں گزر

گیا۔ شاہینہ بیگم اور احسان صاحب کے ساتھ ساتھ اب ماہ رو بھی مسلسل ذہنی کوفت کا شکار رہنے لگی تھی، اُس نے جاب کرنے کا کہا، جس کے لیے شاہینہ بیگم نے واکاف الفاظ میں منع کر دیا کہ.....

”پہلے تعلیم کا کوٹ بنی ہوئی ہے، رہی سہی کسر جاب پورا کر دے گی۔“

کافی خاموشی کے بعد احسان صاحب کے بالا غارہ رو کا رشتہ طے ہو ہی گیا۔ میرے اٹھ، اے پاس تھا، لیکن گھاگ بڑس میں تھا، وجہ دو کرنا خوب جانتا تھا اور چاہتا تھا پر بھی لکھی بیوی ہو جو اس کے بڑس میں اس کا ساتھ دے سکے۔

اور نظر ہو کوئی برائی نہ تھی، صورت شکل بھی بہتر تھی، اور گھربار، والدین بھی قابل قبول تھے۔ دیکھ بھال اور تحویلی کی پچھان میں کے بعد رشتہ بھی طے ہو گیا، لیکن کوئی ماہ رو کے دل سے پوچھتا جس نے ایم، بی، اے کے بعد جب جب اپنے جیون ساتھی کے متعلق سوچا تھا تو تعلیم اور صورت کے لحاظ سے ہر شخص خود سے بہتر کا ہی تصور کیا تھا، لیکن ماں باپ کی ہر بات کو دیکھتے ہوئے ماں کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ کتنی ہی ماں کو راتوں میں نیند نہیں آتی اس کی فکر میں کہ ایک اچھی بیٹی کی طرح ماں، باپ کی رضا کے ساتھ کس جگہ کا دیا۔

ماہ رو بیاہ کر ماں باپ کی دعاؤں میں رخصت ہو کر گئے گھر، نئے لوگوں میں جا بسی اور بے شک تعلیم نے اور اچھی تربیت نے یہاں اس کا بہت ساتھ دیا، نوجوانی کے بھٹنے کی صلاحیت، نئے لوگوں کے ساتھ رشتہ اور خاست کے ادب و آداب کی بدولت بہت جلد سسرال میں اپنی جگہ بنا لی، ساتھ ہی بڑس میں منیر کو مفید مشورے دے کر چند دنوں میں ہی اُس کے دل میں بھی ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔

☆☆☆

ماہ پارہ نے جس دن انٹر پاس کیا، وہ بے انتہا خوش تھی اس نے تصورات کی ایک نئی دنیا بسالی کہ

اب یونیورسٹی کی لائف انجوائے کرے گی۔ اس کا گریڈ اٹنا اچھا تھا کہ کسی بھی یونیورسٹی میں آرام سے داخل مل جاتا، لیکن اس کے تصورات کی دنیا اس وقت چکنا چور ہو گئی، جب شاہینہ بیگم نے سختی سے کہہ دیا۔

”بس پڑھ لیا جتنا پڑھنا تھا، اب ٹائم ہے کہ وقت پر ہم تمہیں اپنے گھر کی کر دیں، ورنہ یہ نہ ہو کہ ماہ رو کی طرح تمہاری عمر بھی پڑھائی میں اتنی آگے نکل جائے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنا مشکل ہو جائے۔“

ماہ پارہ نے متیں کیں، باپ سے سفارش کروائی، لیکن شاہینہ بیگم کی نہ، ہاں میں نہ بدلی، ماہ پارہ دل کی دل میں رکھ کر خاموش ہو گئی، اور ماں کی رضا کے آگے سر جھکا دیا۔ وہ اسے گھر کے کاموں میں طاق کرنے لگیں اور اپنی ملنے، جھلنے والیوں سے تذکرہ بھی کر دیا کہ اب ماہ پارہ کے فرض سے بھی جلد ہی سبکدوش ہونا ہے، کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتا دینا۔

☆☆☆

ماہ پارہ نے تنقیدی نظروں سے اپنا جائزہ لیا، آئینے میں ایک بھر پور نگاہ خود پر ڈالی اور دو ٹوٹا کھول کر اچھی طرح سر پر لیتے ہوئے چن کی راہ لی۔ گزشتہ چھ ماہ میں یہ دوسرا رشتہ تھا جن کے آگے ماہ پارہ نے ٹرائل سجا کر پیش کی تھی۔ پہلے دیکھنے کے لیے آنے والے آئے، کھایا پیا، دو چار باتیں کیں اور رشتہ بتانے والے کے ذریعے کہلا بھیجا۔

”ابھی بچی چھوٹی ہے، تھوڑی میچور لڑکی چاہیے جو شوہر کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمے داریاں بھی خوش اسلوبی سے سنبھال لے۔“

شاہینہ بیگم افسردہ ہوئیں تو احسان صاحب نے سمجھایا کہ دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں، ابھی تو ابتدا ہے، ہماری بیٹی ماشاء اللہ صورت اور سیرت دونوں میں یکتا ہے، ایسی بھی کیا جلدی ہے ان شاء اللہ جلد ہی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔

”تم ماہ رو کے لیے بھی پریشان رہتی تھیں نا

فرح (تیس)

دل کی خاطر

<https://www.urdutubes.com/>

ہیں۔ چندے آفتاب، چندے ماہ تاب بہو تلاشتے ہوئے اس بات کو قطعاً فراموش کر دیتی ہیں کہ ان کے اپنے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں اور یہ سلسلہ ازل سے یوں ہی چلا آ رہا ہے، یوں ہی چلتا رہے گا۔ ماں باپ لاکھ ترکیبیں لڑائیں، لاکھ زمانے کے چلن کا ساتھ دینے کی کوشش کریں زمانہ پھر بھی انہیں جیتے نہیں دیتا۔

ماہ رو کے غم میں بس کن ہوتی تھی، عمر رکاوٹ بنی تھی تو ماہ پارہ کے ساتھ بھی یہی ہوا، حال ہی میں آنے والے رشتے نے تو گویا احسان صاحب اور ان کی بیگم کی زبان پر تالے ہی ڈال دیے جب رشتے کے لیے آنے والی سہز خواتین نے سرتاپا ماہ پارہ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”کتنا بڑھا ہے بیٹی نے؟“
شاہینہ بیگم جھٹ سے بولیں۔

”ماشاء اللہ انٹر پاس کیا ہے میری بیٹی نے اور گھر کے سب کاموں میں بھی ماہر ہے۔“
خاتون نخت سے یہ کہتے ہوئے ان کی زبانوں کو تالا لگا دیا۔

”نہ بہن صاف بات کہوں گی، بچی تو ماشاء اللہ اچھی ہے، لیکن معاف کیجیے گا ہم نے اپنے بیٹے کو اتنا بڑھایا لکھایا تو لڑکی بھی اس کے ٹکڑی ہی ہونی چاہیے نا، ہمیں تو ایسی بہو چاہیے جو زیادہ بڑھی گئی ہو تاکہ جاب کر کے ہمارے بیٹے کا بوجھ بناسکے، اس کا ساتھ دے سکے نہ کہ الٹا اس کا بوجھ بڑھائے۔“

اب دیکھ لو اللہ کا شکر ہے وہ بخوبی اپنے گھر میں بس رہی ہے۔“

شاہینہ بیگم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
”اللہ کا شکر ہے ہماری بیٹی اپنے گھر میں کبھی بس رہی ہے، بس اب ماہ پارہ بھی جلد اپنے گھر کی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس بے چاری کو شکوہ ہے کہ میں اس کی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بنی، پر وہ کیا جانے ایک ماں کے دل کو ماہ رو کی تعلیم کی وجہ سے کتنی باتیں سنی ہیں بس اس کی ڈر سے میں نہیں چاہتی تھی کہ ماہ پارہ کی بھی عمر اتنی ہو جائے کہ اس کو بھی بڑی عمر کے طعنے سننے پڑیں۔“

لیکن بیگم! یہ واقعی تم نے زیادتی کر ڈالی ہماری بیٹی کے ساتھ، زیادہ نہیں کم سے کم بی اے ہی کرنے دیتیں تو بھی کچھ نہیں تھا۔“
شاہینہ بیگم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”آپ صحیح کہتے ہیں، لیکن میں بہت ڈر گئی تھی۔ اس لیے چاہتی تھی کہ مناسب وقت پر اسے اپنے گھر کی کر دوں، خیر اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے، ابھی کون سا زیادہ ٹائم گزر گیا ہے۔ اللہ بڑا کارساز ہے، جلد ہی ہماری بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے گی اور اس کم عمری میں بھی اس میں اچھی سمجھ بوجھ ہے تعلیم بھی مناسب ہے جلد ہی اپنی گرتی میں ملن ہو جائے گی تو اس کا زیادہ تعلیم حاصل نہ کرنے کا قلق بھی ختم ہو جائے گا۔“

دونوں نے ایک ساتھ ان شاء اللہ کہا۔

☆☆☆

لیکن یہ دنیا ہے، ایسی دنیا جو انسان کو کسی حال میں جتنے نہیں دیتی، بظاہر کوئی کمی، کوئی خالی نہ ہوتے ہوئے بھی دو سال پلک جھپکتے میں گزر گئے لیکن ماہ پارہ کا رشتہ طے نہ ہوا۔ بے کار کی بہانے بازیاں، باتیں، بلا وجہ کی تکت چینی، پتا نہیں لڑکے کی ماں ہونا کون سا اور کہاں کا اعزاز ہوتا ہے جو ماں میں رشتہ دیکھتے ہوئے اپنی آنکھیں اپنے ماتھے پر رکھ لیتی

درد موم

راحت جبین

قیمت - 1000 روپے

مکتبہ رحمان ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر: 32735021

”رشتوں کی بقا کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تھوڑا جھک جایا جائے اس سے رشتوں میں بھی دراڑ نہیں پڑتی بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔

ہر رشتے کی اپنی میعاد ہوتی ہے اور یہ ہمارے رویے ہوتے ہیں جو اس میعاد کو یا تو ہمارے ناروا سلوک سے بہت تھوڑے وقت پر محیط کر دیتے ہیں یا ہمارے اچھے سلوک سے عمر بھر قائم کر دیتے ہیں۔

یہ تو ہم انسانوں پر منحصر ہے کہ ہم رشتوں کو کتنا اور کس حد تک لے کر چلتے ہیں۔ رشتوں کو بہت آرام سے عمر بھر اپنے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے بس شرط یہ ہے کہ اگر ہم ایسا چاہیں اور یقین کرو حرمت امتش رشتوں کا حسن ہی ایک دوسرے کو سمجھنے میں ہے۔

ایک فریق کب تک کسی رشتے کو نبھا سکتا ہے جب تک دوسرا فریق نہ چاہے۔ دوسرے فریق کے روینے میں اگر کھٹ ہو اور جاہت و غلوں نہ ہو تو پھر چاہنے والے کی چاہت کتنی بھی ہو آہستہ آہستہ اس کے جذبات بھی سرد ہونے لگتے ہیں۔ پھر یہ سرد مہری انا کی دیوار کھڑی کر دیتی ہے جو پھر بعد میں تعلقی اور فاصلوں کو جنم دیتی ہے۔ ”زونہ آپا بہت محبت سے اس کا ہاتھ تھامے اسے کافی دیر سے سمجھا رہی تھیں۔

مگر مقابل بھی حرمت امتش تھی ”میں نہ مانوں“ کی تفسیر، اس کے ٹھس انداز پر بڑی آپا کو غصہ آ گیا۔

”میں کچھ بول رہی ہوں تم سے۔“ وہ اپنا غصہ دباتے ہوئے بولیں۔

”میں نے سن لیا ہے۔“ لا پرواہی سے کہتی ہوئی وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور برش اٹھا کر اپنے بالوں میں کرنے لگی اس کی اس درجہ ڈھٹائی پر آپا کا بس نہیں چل رہا تھا اسے چھڑ بڑ دیں۔

”حرمت! تم کو خوف نہیں آتا رشتوں کے کھو جانے سے۔“ آپا اس کے حسین سراپے کو آئینے میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

”نہیں، میں نے کسی رشتے کو اپنی کمزوری کبھی بنایا ہی نہیں کہ وہ مجھ پر اس درجہ غالب آجائے کہ اس کے کھو جانے کے خوف سے بھی میں ڈروں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”اللہ کرے کوئی رشتہ تمہارے لیے ایسی آزمائش نہ بنے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تمہاری کمزوری بن جائے۔“ آپا گہری سانس لیتے ہوئے دھیسے سے بولیں۔

”ایسا بھی میں نہیں چاہتی کہ میں حرمت کی اتنی کمزور بنوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے ہنسنے لگی۔

”بعض اوقات انسان کمزور پڑ جاتا ہے اپنے دل کی خاطر خدا تمہارے اس مان کو سلامت رکھے۔“ آپا زیر لب بولیں۔

☆ ☆ ☆
زونہ، شجاع اور فرحانہ کی سب سے بڑی بنی تھیں۔ زونہ جب بارہ سال کی تھی۔ تب ایک بار پھر فرحانہ کی گود ہری ہوئی اور ان کی گود میں حرمت آ گئی۔ زونہ کو اپنی چھوٹی اور لکڑی بہن بہت عزیز تھی۔ حرمت بھی بالکل کالج کی ٹانگ کی گھسی جیسی، جسے ہاتھ لگتے ہوئے بھی ڈر ہوتا کہ نہیں ملی نہ ہو جائے، جس قدر اللہ نے اسے حسن نوازا تھا اتنا ہی اس کا مزاج بھی شامانہ تھا۔

ماں باپ اور بہن کی محبتوں کا واحد مرکز حرمت شروع سے رہی تھی۔ پھر خوش قسمتی سے جہاں بھی جانی جلد ہی لوگوں کو اپنا اسیر کر لیتی، اکثر بہتر لوگ اس کے حسن سے مسحوب ہو جاتے خود حرمت کو بھی اس بات سے بھرپور آگاہی تھی، جس کی وجہ سے اس کے مزاج میں بھی خود بخود غرور کا عنصر آ گیا تھا۔

امتش احمد حرمت کے والد کے دوست کے بیٹے، جو بہرہ وران ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے تھے، اپنے گھر کی ایک تقریب میں حرمت کی ایک جھلک دیکھ کر اس کے حسن کے سحر میں گرفتار ہو گئے

تھے۔
امتش کی فرمائش پر ان کے گھر والوں نے حرمت کا ہاتھ مانگ لیا۔ جس پر شجاع اور فرحانہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے امتش جیسے خود اور لائق انسان کو داماد بنانا اپنی خوش قسمتی تصور کیا اور یوں ایک شام حرمت کو امتش کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔

امتش کی سحرانیز شخصیت کی اسیر تو حرمت ان کے گھر کی تقریب میں ہی ہو گئی تھی اور کتنی ہی بار چوری چھپ کر اس کی نظروں سے اس کا وہاں نہ جانا تھا۔ جس دن اس نے امتش کے نام کی انگوٹھی اپنی انگلی پر پہنائی۔ اس دن اس کو لگا وہ مکمل ہوئی ہے اسے اپنا آپا اس دنیا کا خوش قسمت ترین لگنے لگا تھا۔

شادی کے اوائل دن تو امتش کی قربت میں اسے لگتا کہ وہ کی اور ہی جہاں کی سیر کر رہی ہے جتنی بولنے کے لیے وہ لوگ پیرس گئے وہاں سے آنے کے بعد تو حرمت کا حسن اور نکھر سا گیا تھا۔

لیکن چاہے سہمی کی ہر اہی ہو تو انسان نکھرتا چلا جاتا ہے۔ حرمت کا حسن بھی امتش کی قربت میں دن بہ دن نکھرتا چلا جا رہا تھا۔ امتش حرمت کے معاملے میں حد درجہ حساس تھا، وہ اس کا خیال کسی کالج کی گڑیا کی طرح نہ دیکھتا۔ اس کی بے پناہ الفت نے اسے اور مغرور بنا دیا

☆ ☆ ☆
آج صبح آفس جاتے ہوئے امتش اور حرمت کی کسی بات پر تکی کھائی ہوئی جس پر حرمت کافی زیادہ امتش سے خفا تھی۔ وہ شام میں آپا کی طرف چلی آئی تو ان کو بتانے لگی جس پر وہ اسے سمجھانے لگیں کہ کنگہ وہ جانتی تھیں غلطی حرمت ہی کی ہوگی مگر کافی دیر سے سمجھانے کا بھی کیا فائدہ وہی ڈھاک کے تین پات کے اس کے نزدیک وہ کسی رشتے کو اپنی کمزوری بنانے کی حماقت نہیں کرتی۔

رات کھانے کی میز پر حرمت نے بے دلی سے کھانا کھایا امتش چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا مگر منہ سے کچھ بولا نہیں۔ کھانے کے بعد وہ خاموشی سے

لان میں آ کر چہل قدمی کرنے لگی کافی دیر تک وہ واک کرتی رہی، چلتے چلتے جب وہ تھک گئی تو وہ کئی بیچ پر جا کر بیٹھ گئی حرمت ہاتھ میں پڑے سیل فون میں وقت دیکھنے لگی بارہ بجتے والے تھے اتنا وقت ہو گیا اور مجھے نام کا پتا بھی نہیں چلا۔ وہ سوچتے ہوئے گہری سانس لیتے ہوئے فضا میں بکھری مویے کے پھولوں کی خوشبو اپنے اندر اتارنے لگی۔ مویے کی بھینٹی بھینٹی خوشبو اسے شروع سے پسند تھی۔ اس کی خوشبو وہ اپنے اندر اتار کے تروتازہ ہو جاتی تھی وہ آنکھیں بند کر کے اپنا سر بیچ کی پشت سے لگا کر ریلیکس ہو کر بیٹھ گئی۔

امتش بہت خاموشی سے اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ ”سونا نہیں ہے چل کر اس کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔“

”آپ کو کیا۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”اچھا سوری نا۔“ وہ کانوں کی لو کو ہاتھ لگاتے ہوئے شرارت سے بولا۔

”مجھے کیسے نیند آتی یا رابر امل مجھ سے خفا ہوئے باہر بیٹھا ہوا در میں سو جاؤں۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”تم جانتی ہو حرمت! مجھے کس چیز نے نہیں سونے دیا۔“ وہ اس کا چوڑیوں سے سجا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

”تمہارے اس مان نے جو تم کو مجھ پر ہے۔“ وہ اس کی سوالیہ نگاہوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”حرمت امتش جب کسی کو یہ مان ہو کہ اس کو منالیا جائے گا تو اس کے اس مان کو قائم رکھنا چاہیے اس کے مان کو توڑا نہیں جاتا۔ اس کے اس غرور کی حفاظت کی جانی ہے جو اسے اپنی محبت پر ہوتا ہے“ امتش والہانہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے کان میں دھیرے سے بولا۔

اور صبح نے اس سے خفا حرمت امتش کے لبوں پر تقاضا نہ مسکرا ہٹ آ گئی اس کو امتش کی آواز اپنے کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ زیادہ دیر اس سے خفا رہی نہیں سکتا۔

بہت سے لوگوں کی بڑی مقناطیسی شخصیت ہوتی ہے وہ اس بات سے پوری طور پر آگاہی رکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت کا سحر مقناطیس کی مانند دوسرے کو اپنی جانب کھینچنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی حال حرمت کا بھی تھا وہ جانتی تھی وہ اللہ کے لیے ایک مقناطیس ہی تھی جس سے وہ چاہ کر بھی زیادہ دیر دور نہیں رہ سکتا تھا۔

☆☆☆

”ماشاء اللہ! حرمت اور اللہ کی شادی کو آٹھ ماہ گزر گئے اور پتا ہی نہیں چلا۔“ آپا کھانا کھاتے ہوئے بولیں۔

”وائی آیا آٹھ ماہ بیت گئے، لگتا ہے کل ہی کی بات ہو۔“ اللہ خوش گوار حیرت سے بولا۔

آج فرحانہ اور شجاع نے رات کھانے پر دونوں بیٹیوں اور دامادوں کو بلایا تھا۔

”ہم سے پوچھو، دس سال بیت گئے ہیں اور ہمیں روز پتا چلتا ہے۔“ آپا کے برابر بیٹھے وقاص اپنے سات سالہ بیٹے کو کھانا کھلاتے ہوئے سرد آہ بھرتے ہوئے بولے ان کی بات پر برابر بیٹھی زونہ شہر کو گھور لگیں۔

”میرے خیال سے تم دونوں سے زیادہ مظلوم میں ہوں۔“ شجاع شرارت سے فرحانہ کو دیکھتے ہوئے بولے ان کی بات پر سب ہی تہقیر لگا کے ہنس دیے۔

کھانے کے بعد زونہ کافی لے کر فرحانہ اور حرمت کے پاس ہی آگئیں جو باتوں میں مشغول تھیں تھوڑی ہی دیر بعد اللہ بھی کافی کا کپ لیے ان کے پاس چلا آیا۔

”کیا ہو رہا ہے لیڈیز!“ وہ حرمت کے برابر بیٹھے ہوئے بولا۔

”آپ کی برائی کر رہے تھے۔“ حرمت سنجیدگی سے بولی مگر اس کی آنکھوں میں ناچتی شرارت سے وہ واقف تھا۔

”ہاں تو پھر مل کر تے ہیں نا۔“ اللہ کے شونہ سے کہنے پر سانسے بیٹھی فرحانہ اور زونہ ہنس دیں۔

”یہ دونوں کہاں ہیں؟“ فرحانہ، شوہر اور بڑے داماد کا اللہ سے پوچھنے لگیں۔

”کچھ نہیں میچ دیکھ رہے ہیں۔ میں بور ہو رہا تھا، سوچا یہاں آکر اور بور ہو جاؤں۔“ اس کے شریر لہجے پر وہ بیٹوں ہی ہنس دیے۔

”ویسے ہم آپ کی نیگم سے پوچھ رہے تھے کہ شادی کے آٹھ ماہ کیسے گزرے۔“

”پھر کیا جواب آتا نیگم کا۔“ اللہ دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

”بہت اچھے۔“ برابر بیٹھی حرمت جذب ہے بولی۔ ”اور پتا ہے سب سے مزے کی بات یہ ہوتی ہے کہ غلطی میری ہو تب بھی اللہ مجھے منا لیتے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ مجھے تو منانا آتا ہی نہیں۔“

روانی سے بولی حرمت نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ برابر بیٹھے اللہ کی مسکراہٹ پھپکی ہو گئی ہے مگر سانسے بیٹھی فرحانہ اور زونہ شرمندہ ہی ہو گئی تھیں۔

”بڑی ہی حسرت رہی نیگم کہ کبھی آپ بھی ہمیں منائیں۔“ اگلی صبح ناشتے کی میز پر چائے پیے

اللہ نے بڑی حسرت سے کہا اس کے چہرے پر بھی بے چارگی دیکھ کر جوں بیتی حرمت کی ہنسی نکل گئی۔

”ہنسو نہیں لڑکی! بچ بول رہا ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں خفا ہوں اور میری نیگم میرے آگے پیچھے پھرے۔ مجھے منائے۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

”پھر تو آپ منہ دھوریں، میں ایسا کوئی شوق آپ کا پورا نہیں کرنے والی۔“ حرمت میز سے چیزیں اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے ہنسی۔

”کیوں، میرا بار میں منانا ہوں۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تم بھی مجھے مناؤ۔“ اللہ کی بات پر وہ

چونک کر اس کو دیکھنے لگی۔ ساوہ سے لہجے میں کئی بات میں ایسا کچھ تھا جو حرمت کو چونکا گیا ہے۔

”میں نے بھی کسی کو منایا ہی نہیں، نہ مجھے آتا ہے منانا۔“ وہ اللہ کو گاڑی کی چابی دیتے ہوئے

سادگی سے بولی۔

”منانا تو کوئی بھی نہیں سیکھتا یہ تو جن سے ہمیں

محبت ہوتی ہے ان کو خود بہ خود ہی منایا جاتا ہے۔ صرف اس ڈر سے کہ کہیں وہ ہمارا بہت اپنا ہم سے دور نہ ہو جائے۔“ وہ آٹس کے لیے بریف کیس اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کی لٹ کھینچتا ہوا خدا حافظ کہتا پلٹ گیا۔ وہ کاندھے اچکا کر فریج سے سبزی نکالنے لگی۔

☆☆☆

وقت اپنی روانی سے گزرتا چلا جا رہا تھا ان ہی دنوں حرمت کو خوشخبری ملی کہ ان کے والدین کے تھے پر

فائر ہونے والی ہے۔ اس پہلے کے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔

مگر ایک شام دونوں میں کسی بات پر بحث ہوئی، جو بڑھتے بڑھتے جگمگلائی تک جا پہنچی۔

ایک دن، دو دن، تین دن ہو گئے مگر اللہ نے اس سے بات نہیں کی۔ حرمت کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ اللہ ہے جو اس کی ایک دن کی ناراضی سہہ نہیں کرتا تھا۔

لاشعوری طور پر حرمت اسی انتظار میں رہی کہ کب اللہ اس کو منانا ہے مگر اس کی طرف سے کوئی رد عمل نہ دیکھ کر حرمت کو کبھی۔۔۔ غصہ آ گیا اور

اللہ کی بے رحمی پر غصہ بھی ہوتا۔

”ایک شام بوہہ آپ کی طرف چلی آئی۔“

”تمہارا دماغ کدھر غائب ہے۔“ حرمت جو کافی دیر سے غائب دماغی سے آپا کی باتوں پر ہوں

ہاں کر رہی تھی۔ اسے آباؤ کتنے ہوئے بولیں۔

”نہیں نہیں آیا!“ وہ کسمندگی سے وہیں بیڈ پر لیٹ گئی۔

”اللہ سے کوئی بات ہوئی ہے۔“

”نہیں تو۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”مجھے نہیں بتاؤ گی۔“ آپا کے اصرار پر وہ ان کو دیکھنے لگی۔

”کیا بتاؤں یہ کہ جو ابھی ایک سال تک میرا دیوانہ تھا، میرے آگے پیچھے پھرتا تھا، اب مجھ سے بے

زار ہو گیا۔ جس کو میری ایک دن کی ناراضی برداشت نہیں ہوتی تھی، اب پچھلے ایک ہفتے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔“ بولنے بولنے اس کی آواز بھرا گئی۔

”سب باتیں منہ دیکھ کی ہوتی ہیں کہ کسی کو مان ہو تو مان نہیں توڑنا چاہیے۔ اب کہاں کہیں وہ باتیں، آپ کہاں گیا میرے مان کا خیال۔“ اس کے لہجے میں کئی ذرا آئی۔

زونہ بہت افسوس سے اسے دیکھنے لگیں۔

”تم نے کون سا اس کا مان رکھا۔“ آپا کی بات پر وہ غلطی سے ان کو دیکھتے ہوئے بیڈ سے اترنے لگی۔

”بیٹھ جاؤ، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔“ حرمت کو دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولیں۔

”وہ ناراض ہے تو تم کیوں نہیں منائیں۔“

”کیوں میری کوئی اتا نہیں ہے۔“ حرمت کی بات پر وہ طنز پر ہنس دیں۔

”ایسے کیوں ہنس رہی ہیں۔“ اسے ان کے اس طرح سے ہنسنے پر ابھن ہوئی۔

”میں یہ سوچ گئے ہنس رہی ہوں کہ اللہ احمد میں تو اتنا ہے ہی نہیں ہر بار بے وقوفوں کی طرح تم کو منانا ہے۔ جاتی ہو کیوں، کیونکہ وہ اتنا سے زیادہ رشتوں کو

اہمیت دیتا ہے۔ دل کو بھٹاتا ہے۔ یہ اتنا دیاں دکھائی جاتی ہے جہاں دوسرا فریق آپ کو کچھ نہ سمجھے آپ کو کسی گنتی میں نہ لائے مگر احساس اور محبت کے رشتوں میں اتنا

کہاں سے آگئی۔ وہ تم کو کچھ نہ سمجھتا، تمہارا خیال نہ کرتا، تم کو محبت، عزت، وفائدہ دیتا تو جواب میں تم ان کی دیوار

کھڑی کرتیں مگر یہ کہاں کا جواز ہے کہ ہمیں منانا نہیں آتا۔ جن سے دل جڑے ہوتے ہیں نا جو ہماری ذرا سی

تکلیف پر تڑپ جاتے ہیں نا تو ان کو آگے بڑھ کے منایا جاتا ہے۔ ان کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ خالی ہم

تمہارے لیے خاص نہیں، تم بھی ہمارے لیے خاص ہو۔“ آپا نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اور اس بار وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ خالی میں ہی حرمت سے محبت کرتا ہوں یا وہ بھی اس محبت میں

شریک ہے۔ اب تمہاری باری ہے، آگے بڑھو اور اسے منا کر یہ احساس دلاؤ کہ ان کی غلطی تمہارے لیے کتنی اہم ہے۔ میری جان پر خلوص رشتے اور مخلص

غریب ایڈمن

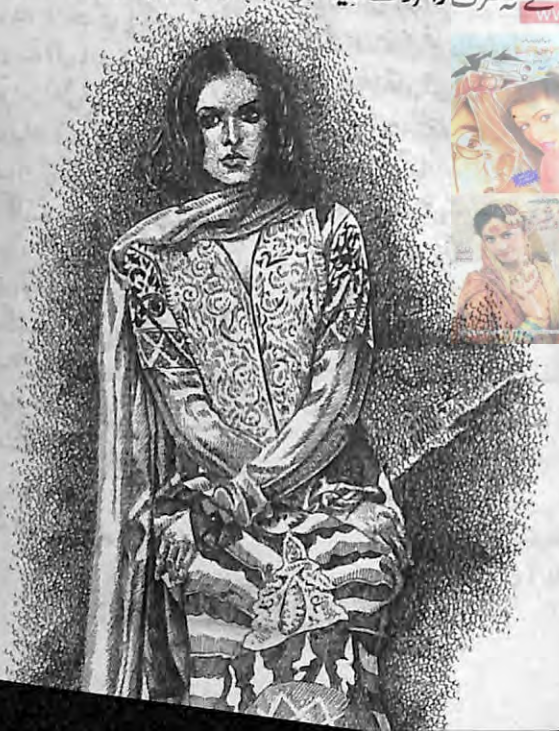
بنائے بلکہ چلائے بھی۔ یہ کام میں پچھلے پانچ سال سے کر رہی ہوں۔ بدلے میں کبھی اسے کام کی قدر اور عزت کے سوانہ کچھ چاہا، نہ کچھ مانگا کہ مجھے یہ کام کر کے مزا آتا ہے۔ یہ میرا شوق ہے، وقت گزاری کا شغل اور دوسروں کو دیے جانے والی سہولت بھی۔ نوٹیشن میری بڑی بہن اکثر چڑ کر مجھ سے کہتی۔ ”کیا مل جاتا ہے تمہیں دس دس رائٹرز کے بیج بنا کر چلانے سے؟“

اور میں جواب میں بڑے مزے سے کہتی۔

”سکون اور مزا۔ عزت اور قدر۔“

نوٹیشن تاسف سے سر ہلائی۔

”مفت کی ملازمہ، سارا وقت اس بے کار شوق میں برباد کر دیتی ہو اور بدلے میں کچھ نہیں پاتیں۔“



سوشل میڈیا کے اس دور میں جب ہر رائٹر کا دل بچنا چاہتا ہے، انہیں چلانے کے لیے ایڈمن کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر ایک بیج کے باقاعدہ ایڈمن موجود ہیں۔ کچھ مردہ بیج جو بڑے غلوں دل سے ہر بیج کی ذمہ داریاں سنبھال لیتے ہیں اور بدلے میں کچھ بھی نہیں پاتے۔ ایڈمن کی سوسوبائیں ہی سننے کوئی ہیں۔

کوئی بھی کہانی بیج پر لگتا ہو، کوئی مخصوص پیرا گراف، کسی سوال و جواب کا سلسلہ یا فیز کے سوالات اور فرمائشوں کے جوابات، سب ایڈمن سنبھال لیتا ہے۔ رائٹر اس معاملے میں بے فکر ہو کر اپنے کام پر دھیان دیتا ہے۔ میں بھی ایک ایسی ہی ایڈمن ہوں جس نے نہ صرف رائٹرز کے لیے بیجز



جھکے سر کے ساتھ بولی۔
”میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں تم کو جھکاؤں نہ ہی میرا شمار بھی ان مردوں میں ہوتا ہے جو گورت کو جھکا کر، اپنے آگے کمزور دیکھ کر، ان کی مردانہ انا کو تسکین ملے۔ میں صرف تم کو اس بار یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ رشتہ کسی بھی روپ میں ہوں اور رشتہ بھی وہ جو آپ سے خلص ہو تو اس رشتے کی خاطر اگر تھوڑا سا جھک جایا جائے تو حرج نہیں، اگر غلطی آپ کی ہو کیونکہ دلوں کی خاطر نامی ریدر کے لیے پناہ ملتا ہے اور ہاں، میں نے اس ایک بیج سے تم سے بات نہ کر کے تم پر ہی نہیں خود پر بھی بہت ظلم کیا ہے پر آپ کی تنبیہ کی تھی یہ ہی وقت ہے حرمت کو سمجھانے کا۔ وہ مسکین کی شکل بنا کے بولا۔

”یعنی آپ اس پلان میں شامل تھیں اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی۔“ وہ اپنے بے وقوف بن جانے پر اسے مصنوعی حلقی سے گھورنے لگی۔
”پر اس پلان سے تمہیں کچھ بھی تو آیا نا۔“
اتش کی بات پر وہ شرمندہ سی ہوئی۔
”ادھر دیکھو، میں اپنی حرمت کو کبھی شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتا، نہ ہی میرا ارادہ ہے شرمندگی سے دوچار کرنے کا تھا۔“ وہ اس کے جھکے چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میری نادانی تھی جو میں کہتی تھی کہ رشتوں کو کمزوری نہیں بناؤ مگر مجھے آج کچھ آگئی کہ جو رشتے ہمارے دل سے جڑے ہوں اور ہمیں عزیز رکھتے ہوں وہ تو خود بہ خود ہماری کمزوری بن جاتے ہیں اور دل کی خاطر تو اپنیوں کو ماننا لینا چاہیے کیونکہ جس طرح سے ہمیں مان ہوتا ہے کہ ہمیں منالیا جائے گا اس طرح سے ان کو بھی تو یہ مان ہوتا ہے۔“ حرمت کی بات پر اتش آنکھوں میں محبت کا جہاں لیے اسے سننے لگا۔

”یہ دل ہی تو ہے اور اس دل کی خاطر ہی تو ہم سب مجبور ہیں۔“ اتش کی پیار بھری سرگوشی پر پرایک سکون بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

☆☆

ہم سفر ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتے۔ ان کی قدر کی جاتی ہے، اپنے ہونے کے ذم میں ان کو دور نہیں کیا جاتا۔ سچے رشتے بھی نفرت ہوتے ہیں، قدر نہ کرو تو چھن جاتے ہیں۔“
”اللہ نہ کرے۔“ حرمت جو سر جھکائے نادمی سن رہی تھی، بچکوں سے روتے ہوئے بہن کے گلے لگ گئی۔ زونہ کے دل کو بے اختیار اطمینان سا محسوس ہوا کہ ان کی چھوٹی بہن بغیر کسی نقصان کے سمجھ گئی۔
سارا راستہ وہ اپنا حامیہ کرتی رہی۔ آج اسے پہلی مرتبہ خود سے شرم آ رہی تھی۔ گاڑی وہ پھولوں کی دکان کے پاس روک کے اتر گئی۔

☆☆☆

رات اتش کھانے کے بعد کافی دیر تک آفس کی فائلز میں سرکھپا رہا۔ کل آف تھا اس کے باوجود بھی وہ کام میں مصروف تھا یا ظاہر کر رہا تھا۔ حرمت کن آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی، وہ بالکل اس کے وجود کو نظر انداز کیے ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہ اسے خاموشی سے جاتا دیکھتی رہی پھر خود بھی اٹھ کے واڈ روپ سے اس کا گفٹ جو وہ آج ہی اس کی پسند کا پرفیوم لائی تھی اور پھول لے کر باہر چلی آئی۔

وہ لان میں کھڑا آسمان کو تنک رہا تھا حرمت آہستگی سے اس کے پاس چلی آئی اور اس کی پشت پر سر رکھ کر بنا آواز رونے لگی۔

”معاف کر دیں نا۔“ وہ آنکھوں میں حیرت لے کر لپٹا اور اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”حرمت!“ وہ حیرانی سے بولا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا یہ حرمت ہے۔ وہ ہاتھوں میں تھام گفٹ اس کی جانب بڑھانے لگی۔ وہ بے یقینی سے اس کے ہاتھ سے گفٹ لینے لگا۔

”میں تھک گئی ہوں خود سے جنگ کرتے کرتے۔ میری انا میری ضد مجھے صرف تنہائی دیتی۔ آپ مرد ہو کر ہر بار پہل کرتے تھے تو کیا اس بار میرا فرض نہیں تھا کہ میں آگے بڑھوں، دل کی خاطر۔“ وہ

”ارے ارے، کیوں نہیں پاتی۔ میری اتنی عزت ہے بطور ایڈمن نام ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے رائٹرز سے بات کر کے جب وہ میرے کام کو سراہتی ہیں، میری مشکور ہوتی ہیں۔ مجھے محبت دیتی ہیں، یہ کم ہے؟ ان میں سے اکثر رائٹرز کو نہ بیچنا آتا تھا اور نہ ان کے پاس چلانے کا ٹائم ہے۔ ایسے میں ان کی آسانی کے لیے ان کے کام آجانی ہوں۔ اس میں برا کیا ہے بھلا؟“

”برا کچھ نہیں ہے، میں بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ کبھی کسی رائٹرز نے یہ کیوں نہ سوچا کہ اپنے بیچ کے ایڈمن کی بے لوث خدمت کے عوض انہیں کچھ دے دیا جائے۔ بھلے بھی کبھار ہی کسی۔ آخر ایڈمن کی بھی سو ضروریات ہو سکتی ہیں۔ وہ بھی انسان ہیں۔ غریب بھی ہو سکتا ہے اور مشکل میں بھی، جب اس دور میں ہر شے کی قیمت ہے، معاوضہ ہے تو اس کی کاوشوں کا کیوں نہیں۔ اس کی شبیر اور کام کی بدولت رائٹرز کو کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ اسے اس کے کام کے عوض کچھ دینا کبھی کبھار برا ہے کیا؟ ہر جگہ اور ہر وقت ستائش کافی نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ آپ کو کسی اور صورت میں بھی صلہ درکار ہوتا ہے۔“

نوشین کی بات درست تھی یا نہیں، میں نہیں جانتی تھی لیکن میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب یہ سب تو میرا شوق تھا۔ کسی نے مجھے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ ہاں یہ اور بات تھی کہ ہمارے گھر کے حالات تنگ تھے۔ ابو کی ایک معمولی سی کریانے کی دکان تھی۔ ایک کمانے والا اور ہم سات کھانے والے۔ میں نہ زیادہ پڑھی لکھی تھی، نہ ہی میری پانی بہنیں کہ کوئی ہمیں نوکری دیتا۔ سو ہم اپنے باپ کا ہاتھ اس طرح بنا سکتے تھے کہ سلائی اور ٹیوشن کے نام پر چند ہزار کما لیتے۔ اس سے ہمارا اپنا جب خرچ پورا ہو جایا کرتا تھا۔ بھائی دونوں ابھی بہت چھوٹے تھے، وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ساری ذمہ داری ابو کے کاندھے پر تھی۔

خیر تو بات ہو رہی تھی مجھ بے چاری غریب

ایڈمن کی۔ میں اسی ایمان داری سے اپنا کام کرتی رہی تھی، نہ میں نے نوشین کی باتوں کا پہلے اثر لیا تھا، نہ اب لے رہی تھی۔ اس وقت میں چھ بیٹرز کی ایڈمن کے فرائض انجام دے رہی تھی کیونکہ ڈائجسٹ پڑھنا میرا شوق تھا اور اس مشغلے کے سوا میرا کوئی شغل نہیں تھا۔

لیکن پھر ایک روز کچھ ایسا ہوا کہ مجھے نوشین کی کہی باتوں سے اتفاق کرنا ہی پڑا۔ ہوا کچھ یوں کہ وہ موبائل جو اتنے مہینوں کی محنت پونے کے بعد میں نے خریدا تھا، میرے ہاتھ سے چھوٹا اور پیسے گر کر ایرا خراب ہوا کہ دوبارہ ٹھیک ہونے کے لائق ہی نہیں رہا۔

اب مجھے پھر سے پاکٹ منی جمع کرنا تھی تاکہ میں ایک عدد موبائل خرید سکوں۔ بطور ایڈمن کام کرنے کے لیے یہ از حد ضروری تھا۔ وقتی طور پر گزرا کرنے کے لیے میں سم نوشین کے بیٹوں والے موبائل میں ڈال کر کام چلانے لگی کہ چلو کم از کم میسجز اور کال تو کرنے لائق ہوں گی۔

میرے یوں اچانک غائب ہو جانے کی صورت میں کچھ رائٹرز نے مجھے میسجز بھی کیے کہ کہاں چلی گئی ہو۔ میری غیر حاضری کی وجہ سے میرے بیچ کا کام رکا ہوا تھا۔ میں نے انہیں اپنی مجبوری بتائی تو مختلف جوابات سننے کو ملے۔

”لو اب تمہارا انتظار کروں کہ کب موبائل ٹھیک ہو اور کام چلے۔ میں کسی دوسری ایڈمن سے کہتی ہوں کہ وہ میری اسٹوریز لگا دیا کرے۔“

ایک مل میں، میں اٹھا کر جیسے ایک طرف لگا دی گئی تھی۔ کیا بیٹرز پر محض اسٹوریز ہی لگانے کا کام کیا جاتا ہے؟ بیٹرز کو الیکٹرونکس کے لیے روزانہ کے حساب سے تھکن کیے جاتے ہیں۔

”او کے ٹینکس، میں خود کچھ کر لوں گی۔“

کسی اور کا جواب آتا تھا۔

”موبائل نیا لے لو، اس میں کیا مشکل ہے؟“ کسی کے لیے واقعی کتنا آسان حل تھا اور اس

حل کے لیے نجانے مجھے کتنے ماہ اپنی پاکٹ منی جمع کرنی تھی۔ میرے پاس ہنر تھا مگر پیسے نہیں تھے۔ ہردن، ہر بل میرے دماغ میں یہی جوڑ توڑ لگا رہتا کہ موبائل کہاں سے اور کیسے لوں؟ سادہ بیٹوں والا موبائل لینا آسان تھا لیکن ایک غریب ایڈمن کے لیے سیکنڈ ہینڈ سکرین موبائل لینا بھی مشکل تھا۔

”دیکھا اسی لیے میں کہتی تھی کہ ہر جگہ انسان کو راتوں رات کھانا کھانا دینا پڑتا ہے۔“

اور ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ اب اتنی رائٹرز کو تو تم نے بتا دیا کہ موبائل کام نہیں کر رہا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ چلو بہن ہم ہی لے دیتے ہیں۔ تمہاری سالوں کی محنت کا صلہ تمہاری اس مدد کی صورت میں کر دیتے ہیں، جب کوئی آپ کا مہل ہو، ماتحت ہو تو اس کے حالات سے بھی آگاہی رکھنا چاہیے اور مشکل وقت میں بنا اس کے کہ اس کی مدد کر دینا چاہیے مگر ہم سب اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ اگلی کی سفید پوشی کا مجرم رکھنا بھول جاتے ہیں۔ ہم نے باتیں کرنا سیکھ لی ہیں اور عمل کرنا بھول گئے ہیں۔“

نوشین بیچ کر رہی تھی، اس کی ہر بات میرے دل کو لگ رہی تھی، کسا ہو جاتا کہ کوئی میری مدد کے طور پر ہی کھی، مجھے موبائل خرید دیتا۔ آخر میں ان کی غریب ایڈمن تھی، جو اپنا مفت کا وقت اور ٹیلنٹ ان کے لیے صرف کرتی تھی۔ اس رات میرا دل بڑا برا ہوا تھا۔ میں بس سوچے چلی جا رہی تھی کہ کہاں سے کچھ پیسہ ہاتھ آجائے لیکن پیسہ کہاں اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والی چیز ہے۔

ابھی میرے اس دکھ کو گزرے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ مجھے ایک اچانک نمبر سے میج موصول ہوا۔

”السلام علیکم غبرین! کیسی ہو؟ خیریت ہے نا کہاں عتاب ہوا چانک؟“

میری سم میں یہ نمبر محفوظ نہیں تھا اسی لیے میں نے پوچھ لیا کہ کون ہے۔

جواب موصول ہوا۔

”میں ناعمہ نعیم ہوں۔ اتنے دنوں سے آپ

سے رابطہ نہیں ہو سکا تو مجھے لگا کہ آپ کا موبائل خراب ہو گیا ہے۔ مجھے اپنا ایڈریس بھیجو۔ میں تمہیں نیا موبائل بھجواؤں گی۔“

میں حیران و پریشان منہج کو پڑھتی جا رہی تھی کہ یہ کیسا معجزہ ہو گیا بیٹھے بیٹھے کسی نئی مدد آن پہنچی ہے۔ یہ وہ رائٹرز ہیں جو بہت کم کہتی تھیں اور ان کے بیچ کا کام بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ تین چار ماہ بعد کوئی ایک آدھ افسانہ لگانا ہوتا اور بس۔ نہ کبھی کوئی انسانی پوسٹ میں نے خود سے لگائی، نہ انہوں نے مجھے لگانے کا کہا۔ نجانے میری غیر موجودگی کو انہوں نے کیسے محسوس کر لیا اور خود سے ہی میری مدد پر تیار ہو گئے۔

”میں اب کیا کہوں اس بات پر؟“

میرے پاس واقعی شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

”کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے، بس آپ کی مدد کے لیے اللہ نے دل میں یہ خیال ڈال دیا اور میں نے آپ سے رابطہ کر لیا۔“

میں نے انہیں اپنا ایڈریس بھیج دیا اور دو دن بعد ایک اچھی حالت کا سیکنڈ ہینڈ موبائل میرے ہاتھ میں تھا۔ نوشین اور راہین اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں اور میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔

قارئین! میں یہ سوچ رہی تھی کہ نوشین ٹھیک کہتی تھی، بعض دفعہ ستائش ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ کچھ اور ضرورتیں بھی ہوتی ہیں انسان کی۔ کوئی ہماری بے لوث مدد کرتا ہے تو کیا بدلے میں جب اسے ہماری مدد درکار ہو تو ہمیں اسے ایک طرف کر دینا چاہیے، ہاتھ اٹھا لینا چاہیے؟

بے لوث مدد کرنے والوں کے وسیلے تو اللہ بنا ہی دیتا ہے، چاہے کسی کو بھی کہیں سے بنائے۔ جیسے ناعمہ جی میرا وسیلہ بنیں اور مجھے ان کا وسیلہ بننا تھا اب۔ ان کا بیج الیکٹرونک کر۔

☆☆



القرآن

ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

”کہہ دو آؤ میں تمہیں سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور تنگ دلی کے سبب اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم تمہیں اور انہیں رزق دیں گے اور بے حیائی کے ظاہر اور پوشیدہ کاموں کے قریب نہ جاؤ اور تاق کسی جان کو قتل نہ کرو، جس کا اللہ نے حرام کیا ہے (اللہ) تمہیں یہ حکم دیتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ اور سوائے کسی بہتر طریقہ کے عقیقہ کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچے اور ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو۔ ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے اور جب بات کو تول انصاف سے کہو اگرچہ رشتہ داری ہو اور اللہ کا عہد پورا کرو (اللہ) تمہیں یہ حکم دیتا تاکہ تم صحت حاصل کرو۔“

(سورہ الانعام 151-152)

احادیث نبوی ﷺ

☆ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ ”تم جانتے ہو کہ مفلس کسے کہتے ہیں؟“ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! مفلس تو وہی ہے جس کے پاس پیسہ نہ ہو، نہ ہی کوئی سامان ہو۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ جیسی نیکیاں لے کر حاضر ہوگا لیکن (اس نے) کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کو قتل کیا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا لہذا اس کی نیکیاں مختلف

لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں گی اگر اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور مظلوموں کے حقوق باقی رہ گئے تو ہجران کے گناہ اس (شخص) کے حساب میں ڈال دیے جائیں گے اور اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

(صحیح مسلم)

☆ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو شخص ظالم کے ساتھ اس کی مدد کے لیے چلتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ ظالم بے حق ہے (مشکوٰۃ شریف)۔“

شہر کی ویرانی کا باعث

خلفہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ کے کسی حاکم نے اپنے شہر کی ویرانی کا شکایت نامہ بھیجا اور امیر المومنین سے اس کو آباد کرنے کے لیے مال طلب کیا۔ امیر المومنین نے اس کو جواب میں لکھا: ”جب تم میرا خط پڑھو تو اپنے شہر کو عدل و انصاف کے ذریعے محفوظ کرو اور شہر کے راستوں سے ظلم و زیادتی ختم کرو کیونکہ ظلم و زیادتی ہی شہر کی ویرانی کا باعث ہے۔“

نیک مردوں کی تواضع

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ بتاتے ہیں کہ میں نے سن رکھا تھا کہ کسی حق پرست کا گریبان مست شریفی نے پکڑا اور منہ پر طمانچے بھی مارے۔ اس سیاہ باطن شخص کے اس عمل پر اس صاف باطن حق پرست درویش نے طمانچے کھا کر بھی صبر سے کام لیا اور اسے کچھ نہ کہا۔ اس پر کسی نے اس حق پرست سے کہا کہ آخر آپ بھی تو مرد ہیں، اس بدتیر کی حرکت پر آپ کیوں عمل اور برداشت کیے ہوئے ہیں۔ پاکیزہ مفت شخص نے یہ بات سن کر جواب دیا کہ اس قسم کی بات مجھ سے نہ کریں۔ نادان مست، بہادر مرد کا گریبان پھاڑ دیتا ہے بلکہ وہ تو شیر کے ساتھ بھی جنگ کرنے کی سوچتا ہے اور کسی عقل مند آدمی کی

طرف سے وہ مطمئن ہے کہ وہ نادان مست سے دست بہ گریبان ہونا پسند نہیں کرتا۔ ہنرمند تو اس طرح زندگی گزارتا ہے کہ وہ ظلم سمجھ کر بھی مہربانی کرتا ہے۔

انداز بیباں اور

☆ جس چیز کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو، اسے کہیں اور سے نقصان پہنچانے کی ضرورت نہیں۔

☆ ہمارے ہاں سب سے مضبوط وزیر اعظم، گارنٹی ہوتی ہے۔ اس کے پاس تین ماہ کی

☆ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہے اور ایک کامیاب عورت کے پیچھے بہت سے مرد۔

☆ کامیاب شجر وہ ہے، جو کلاس کو بھی نہ پڑھائے اور طلبہ بھی مطمئن ہو جائیں۔

(عطا اللہ عالی..... تحفہ ریزیاں)

☆ فو زیہ شربت..... ہجرات

☆ سلطان باجوہ

☆ الف اللہ جسے دی ہوئی من و وج مرشد لاندہ ہو جن گت ائے سوہنا راضی او ہو گت کھاندہ ہو ہر دم بار رکھے ہر ویلے سوہنا اٹھایا ہندہ ہو آپ کچھ بھیند ابا ہو ”آپ“ آپے بن جاندا ہو

☆ اقر امتاز..... سرگودھا

☆ پاکستانی

☆ پاکستانیوں کی جنت کا انچارج فرشتہ پریشان تھا۔ دوسرے فرشتوں نے کہا: ”ہمیں معلوم ہے کہ پاکستانیوں نے کچھ نہ کچھ عجیب کر دیا ہوگا لیکن پھر بھی گیا کر دیا انہوں نے؟“

☆ فرشتہ بولا: ”دودھ کی نہر میں پتی ڈال کر بیٹھے ہیں۔“

☆ اقر اسرور..... ڈی جی خان

☆ لہجہ کا اثر

☆ ایک مرتبہ ایک تاجر جنگل سے گزرا اور حضرت بہلول دانا جنگل میں تسبیح میں مشغول تھے۔ تاجر نے گھوڑے سے اتر کر سلام کیا اور کہا: ”جناب مشورہ دیں کیا تجارت کروں تو منافع ہوگا؟“

☆ حضرت بہلول نے کہا: ”کالا کپڑا خرید لو۔“

☆ تاجر نے شکر یہ ادا کیا اور چلا گیا۔ شہر کا سارا کالا کپڑا اس تاجر نے خرید لیا۔ اتفاق سے چند دن بعد وہاں کا بادشاہ مر گیا۔ پورا شہر کالا کپڑا خریدنے کے لیے تاجر کے پاس پہنچ گیا، اسے اس قدر منافع ہوا کہ وہ شہر کے امراء میں شامل ہو گیا۔

☆ وہ شہر سے گزرا تو پھر سے حضرت بہلول کو دیکھا اور وہیں سے آواز دے کر کہا: ”اؤنے دیوانے اب کیا لوں۔“

☆ آپ نے کہا: ”تربوز لے لو۔“

☆ اس تاجر نے اب کی بار شہر کے علاوہ ارد گرد کے علاقوں سے ساری جمع پونجی کے تربوز لے لیے جو چند بعد خراب ہو گئے۔ وہ حضرت بہلول کے پاس گیا اور کہا: ”یہ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا؟“

☆ حضرت بہلول نے کہا: ”میرے مشورے نے نہیں، تمہارے لہجے نے تمہیں برباد کیا۔ تم نے احترام سے پوچھا تو منافع ہوا، جب حقیر جان کے پوچھا تو تباہ ہو گئے۔“

☆ سیدہ لوباسجاد..... کھروڑ پکا

☆ اصلاح نفس کے چار اصول

1- مشارطہ: کہ اپنے نفس کے ساتھ ”شرط“ لگانا کہ ”گناہ نہیں کروں گا۔“

2- مراقبہ: کہ آیا ”گناہ تو نہیں کیا ہے۔“

3- محاسبہ: کہ اپنا حساب کرے کہ کتنے ”گناہ“ کیے اور کتنی ”نیکیاں“ کیں۔“

4- مواخذہ: کہ ”نفس“ نے دن میں جو ”نافرمانیاں“ کی ہیں اس کو ان کی ”سزا“ دینا اور وہ سزا یہ ہے کہ اس پر ”عبادت“ کا بوجھ ڈالے۔

☆ عدل و انصاف کی اہمیت

☆ عظیم چینی فلسفی ”کنفیوشس“ سے کسی نے



صائمہ سحرہ کی ڈائری میں تحریر

تفصیل کیا باتوں کی کہ کیا کر رہا ہوں میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، بڑا کر رہا ہوں میں

کوئی عجیب نہیں جو اٹھالیں ستم سے ہاتھ اپنے ستم گروں کو خفا کر رہا ہوں میں

دنیا سے میرا ایک تعلق ہے آج بھی وہ دوش دے رہی ہے دعا کر رہا ہوں میں

اعجاز دیکھ دہر کے فکار خاتے میں اپنی ہر ایک بات سنایا کر رہا ہوں میں

ہر لمحہ نشاط یہ کہتے گزر گیا انور شعور! تجھ سے بڑا کر رہا ہوں میں

ماریاہ نذیر کی ڈائری میں تحریر

مری لے لے وہ اٹلائیں گے کیا جو دے نہیں ہیں وہ گائیں گے کیا

خزاں میں نہ آیا تڑپا جنہیں بہاروں میں وہ مسکرائیں گے کیا

جنہیں جوٹ دل کی لگی ہی نہیں مراد دل آزمائیں گے کیا

نکبت ڈارہ کی ڈائری میں تحریر
منظر مہربانی کی غزل
جب سے باطن میں سفر کرنے لگے
اپنے سامنے سے بھی ہم ڈرنے لگے

اس نے پل بانہ سے روانی روک دی
پتھروں میں ہم جو گھر کرنے لگے

دل لگی میں کہہ دیا تھابے وفا
آپ تو آج بھی ہی تر کرنے لگے

دیکھ کر وہ موتیوں جیسی ہنسی
بجلیوں کے تافے ڈرنے لگے

فوج ڈلے پھر تمہاری ناکھنے
کچھ ہمارے زخم جب بھرنے لگے

آپ کا دامن ہے بالکل پاک ماف
آئینہ ہے آپ کیوں ڈرنے لگے

گلشن چوہدری کی ڈائری میں تحریر
صائمہ خیری کی نظم

دلہن،

نئی نویلی ایک خوشبو
آج ہوا میں آتی ہے

روپ ٹکری جیم جیم برکھا
سانسوں کو نہلاتی ہے

نرم ہولے بائیں کر کے
کوئی لک لہراتی ہے

دیکھ سہلی
پیری جیزی
رنگ بدلتی جاتی ہے

سائنس پر احسانات“ رٹانے میں صرف کیا جاتا ہے،
اس کا دواں حصہ بھی بچوں کو سائنس پڑھانے میں
صرف کیا جائے تو مسلمانوں پر بڑا احسان ہوگا۔

○ یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ درحقیقت زندگی
اور موت میں کوئی فرق نہیں، کم از کم ایشیا میں۔
○ پولیس اگر دل سے چاہے تو تمام اچھی اچھی
کتابوں کو قس قرار دے کر نو جوانوں میں اردو ادب

سے گہری دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔
○ دوزخ میں گناہ کاروں کو اپنے چاہے
سالن زیر دقت کھلانے جائیں گے۔
○ بعض مردوں کو عشق میں محض اس لیے صدمے

اور ذہنی اٹھانی پڑتی ہیں کہ ”محبت اندھی ہوتی ہے“ کا
مطلب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت بھی اندھی ہوتی ہے۔
(ایشال فاطمہ..... کراچی)

جانوروں کے بڑے کام
○ چوٹی: ایک چوٹی نے حضرت سلیمان علیہ
السلام کی فوج کا رخ بدل دیا تھا۔

○ ہاشمی: ایک ہاشمی نے خانہ کعبہ کو گرانے سے
انکار کر دیا تھا۔
○ سوا: ایک سوا جس نے انسان کو دفنانے کا

طریقہ سکھایا۔
○ ہمد: ایک ہمد پوری قوم کے مسلمان
ہونے کا سبب بن گیا تھا۔
○ مارینہ نذیر..... بھائیاں نوالہ

چلو جاؤ نہیں ملتے
○ کہو اب کیا پانہ ہے
بلا کا زخم ہے تم کو
چلو جاؤ نہیں ملتے
تمہارے سبب نہیں ملتے
ذرا اب جی کے دکھلاؤ

(سہاس گل)
صائمہ سحرہ..... فیصل آباد

پوچھا کہ اگر ایک قوم کے پاس تین چیزیں انصاف،
دفاع معیشت ہوں اور کسی مجبوری کی وجہ سے کسی چیز کو
ترک کرنا پڑے تو کس چیز کو ترک کیا جائے؟“

کنفیوٹس نے جواب دیا۔ ”دفاع کو ترک کر دو۔“
سوال کرنے والے نے پھر پوچھا۔ ”اگر باقی
باندہ چیزوں، انصاف اور معیشت میں سے ایک کو
ترک کرنا لازمی ہو تو کیا کیا جائے؟“

کنفیوٹس نے جواب دیا۔ ”معیشت کو چھوڑ دو۔“
اس پر سوال کرنے والے نے حیرت سے کہا۔
”معیشت اور دفاع کو ترک کیا تو قوم بھوکوں مر جائے
گی اور دشمن حملہ کر دیں گے؟“

تب کنفیوٹس نے جواب دیا۔ ”نہیں۔ ایسا
نہیں ہوگا بلکہ ایسا ہوگا کہ انصاف کی وجہ سے اس قوم کو
اپنی حکومت پر اعتماد ہوگا اور لوگ معیشت اور دفاع کا
حل اس طرح کریں گے کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر دشمن
کا راستہ روک لیں گے۔“

صائمہ مشتاق..... بھائیاں نوالہ

موتی مالا
○ دولت دنیا کی ہو یا ایمان، جتنی بڑھتی جائے
گی اتنی نیند کم ہوتی جائے گی۔

(الفراتی)
○ یہ جو تمہارا نفس ہے تم اگر اسے خیر میں
مصروف نہیں کر لیتے تو یہ تمہیں شرم میں مصروف کر لے
گا (امام شافعی)۔

○ اپنے حصے کا کام کیے بغیر دعا پر بھروسہ کرنا
حماقت ہے اور اپنی محنت پر بھروسہ کر کے دعا سے گریز
کرنا تکبر ہے (شیخ سعدی)۔

○ حکومت اور عورت کی محبت کا چھوڑنا صبر
سے زیادہ کڑوا ہے (حضرت سفیان ثوری)
حورالعین اقبال..... کراچی

مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں.....
○ جتنا وقت اور روپیہ بچوں کو ”مسلمانوں کے

لکھا۔ عندلیب زہرا کا "احساس برتری" حقیقت کے قریب لگا۔ نادیا خان بلوچ نے کہا لکھ دیا آپ نے.....! "ماران مارنگ" اینڈ میں تو ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی۔ جب امی کے بال جلے۔ ایسی ہلکی چٹکی مزاحیہ تحریر ہر مہینے ایک دو ہونی چاہئیں تاکہ تھوڑا سا ذہن فریش ہو۔ سلسلہ تمام ایچھے تھے۔

ن: ثناء! آپ نے کرن کی کہانیوں پر بھرپور تبصرہ کیا ہے، پسند کرنے کا بے حد شکر ہے۔

ماہا بشیر حسین..... ڈنگ

دو ماہ سے خط نہیں لکھا تو اچھا نہیں لگا اس لیے فوراً سوچ لیا کہ اس ماہ لازمی خط لکھنا (آپ نے تو ہمیں یاد بھی نہیں کیا ہوگا؟) ایک تو رسالہ ملتا بہت لیٹ ہے پلیز دس تک تو بھیج دیا کریں! خیر ٹائیکل ذرا پسند نہیں آیا۔ مجھے برائیڈل ٹائیکل پسند ہیں۔ "ہوا میں رخ بدل گئیں" اور "شب نیم کی سحر" دونوں رسائز نے قسط ہمیشہ کی طرح لکھی۔ "ساگر کنارے" ام طیفور نے تیسری قسط بھی لا جواب لکھی۔ "محبت کیسا گر" از قرۃ العین خرم کا ناول بھی پسند آیا۔ "شام رنگ سیاہ" انیل رضا لگتا ہے طویل ناولٹ لکھ رہی ہیں پراچھا لکھ رہی ہیں۔ "آس گلی" فضا محسن کا کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ "صرف تم" انعم خان نے بھی اچھا ہی لکھا اس دفعہ افسانوں کی تعداد دیکھ کر دل ہی خوش ہو گیا۔ پر کسی ایک کا نام لینا نا انصافی ہوگی کیونکہ سب نے اچھا اور سبق آموز لکھا۔ کرن کتاب ہر دفعہ کی طرح جان دار، شاندار رہی بس بڑی اور پھل والا سلسلہ رنگ تھا.....؟

ن: ماہا بشیر حسین! آپ نے کیسے کہہ دیا کہ ہم نے آپ کی غیر موجودگی محسوس نہیں کی ہوگی۔ ہم تو ان قارئین کی کمی محسوس کرتے ہیں جو کبھی "نامے میرے نام" کی محفل میں شریک نہیں ہوتیں۔

ثناء شہزاد..... کراچی

سال نو کا کرن 14 تاریخ کی صبح مجھے بھائی نے لا کر دیا۔ "www.urdu tubes.com" دے جاتے ہیں۔ سرورق پسند آیا۔ "حمد و نعت" کے بعد ادارہ پر صحتی ہوں۔ پیاد انشاء میں محمد جعفری کے قلم سے لکھا "رو میں ہے رخش عمر" پڑھا۔ شاہین رشید کا کیا ہوا سروے پڑھا، سب کے جواب اچھے تھے۔ شیف مہوش اختر سے ملنا اچھا لگا۔ آگے جان کر "کرن تعبیر" کی سنی۔ "مقابلہ ہے آئینہ" میں فہیم عثمان سے ملے۔ اس کے بعد پیچھے گت عبداللہ کے ناول "ہوا میں رخ بدل گئیں" پر وہاں جا کر انکشاف ہوا کہ یہ کیالی بی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئی گئیں۔ شہرہ نہ کہ عمرہ کو جھین لیا اس نے۔ ناول کی اسپینڈ تھوڑی بڑھا دیں۔

"شام رنگ سیاہ" کا تو جواب ہی نہیں انیل رضا کا خوب لکھ رہی ہیں۔ سنی اور روبیکا کی محبت..... کیا دنیا میں ایسی محبت ہوتی ہے جسٹن لگتا ہے کہ اب مشکل میں پھنس جائے گی۔ صدف آصف لکھیں اور وہ اچھا نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کے قلم سے لکھی ہر تحریر مجھے اچھی لگتی ہے جیسے "چمکتا آسان"۔ "آس گلی" فضا محسن نے اچھا لکھا مگر اینڈ میں عالی کی موت نے رلا دیا۔ نظیر فاطمہ کا افسانہ "راز" تھوڑا دل دکھا گیا۔ شمع ملک کی تحریر "تعویذ" نام کی طرح منفرد تھی۔ ہر رشتے میں اعتدال ہونا ضروری ہے ورنہ رشتے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ انعم خان "صرف تم" بہت زبردست لکھا۔ حنا اشرف کی "خوشیوں کی بہار" تو چھا گئی کس خوب صورتی سے حدیفہ بھانجے نے ماموں کا کیس لڑا۔ قرۃ العین کا "محبت کیسا گر" بہت بہت شاندار لکھا۔

کیپٹن شہریار کا کردار اچھا لگا۔ منزل سلیم نے بس ٹھیک

مدرسہ خجورہ دہری کی ڈائری میں تحریر احمد فراز کی غزل
اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سونے سے ہونے چھول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈا جڑے ہوئے، لوگوں میں وفائے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

تو خدا ہے نہ میرا اصل
دونوں انسان ہیں تو کیوں اتنے جگہوں میں ملیں

عز دنیا بھی غم یاد میں شامل کر لو
نظر بڑھتا ہے اکشایں جو شربلوں میں ملیں

اب نہ وہ میں ہوں، نہ تُو ہے نہ وہ ماضی ہے فلز
جیسے دوسلے تیرا کے سراپوں میں ملیں

عظمتی چوہدری، کی ڈائری میں تحریر
میر نیسانی کی غزل
تھکن سے راہ میں چلنا محال بھی ہے مجھے
کمال پر بھی تھا میں ہی، ذوال بھی ہے مجھے

سڑک پر چلتے ہوئے رک کے دیکھتا ہوں میں
بہیں کہیں ہے تو، یہ احتمال بھی ہے مجھے

یہ میرے گرد تماشا ہے آنکھ کھلے تک
میں خواب میں تو ہوں لیکن خیال بھی ہے مجھے

اسی کے لطف سے مرنے سے خوف آتا ہے
اسی کے ڈب سے یہ جینا محال ہے مجھے

سواد شام سفر ہے جلا جلا سا میٹر
خوشی کے ساتھ عجیب سا ملال بھی ہے مجھے

ہم اہل وفا ہیں وہ اہل ستم
وہ ہم سے نگاہیں ملائیں گے کیا

محبت ہی جب درمیاں میں نہیں
وہ روئیں گے کیا ہم منائیں گے کیا

اگر ہم نہ دیں، اپنا خون جگر
وہ ہاتھوں میں مہندی لگائیں گے کیا

سیدہ لویا سجادہ کی ڈائری میں تحریر
فیصل شغائی کی غزل
تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں لیے تو حالات میں
ایک ذرا سادہ لوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

کسی کو خبر تھی، سانولے دلدلی بن رہے اُڑتے ہیں
ساون آیا لیکن اپنی قسمت میں برسات نہیں

لوٹ لیا جب دل تو بھر رہے سانس کا نڈکے کا معنی
گو رنج رہی ہے کیوں شہنائی جب کوئی بالائے نہیں

ہم نے انڈیا ہے میں تجھ کو اپنا سامتی کیوں سمجھوں
تو کھیر تو ہے میرا تو سایہ بھی میرے ساتھ نہیں

بانا بیچوں میں عورت اک بار محبت کرتی ہے
لیکن مجھ کو یہ تو بتا دے کیا تو عورت ذات نہیں

ختم ہوا میرا فسانہ اب یہ آنسو پیچھے بھی لو
جس میں کوئی تار جھلکے آج کی رات وہ رات نہیں

میرے ٹنگی ہونے پر اجاب ہیں لوں حیران قتل
جیسے میں پتھر ہوں میرے سینے میں جذبات نہیں

تبسم بشیر حسین..... ڈنگہ

2019ء کا پہلا شمارہ کافی چکر لگانے کے بعد موصول ہوا۔ ٹائٹل بس اوکے ہی تھا۔ اس کے بعد ”اداریہ“ پڑھا ابن انشا کے لیے دعائے مغفرت کی۔ ”حمد و نعت“ دونوں زبردست رہیں۔ ”نیا سال آج اور کل“ میں سب کے جوابات تقریباً ایک سے تھے ہاں عزیزہ سید کی تصویر دیکھ کر اچھا لگا۔ مہوش اختر سے ملاقات سوسو رہی۔ ”میری بھی سنیے“ میں اپنی فیورٹ کرن تعمیر کی سنی، اچھا لگا ل کر۔ ”مقابل ہے آئینہ“ میں سفینہ عثمان کے جوابات پسند آئے۔ ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ اب تو کافی حد بدل گئی ہیں، ناول انٹرٹیننگ ہو رہا ہے۔ محبت جی میں آپ کی سب سے بڑی فین ہوں اور آپ کی ہر تحریر مجھے پسند ہے! ”محبت کیسا گر“ قرۃ العین نے زبردست لکھا۔ ”آس گلی“ بانی فیورٹ منشا حسن کا ناولت پسند آیا۔ ہمیشہ ہی اچھا لگتی ہیں۔ ”صرف تم“ انعم خان کی تحریر بھی لا جواب تھی۔ صدف آصف کو واپس دیکھ بہت اچھا لگا بانی سب نے بھی لا جواب لکھا۔ ”کرن کتاب“ ہمیشہ کی طرح لا جواب رہی۔ شاہ شہزاد و سلیم بیک! اب ہر ماہ خط لکھنا تمہاری کمی بہت محسوس ہوئی۔ ”فوزیہ شر“ آپ کا تبصرہ بہت زبردست ہوتا ہے کاش میں بھی ایسا تبصرہ کر پاتی! اوکے جی بائے بائے اگلے ماہ ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔

ج: تبسم بشیر! کرن پر اپنی رائے کا اظہار کرنے کا بہت شکریہ۔

صائمہ مشتاق..... بھاگنا نوالہ

اس دفعہ کرن 22 کو ملاوہ بھی اقراء ممتاز کی وجہ سے کرن میں ٹائٹل گرل مسکراتی ہوئی اچھی لگ رہی تھی۔ ”حمد اور نعت“ پڑھی اس کے بعد کول رضوی سے ملاقات اچھی لگی۔ میرا جیٹھی کی بھی سنی۔ ”آواز کی دنیا سے“ فرخ کاٹھی سے ملاقات اچھی لگی۔ ”مقابل ہے آئینہ“ میں شائستہ یاسمین کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ ام طیفور کا ”ساگر کنارے“ دوسری قسط بھی جاندار رہی۔ اب پتا نہیں مومنہ سا لک کی ہوئی ہے کہ مومن کی لگ تو یہی رہا ہے کہ مومن کی ہو جائے گی۔ دادا اور مومن کی ٹوک جھوک

اچھی لگتی ہے ام طیفور بیسٹ آف لک۔ ”عشق ہو“ نادیہ احمد کا مکمل ناول بہت بہت پسند آیا۔ آخر قاسم انمول کے انمول جذبوں کو جان ہی گیا۔ ویسے بھی زندگی میں بیویوں اور دولت سے زیادہ شوہر کی توجہ ضروری ہوتی ہے دوسری جانب علی اور سامیہ کو بھی ملا دیا۔ عروسہ احمد کا افسانہ ”پھر ہوا یوں“ سبق آموز افسانہ تھا۔ باقی کرن ابھی پڑھائیں اچھا جی پھر ملاقات ہوگی۔

ج: صائمہ مشتاق! آپ کا خطا ہمیں دیر سے موصول ہوا۔ کہانیوں کو پسند کرنے کا بہت شکر ہے۔

عبادت شاہ، مومنہ شاہ، نور شاہ..... کرک کرک کرن پر سرورق خوب صورت لگایا کریں آپ نے کبھی صبا قمر کی تصویر نہیں لگائی۔ ماڈل کے ناخن بہت خوب صورت تھے کرن اتھ میں آتا ہے تو بس ہم سب کی لڑائی ہوتی ہے کہ کون پہلے پڑھے۔ مومنہ رخ آپی کا ناول پہلے پڑھتی ہے، نور نگہت عبداللہ کا اور میں انیل رضا کا۔ بانی سب ہم مل کر پڑھتے ہیں ہم سب کزنز ہیں ”شام رنگ سیاہ“ نین دل دل میں گر رہی ہے مگر اسے آگے میدان مل جائے گا ”صرف تم“ انعم خان نے متاثر نہیں کیا ”آس گلی“ لفظوں کی جادوگر منشا حسن علی اتنا اداس کیوں تھی میں عالی کی موت نے رلا یا ”محبت کیسا گر“ ٹھیک رہی گڈی اور گڈو نام پڑھ کر ہنسی آئی فنی اسٹوری تھی اور افسانوں میں تعویذ، نازو، غبار راہ پسند آئے، ساگر کنارے سا لک اور ابرن یا سا لک اور ماحور..... بہت پیاری کہانی ہے۔ آپ نے افسانے اور ایک ناول بھیجا ہے بتا دیجیے گا۔

ج: عبادت شاہ! کرن کو پسند کرنے کا شکریہ۔ اپنی کہانی کے متعلق فون کر کے معلوم کیجیے۔

زاہدہ اقبال..... شادیال ضلع گجرات

میں آپ کی محفل میں شامل ہونے کی جرات پہلی بار کر رہی ہوں۔ سیونٹھ میں 1987ء سے کرن پڑھ رہی ہوں۔ پھر پیاری کی وجہ سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ عدم تحفظ کا شکار ہو گئی تھی۔ مثلاً کالے کپڑے کا لا جوتا پہننا چھوڑ دیا تھا۔ قرآن مجید پڑھاتے وقت صبح امی، ابو کے اور اپنے کپڑے کھوٹی سے اتار کر نیچے پھینک دیتی تھی۔ چلو خیر

چھوڑیں وہ مشکل وقت بیت گیا میں خواتین ڈائجسٹ میں پڑھتی تھی۔ 2017ء جنوری کا کرن، پچھلے سال مئی کا اور اب نومبر سے متواتر تیسرا کرن پڑھ رہی ہوں، کرن بہت معیاری ڈائجسٹ ہے۔ اس میں سب کچھ پڑھنے کو ملتا ہے اس کی خاص انفرادیت یہ کہ اس کی ساری کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ماڈل نے سال کو خوش آمدید کرتے ہوئے بہت پیاری لگ رہی تھی سب سے پہلے ”حمد اور نور“ پڑھا۔

ج: زاہدہ اقبال! آپ کا خطا ہمیں دیر سے موصول ہوا۔ کہانیوں کو پسند کرنے کا بہت شکر ہے۔

انہی انشاء جیسے نایاب لوگ یہ دنیا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم اللہ کے فضلے کے آگے کھڑے نہیں ہیں۔ سال نومبر میں مختلف شخصیات سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میرے پاس نی دی نہیں ہے۔ بیچ دیا ہوا ہے، کرن میں ٹیلی وژن کے اداکار اور اداکارہ کے بارے میں جگ لگ جاتا ہے کہ یہ کون ایکٹر ہے اور وہ کون ہے اور یہ کون ایکٹرس ہے۔ میری باتیں آپ کو عجیب لگتی ہوں گی۔ ہا ہا ہا ہا شیف سے دلچسپی نہیں ہے۔

تجھے دیکھا تو یہ خیال آنا زندگی خوب تم گھٹا سا یہ گھٹ کر عبد اللہ کا ناول ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ بہت بہتر ہے۔ روح چوہدری کا ناول ”شب نم کی کھڑ“ دلچسپ ہے ”ساگر کنارے“ ام طیفور کا نام ہی کافی ہے۔

یہ ناول گھر کیلئے مسائل کے دو چار سیاست اور مزاج سے بھر پور ہے دادا ابا اور مومن تراب کی باتیں اور حرکتیں بہت مزاد جی ہیں۔ یاد آیا ”میری بھی سنیے“ کرن تعمیر کی باتیں سن کر بہت لطف اندوز ہوئی، ناولت ”شام رنگ سیاہ“ انیل رضائی مناسق اور سفاک لوگوں پر اور بھیا تک بڑا کم کر لیں جیسے اسٹیلنگ، بختہ خوری، چوری، چکاری، کرک کرک پر بہت خوب لکھ رہی ہیں۔ سین بہت دلچسپ، مجبور اور شدید مسائل کا شکار ہے۔ اس دنیا میں چچا ریکس اور سین کی تانی اور رشید جیسے خالم۔ سفاک اور خود غرض انسان رہتے ہیں۔ تانی نے سین کو طلاق دلا دی ہے جس رشید نے بھی اپنی ماں کے کہنے پر طلاق دے دی۔ پچا ریکس نے بھی اپنا ہو کر جائیداد کی خاطر پورا۔ ہا پورا خاندان قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ توبہ توبہ مکمل

ناول ”محبت کیسا گر“ بہت اچھا تھا۔ ناولت ”آس گلی“ بہت زبردست تھا۔ ”صرف تم“ ٹھیک تھا۔ سادہ سی تحریر تھی۔ افسانہ ”خوشیوں کی بہار“ میں بتایا گیا ہے کہ کسی کی باتوں میں نہیں آتا جیسے سوچ بچھ کر کسی کے بارے میں رائے رکھنی چاہیے۔ ”راز“ سبق آموز افسانہ تھا۔ ”نازو“ ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ دینو چاچا اور فیصل بابا بابا۔ ”ماران مارنگ“ بھی مزاحیہ تھا۔ بابا ”غبار راہ“ راشدہ رفعت کی عمدہ تحریر تھی۔ واقعی انسان چڑھتے سورج کے پجاری ہیں۔ ”احساس برتری“ بھی سبق آموز تھا۔ سارے شعر اچھے تھے۔ مسکراتی کرنوں نے اتنا نہیں ہنسیا۔ ”کرن کرن خوشبو“ سے مستفید ہوئی۔ باغبانی میں گھر کے مختلف جگہوں کے ڈیزائن بہت خوب صورت تھے۔ ”یادوں کے درختے“ سے سلیم کوثر کی غزل بہت پسند آئی۔ فوزیہ شر بٹ گڈ ”پن اور آپ“ میں میری باری کب آئے گی۔

ج: زاہدہ اقبال! خوش آمدید ”ناے میرے نام“ کی محفل میں اللہ کا شکر ہے کہ اب آپ بہتر ہیں ہم اور ہمارا پورا ادارہ آپ کی محنت بانی کے لیے دعا گو ہے۔ امید ہے کہ اب آئندہ بھی کرن کی کہانیوں پر اپنی رائے کا اظہار کریں گی۔

اقراء ممتاز..... سرگودھا

اس دفعہ کا ٹائٹل سوسوی لگ رہا تھا۔ مہوش اختر سے ملاقات کی۔ میری بھی سنیے میں ”کرن تعمیر“ کا انٹرویو پڑھا۔ کرن تعمیر کا اتنی دفعہ انٹرویو پڑھ چکے ہیں کہ اب ان کا انٹرویو پڑھنے کو دل ہی نہیں کرتا۔ (معذرت کے ساتھ)

”مقابل ہے آئینہ“ میں سفینہ عثمان کے جوابات بس ٹھیک ہی تھے۔

”ہوائیں رخ بدل گئیں“ اب کہانی میں نوٹس آیا ہے۔ اس دفعہ کی قسط دھماکا خیز تھی۔ کیا شہینہ برداشت کر پائے گی۔ حزمہ کی شادی ربیکا تم کیا چیز ہو۔ شادیاں تو تمہاری دوہی ہوں گی ایک حزمہ سے دوسری حسن شیروانی سے۔ بہر حال یہ قسط بہت بہت پرہٹ تھی۔ حزمہ کے لیے بھی یہ سب کرنا کہاں آسان ہے۔ ایک طرف محبت



کرن تکیلا

<https://www.urdutubes.com/>

دوسری طرف بہن کی عزت۔
 ”شب کی سحر“ ربیکا اور ٹی پر اتنا غصہ آتا ہے۔
 فرجاد اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ اب مبینہ کے بچوں کو بھی
 منظر عام پر لے ہی آئیں۔
 ”ساگر کنارے“ مومن تم ہر دفعہ فرشتہ صفت انسان
 بن کر مامور کو بچانے آ ہی جاتے ہو۔ یہ نامہ ماحور کی ماں
 ہے۔ مومن اور اس کے دادا کو تو چھوٹا فنانسنگ ہونی
 ہے۔ سالک کو ابرش تک ہی محدود رکھیے ماحور سے دور
 رکھیں۔ عقل مغل تمہیں تو خدا ہی پناہ دے۔
 ”محبت کیسا گڑ“ کمال اسٹوری بھی۔ گڈ و ماموں اور
 گڈی ممانی دونوں کی کمال کی شخصیت تھی۔ دونوں ہی
 اپنے اپنے خول میں سٹے ہوئے تھے۔ حریم اور شہریار کی
 باتیں کیا کمال کی تھیں۔ امرودور نے والا سین ہنس ہنس کر
 لوٹ پوٹ ہو گئے۔
 ”شام رنگ سیاہ“ اس دفعہ کی قسط شاندار تھی۔ سین
 اب غلط راستوں پر گامزن ہو رہی ہے۔ عیسیٰ کے بھائیوں
 نے اس کے ساتھ برائیاں اور وہ بھی آخر کار اپنے انجام کو پہنچ
 گئے۔ ربیکا اور عیسیٰ کی اسٹوری تو بہت سیڑھی۔
 ”صرف تم“ انیم خان کی اچھی کاوش تھی۔ شکر ہے
 رانیہ نے بروقت فیصلہ کر کے اپنی خوشیاں حاصل کر ہی
 لیں۔ دنیا میں ابھی بھی مخلص لوگ ہیں جیسے تینورنہ
 پھوپھو اور دل نواز جیسے جو دولت کو ہی سب سمجھ نہیں سمجھتے۔
 افسانہ ”خوشیوں کی بہار“ زبردست افسانہ تھا۔

آیا۔ شکر ہے
 شائستہ یاسین..... ہر پہ شہر
 کرن کے تمام اسٹاف کو میرا بھولوانی کی
 خوشبوؤں بھرا سلام۔ ماڈل گرل جنوری میں ہی بہار کی
 جھلک لگی ساگر کنارے، صرف تم، تنویر، خوشیوں کی بہار،
 نازو، شام رنگ سیاہ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک بھی نئے
 موضوع، دل کو چھو لینے والے الفاظ۔
 2018ء میرے لیے اچھا رہا۔ دسمبر میں کرن
 ادارے نے ”مقابل ہے آئینہ“ میں جگہ دی دل خوشی سے
 ہمکنار ہو گیا۔ نئے سال کی ابتدا ہوئی اور اس کے پہلے ماہ
 جنوری میں دنیا نیوز میں میرا کالم شائع ہونا کامیابی کی
 طرف گامزن ہونے کی راہ دکھا گیا۔ اقرامناز کو مقابل
 ہے آئینہ میں میرے جوابات اچھے لگے میری طرف
 سے ان کو شکریہ تبسم بشیر حسین..... آپ کیوں جلیس ہو رہی
 ہو یا لائن میں لگی رہو بھی تو باری آ ہی جائے گی ہو سکتا ہے
 آئینہ کو آپ کے مقابل آتے ہوئے ابھی شرم آ رہی ہو۔
 ہا ہا ہا۔ آخر میں اک گزارش کروں گی کہ دنیا نیوز کے ”تجزیہ
 نگار“ کامران شاہد، کالیفیسی انٹرویو شائع کریں۔ مہربانی
 ہوگی۔ سیدہ لوباجاد کی آمد اچھی لگی باقی سب کو میرا محبت
 بھرا سلام۔
 ج: شائستہ یاسین! آپ کو نامے میرے نام کی
 محفل میں ادارہ کرن کی طرف سے خوش آمدید۔ کہانیوں
 پر تبصرہ کچھ ادھورا سا لگا امید ہے کہ آئندہ بھر پور تبصرہ کریں
 گی۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچادی گئی ہے۔
 ☆☆



ادارہ خاتون و جست کی طرف سے بہن کے لیے عرب صرت ناول

**فصل غم کا
گو شوارہ
رضیہ جمیل**

شکوائے کا پتہ: 300 روپے

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر: 32735021

بیوٹی
بکس

بہنویں خوب صورت تو
چہرہ خوب صورت

جو کدو یا مستطیل چہرے کے لیے
اس قسم کے چہرے کی مالک خواتین کی
Jawline، ان کے چہرے کے واضح ترین نقوش میں
سے ایک ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ایسے چہرے کی مالک



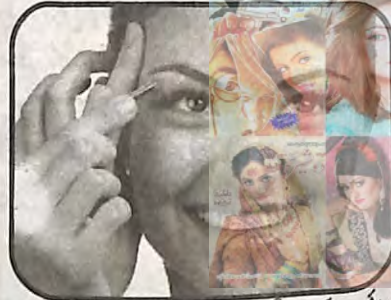
خواتین اپنی آنی برو بھی چوکور شکل میں ترتیب دینے لگیں تو
مکمل طور پر خاتون کا چہرہ اور اس کے نقوش سے سختی ظاہر
ہونے لگے گی۔ ایسی خواتین کو چاہیے کہ وہ گہری اور بھری
بھری آنی برو کو کٹوئی انداز میں ترجیح دے کر بلکہ ایسا انداز
اپنائیں کہ اس میں گولائی کا عنصر نمایاں ہو، اس طرح ان
کا چوکور اور مستطیل چہرہ نرم و نازک نقوش کے ساتھ
و لفریب خوب صورتی کا مالک نظر آئے گا۔ یہ دھیان بھی
رہے کہ آنی برو بہت زیادہ پتل یا بہت زیادہ موٹی نہ ہو۔

دل شکستہ کا چہرہ اور آنی برو کا انداز
ایسا چہرہ جس کی ساخت دل چسپی ہو، بہترین چہرہ
کہلاتا ہے اور اسی لیے ایسے چہرے کو میک اپ کے
ذریعے سجانا سنوارنا، کسی بھی ماہر بیوٹی آرٹسٹ کے لیے
آسان ترین ہے۔ اس کے باوجود اکثر خواتین، جو کہ
اپنے چہرے کی ساخت اور اس کی اہمیت سے واقف نہیں
ہوتیں، غلط آنی برو ڈھپ کے ساتھ، اپنا لگ خود ہی متاثر

خوب صورت بھنویں اور لمبی پللیں بھی حسن میں

https://www.urdutubes.com/
مرتبہ فیشن کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ آج کل
مردمے موٹی اور پٹنی بھنویں پسند کی جاتی ہیں۔ اگر آپ کی
بھنویں پٹنی ہیں اور بالوں کے بڑھنے کی رفتار سست ہے تو
زیتون کا تیل، کدوئی کا تیل، کیسٹر آئل اور سرمہ ہم وزن
لے کر اچھی طرح مکس کر کے ایلو ویرا جیل میں ملا کر
بھنویں اور بالوں پر لگانا آپ کے لیے فائدے مند ہوگا۔
چہرے کی مناسبت سے خوب صورت انداز میں
بھنویں کی تراش خراش کی جائے تو یہ خوب صورتی میں
اضافے کا باعث بنتی ہیں۔

گول چہرے کے لیے
رنگینی اور کٹوئی آنی براؤز اس چہرے پر خوب چلتی
ہیں۔ اوچی اور ترچھی آنی برو، گول چہرے کو خوب صورت



لمبائی عطا کرے گی اور آپ کے چہرے کا ہر نقوش خوبی
سے ظاہر ہو سکے گا۔ اپنی آنی برو کو بھر پور ظاہر کرنے کے
لیے براؤز آنی برو پمپل کا استعمال کیجیے۔ اس طرح
بھنویں کے بالوں کے درمیان موجود خالی جگہ بھر جائے گی
اور آنی برو ز گہری اور بھر پور بھی نظر آنے لگیں گی۔

کرت کتاب

کوہ نور
ہیئر آئلز



کوہ نور آملہ ہیئر آئل

کوہ نور چنبیلی ہیئر آئل

... زندگی سے بھرپور صحت مند بال



کر لیتی ہیں۔ آپ کے لیے بہترین انداز یہ ہے کہ نیچی اور گول آنی برو اپنائی جائے۔ اس انداز کو اپنانے سے ان کی ٹھوڑی بہت زیادہ واضح نہ ہوگی اور چہرے کو ایک نرم اور نازک تاثر ملے گا۔

لمبوتر اچھڑا
ایسے چہرے کی مالک خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنی بھنوں کو کچھ ایسے انداز میں سجانیں کہ ان کے چہرے کی لمبائی مناسب انداز میں واضح ہو سکے لیکن ساتھ ہی چہرہ



نازک اور نین نقش چمکے بھی نظر آئیں گے۔ آپ کے لیے گول آنی برو بہتر انتخاب ہوگا البتہ ان کی لمبائی آنکھوں کے کنارے سے کچھ زیادہ ہونا بہتر ہے۔ کثیر اتنی زیادہ لمبی بھی نہ سمجھ دیجیے کہ آنی برو آنکھوں کے کنارے سے بہت آگے بڑھی ہوئی نظر آنے لگیں اور آنکھوں کی ساخت متاثر ہو جائے۔

دھیان دیکھنے کی باتیں
☆ آنی برو پینل استعمال کرنے کا درست طریقہ

یہ ہے کہ ہلکے کستھی یا سیاہ رنگ کی پینل کھنوں کے دونوں کناروں سے باری باری لگانا شروع کیا جائے اور اختتام درمیان میں ہو۔ اگر پینل کو آنی برو سیٹ کرنے کے لیے درمیان سے لگانا شروع کریں گی تو آپ کی بھنوں کا شیب متاثر ہو سکتا ہے۔

☆ میک اپ مکمل ہونے کے بعد آنی برو برش کی مدد سے بھنوں میں ضرور سیٹ کیجیے۔

☆ اگر آپ کی بھنیں بہت گھنے اور لمبی ہوں گی تو ریتی ہیں اور آپ کے پاس ان کو جانے، سیٹ کرنے کے وقت نہیں تو بس پیرو ویم جیلی کی تھوڑی سی مقدار اس کے کراٹگی کی مدد سے سیٹ کر لینا بھی کافی ہوگا اور آپ کی بھنوں میں مناسب انداز میں سیٹ نظر آنے لگیں گی۔

☆ اکثر خواتین سوال کرتی ہیں کہ بھنوں کو ہونانے کے درمیان کتنا وقفہ ہونا چاہیے۔ بیوٹی ایکسپرٹس کا مشورہ ہے کہ خواتین کو اپنی آنی برو ہر پندرہ دن بعد سیٹ کروالینا چاہیے، البتہ اگر آپ کی آنی برو بڑھنے کی رفتار تیز ہے اور اس کے بال بھی زیادہ گھنے نہیں، تو آپ ہر ایک ماہ بعد یہ کام کروا سکتی ہیں۔

☆ آنی برو ہونانے کے بعد اکثر خواتین ٹھیک اور باریک سرخ دانوں کا سامنا کرتی ہیں، اس صورت حال سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ متاثرہ جگہ پر ایلو ورا جیل لگائیں، یہ جلد کو آرام اور سکون پہنچانے میں مدد دے گا۔



کرت کتاب

بیوٹی باکس..... سوالات جوابات

ماہا شیر حسین..... ڈنگلہ

س: آپنی میرا مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی موسم ہو، میری آنکھوں کے نیچے سے ڈارک سرکل نہیں جاتے ہیں۔ آلو کی قاشیں بھی لگی یا راستہ لیں، پر فائدہ نہیں ہوا۔ کوئی آسان ساحل بتائیں۔ دوسرا مسئلہ میرے بالوں کا ہے جو

لہجائی میں بڑھ رہی ہے، کوئی پیسہ وغیرہ بتادیں؟
ج: آپ آنکھوں کی قاشوں کے بجائے آلودرج ذیل طریقے سے استعمال کیجیے۔ ایک تو چلتے پھرتے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں زیتون کا لٹکا سا تیل لگا کر باہر کی طرف مائل کریں۔ حلقہ بھرنے کی حرکت کرتے ہوئے جانیں گے۔ ایک آلو چھل کر کدو کش کریں اور برف کے پانی میں بھگو دیں۔ اس میں ایک کھانے کا چمچ شہد ملا لیں۔ یہ آلو آنکھوں پر رکھ کر دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پھر اسی پانی میں روٹی بھگو کر صاف کر لیں۔ ہفتے میں تین یا دو بار یہ عمل دہرائیں۔

س: آپنی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر ہلکے ہلکے بال ہیں۔ ماما کہتی ہیں کہ ٹھیک ٹھیک کر لو پر میری جلد بہت حساس ہے اس لیے میں پارلر جانے سے ڈرتی ہوں، کوئی آسان ساحل بتادیں۔
ج: چہرے کے غیر ضروری بال ختم کرنے کے لیے

”بکرے کی سینگ کو جلا کر جو کے آٹے اور تھوڑے سے پانی کے ساتھ کسی پتھر پر گھستے رہیں، اس کو اس وقت اٹھائیں جب غیر ضروری بالوں پر لگنا ہو۔ دو تین گھنٹے بعد جھاڑ لیں۔ یہ عمل کرنے کے بعد عرق گلاب لگائیں۔ یہ عمل ہفتے میں تین بار کریں، چہرے کے غیر ضروری بال ختم ہو جائیں گے۔

بیوٹی دانہ پاؤڈر کورات بھر دودھ میں بھگو کر رکھ دیں پھر اس کا لیس چہرے پر لگا کر ہلکا سا مساج کریں پھر دس منٹ بعد دھو لیں۔

☆ ☆

کرت کتاب

بھی ہوتے ہیں، پلیز ایسا نسخہ بتائیں جو الارجی ختم کر دے اور وہ نسخہ پینے والا ہو، لگانے والا بھی ہو پر پینے والا ضرور ہو اور آپنی جب میں اپرل بنواتی ہوں تو دانے نکل آتے ہیں اور جانے کے بعد اپنے نشان چھوڑتے ہیں جو برے لگتے ہیں۔

ج: آپ سب سے پہلے تو اپنی غذا پر دھیان دیں۔ باہر کی تلی ہوئی مرچ مسالے والی چیزوں سے پرہیز کریں۔ لال مرچ، چاول، بڑا گوشت اور سو فٹ ڈرنکس سے پرہیز کریں۔ پھل اور بریوں کا استعمال زیادہ کریں اور درج ذیل نسخہ استعمال کریں۔

چرائے نیپالی تین گرام، شامبرہ تین گرام، عتاب پانچ دانے، سر پھوکا تین گرام، گل منڈی تین گرام، عشب مغربی تین گرام، رات کو نیم گرم پانی میں بھگو دیں۔ صبح نہار منہ اس کو چھان کر شربت گل نیم میں ایم ایل ملا لیں اور پندرہ دن تک پیئیں۔

تیمم شیر حسین..... ڈنگلہ
س: آپنی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر ہلکے ہلکے بال ہیں۔ ماما کہتی ہیں کہ ٹھیک ٹھیک کر لو پر میری جلد بہت حساس ہے اس لیے میں پارلر جانے سے ڈرتی ہوں، کوئی آسان ساحل بتادیں۔
ج: چہرے کے غیر ضروری بال ختم کرنے کے لیے

”بکرے کی سینگ کو جلا کر جو کے آٹے اور تھوڑے سے پانی کے ساتھ کسی پتھر پر گھستے رہیں، اس کو اس وقت اٹھائیں جب غیر ضروری بالوں پر لگنا ہو۔ دو تین گھنٹے بعد جھاڑ لیں۔ یہ عمل کرنے کے بعد عرق گلاب لگائیں۔ یہ عمل ہفتے میں تین بار کریں، چہرے کے غیر ضروری بال ختم ہو جائیں گے۔

بیوٹی دانہ پاؤڈر کورات بھر دودھ میں بھگو کر رکھ دیں پھر اس کا لیس چہرے پر لگا کر ہلکا سا مساج کریں پھر دس منٹ بعد دھو لیں۔

☆ ☆

روایتوں کے امین سدا بہار زیور

کائنات میں رنگ بکھیرنے والی صنف نازک کے لیے زیور کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ چوہری خواتین کے بناؤ سنگھار کا اہم جزو ہے۔ شادی بہار سمیت کوئی تقریب نہیں جس کے لیے وہ ڈریسر کی مناسبت سے چوہری کا انتخاب نہ کرتی ہوں۔

خواتین کے لیے زیورات کی اسی اہمیت کے پیش نظر چوہری کے نت نئے رجحانات مارکیٹ میں متعارف کروائے جاتے رہتے ہیں لیکن کچھ زیورات سدا بہار ہوتے ہیں۔ دلفریب مہارت کا دلکش نمونہ ہونے کے ساتھ خاندانی روایات بھی ان کے دم سے چمکتی ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ ان کی خوب صورتی ماند نہیں پڑتی بلکہ ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

کیا ہر زیور روایت کا امین قرار دیا جاسکتا ہے، یقیناً نہیں۔ کچھ خاص انداز اور خصوصیات ہی ان کی کلاس چوہری کے درجے پر پہنچتے ہیں اور ان کا نفیس انداز تا خوب ہوتا ہے کہ ان کی معاشرتی اہمیت سے انکار ناممکن ہوتا ہے۔

آئیے! جانتے ہیں وہ کون سے قدیم مغلیہ اور شاہانہ انداز ہیں جو آج بھی اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب ہیں۔

چاند بالی

چاند بالی کا منفرد ڈیزائن راجستھانی ثقافت کا حصہ ہے۔ جسے انیسویں صدی میں متعارف کروایا گیا۔ کچھ چیزیں پرانی ہونے کے باوجود فیشن کا حصہ رہتی ہیں انہیں جب بھی پہنا جائے نئی اور اسٹائلش لگتی ہیں۔



چاند بالی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ مغلوں کے زمانے سے یہ کبھی منظر سے ہٹ نہیں سکی۔ اس کے منظر پر آتے رہتے ہیں۔ اسے نہ صرف ساڑی، انارکلی، فراس، گاؤن، کرتی اور جینز مشرقی اور مغربی لباس کے ساتھ پہنا جاسکتا ہے۔

مینا کاری جھمکا

ماہر ڈیزائنر کے خیال میں جھمکے مشرقی زیورات میں سب سے اسٹائلش زیور ہے۔ ڈیزائنر کا ماننا ہے کہ

خواتین کے چوہری باکس میں جھمکے کے چند منفرد ڈیزائن بھی لازمی ہونا چاہئیں۔ آج کل مینا کاری جھمکے سب سے زیادہ پسند کیے جا رہے ہیں۔



ماتھا پٹی

قدیم زمانے میں ماتھا پٹی شاہی خاندان کی خواتین کا زیور مانا جاتا تھا۔ آج کل ماتھا پٹی، عروسی زیورات کا لازمی حصہ ہے۔ سر پر بھی ماتھا پٹی لہن کو شہزادوں جیسا حسن عطا کرتی ہے۔

معروف اداکاراؤں نے اپنے اہم دن کے لیے ماتھا پٹی پہننا پسند کیا۔ ٹرینڈ کی بات کی جائے تو ڈیزائنر ماتھا پٹی کے لیے کندن اور موتیوں کے علاوہ ڈائمنڈز کا بھی اضافہ کر رہے ہیں۔



موتیوں کے علاوہ ڈائمنڈز کا بھی اضافہ کر رہے ہیں۔

کرن کتاب

مانگ ٹیکا

مانگ ٹیکا لہن کے زیور کا خاص حصہ ہے لیکن آج کا زمانہ تیز رفتار ہے۔ یہاں فیشن کے ساتھ مزاج اور انداز بدل جاتے ہیں۔ جدید فیشن ایسا ہے کہ عام تقریب اور عام دن بھی



<https://www.urdu tubes.com/>

ہیں۔ لائن اور کٹنگ کے لباس کے ساتھ بھی لوکیاں مانگ ٹیکا لگاتی ہیں۔

کمر بند

قدیم شاہی انداز سے سجایا زیور ساڑھی کے ساتھ سب سے اچھا لگتا ہے۔ آج کل عروسی لہنگے اور انارکلی کے ساتھ بیلے لگانے کا رواج ہے، یہ بیلے دراصل کر بند کی فیشن ایبل شکل ہے۔

پازیب

اس کی نزاکت کے کیا کہنے، اس کے کئی انداز مقبول ہیں، مثلاً پائل، ڈنچری، وغیرہ۔ پائل نازک لڑی پر مشتمل ہوتی ہے جبکہ پازیب کا ڈیزائن بھاری بھر کم جزاؤں پر مبنی ہوتا ہے۔ پازیب کا انداز مغلیانہ تہذیب کا حصہ ہے۔



ہاتھ پھول

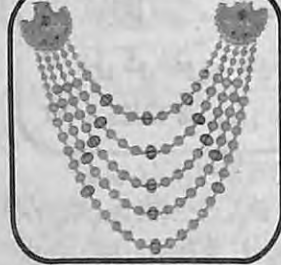
ہاتھ پھول کا مطلب ہے، ”ہاتھ کے لیے پھول“ اسے پچھلا بھی کہتے ہیں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ ہاتھ کی انگلیاں

کرن کتاب

خردلی اور ہاتھ خوب صورت نظر آئیں تو ان کو استعمال کیجیے۔ یہ قدیم زیور آپ کو دلکش رعنائی اور اسٹائل سے سجادے گا۔ شادی بہار کے موقع پر جس طرح ہاتھ پر مہندی لگانا روایت کا حصہ ہے، اسی طرح ہاتھ پھول پہننا بھی ضروری ہے۔

چندرہار

زیور کا یہ قدیم و روایتی انداز، اصل میں بنگال کی تہذیب و ثقافت کا اہم حصہ مانا جاتا ہے۔ اسے پہننے کا انداز بھی منفرد ہے۔



ہے تو یہ ایک بار، لیکن اسے نگلے میں نہیں بلکہ کندھے پر پہنا جاتا ہے۔ لہریہ دار سونے کی لڑیوں پر چھوٹی چھوٹی بوٹیاں لٹکائی جاتی ہیں اور ان کو ایک کندھے پر خوبی سے لٹکا دیا جاتا ہے۔

کرن پھول

کرن پھول کا مطلب ہے ”کان کے لیے پھول“ اور واقعی اس زیور کو کان میں جانے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے کوئی پھول گل اٹھا ہو۔



اس ڈیزائن کے لیے آپ اپنے پسند کے پھولوں کا انتخاب بھی کر سکتی ہیں۔ آج کا زمانہ چونکہ جدت کا ہے، اس لیے اب کرن پھول کے روایتی ڈیزائن میں بھی نئے انداز اپنائے جانے لگے ہیں۔ کرن پھول، جھمکے کی شکل میں بھی خوبی سے تیار کیے جاتے ہیں۔

پیتے کے چند اہم فوائد

- ☆ جسم کو طاقت دیتا ہے۔
- ☆ قوتِ مدافعت بڑھاتا ہے۔
- ☆ ہاضمہ بہتر کرتا ہے۔
- ☆ موتیا سے محفوظ رکھتا ہے۔
- ☆ دل کو تقویت دیتا ہے۔
- ☆ مختلف قسم کے سرطان سے حفاظت کرتا ہے۔



مشہور اطالوی سیاح کرسٹوفر کولمبس نے برصغیر کے مرغوب پھل پیتا کے بارے میں کہا تھا کہ یہ پھل فرشتوں کی مرغوب غذا ہے (حالانکہ فرشتے دنیاوی غذاؤں سے میرا ہیں) کرسٹوفر کولمبس دراصل اس پھل کی بے پناہ خصوصیات اور خوبیوں سے متاثر ہو کر اسے ”فروٹس آف دی انجیجز“ قرار دینے پر مجبور تھے۔

تاریخ کے آغاز سے ہی گرم ممالک کے لوگ پیتے سے واقف ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل اور بعد میں بھی جنگلی حینائیں اپنی جلد کو نرم بنانے، چھاتیوں اور داغ دھبوں سے محفوظ رکھنے کے لیے پیتے کا گودا استعمال کیا کرتی تھیں۔

اس پھل میں وٹامن سی کی بہتات سے صحت کو بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں اور اس کی خوبیاں تقاضا کرتی ہیں کہ آپ اسے اپنی خوراک میں شامل کریں۔

پیتا کے چند طبی خواص حسب ذیل ہیں:-

کولیسٹرول کم کرتا ہے

پیتا میں موجود ریٹینول وٹامن سی اور اینٹی



تقبض سے محفوظ رکھتے ہیں، جس سے آپ کا وزن نہیں

مدافعتی نظام توانا

وٹامن اے اور سی سے بھرپور ہونے کی وجہ سے انٹیکشن کے ساتھ بہتر طریقے سے لڑتا ہے اور آپ کے مدافعتی نظام کو تقویت دیتا ہے۔

بصارت تیز رکھتا ہے

پیتا میں موجود بیٹا کروٹین اور وٹامن اے کی وجہ سے بینائی تیز رہتی ہے، جن لوگوں کو کمزور نظر کا مسئلہ درپیش ہو انہیں پیتا کا استعمال کرنا چاہیے۔

جوزوں کے درد سے حفاظت

اس میں وٹامن سی کے ساتھ سوزش ختم کرنے والی خصوصیات ہوتی ہیں جن سے مختلف اقسام کی آرٹھرائٹس کی بیماریاں کنارے پر رہتی ہیں۔

ہاضمہ بہتر کرتا ہے

پیتے کی ایک اہم ترین غذائی خصوصیت ہے بے پائین کہتے ہیں۔ پیتے میں موجود یہ خامرہ ہمارے جسم میں تیار ہونے والے دیگر



اس سے تیزابیت اور سینے کی جلن کا خاتمہ ہوتا ہے۔

بڑھاپے کی آمد میں تاخیر

روزانہ ایک چھوٹے سائز کا پیتا کھایا جائے تو اس سے بڑھاپے کی آمد میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ پیتے میں وٹامن سی، وٹامن ای اور بیٹا کیروٹین جیسے اینٹی آکسیڈنٹس ہوتے ہیں جو آپ کی جلد کو فوری ریڈیٹنگ سے بچنے والے نقصانات سے بچاتے ہیں اور جلد چھریوں اور بڑھاپے کی دیگر علامات سے محفوظ رہتی ہے۔

کینسر سے بچاؤ

پیتے میں موجود اینٹی آکسیڈنٹس، فائٹیو نیوٹریٹس اور فلیوونوئڈز جیسے غذائیت اور صحت بخش اجزاء فری ریڈیکلز سے ہونے والے نقصانات سے خلیات کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ پیتا کھانے سے کولون اور پروکٹائٹس کے سرطان سے حفاظت ہوتی ہے۔

ڈیٹنگی کا علاج

ڈیٹنگی میں پلیٹ لیٹس کی تعداد بہت زیادہ کم ہو جاتی ہے۔ ان کی



تعداد کو بڑھانے کا ایک آسان علاج یہ ہے کہ مریض کو روزانہ پیتا کے پتوں کا عرق ایک گلاس کی مقدار پلایا جائے۔ اس کے لیے پیتے کے پتوں کو تھوڑے پانی کے ساتھ پیس لیا جائے۔

ایلم کی تکالیف دور

پیتا خواتین کو مخصوص ایام میں درد سے نجات دلاتا ہے۔ اس کے پتوں کو املی اور نمک کے ساتھ پانی میں ملا کر استعمال کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ یہ ماہانہ بے قاعدگی کو بھی باقاعدہ کرتا ہے۔

مساموں اور چہرے کے داغ دھبوں سے نجات کے لیے پیتے میں پائین اس وقت دودھ کی صورت میں



جاتا ہے۔ اس دودھ کو براہ راست زخم، دانوں، مساموں، چہرے کے داغ دھبوں پر لگایا جاسکتا ہے۔

خواتین اور آرتھرائٹس

پیدا ہوتی ہے۔

☆ آپ خون کی کمی میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہلکا بخار بھی ہو جاتا ہے۔

اگر ریو مائٹڈ آرٹھرائٹس کا علاج نہ کروایا جائے تو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو جوڑے بدلیت ہو سکتے ہیں، انگلیاں اور انگوٹھے ٹیڑھے میڑھے ہو سکتے ہیں۔

علاج

گھٹیا کالکون ایسا علاج نہیں ہے جس سے مکمل شفایابی ہوتا ہے۔ درد دور کرنے والی دواؤں سے اور طرز زندگی میں تبدیلی سے علامتیں بڑی حد تک دور کی جاسکتی ہیں۔

☆ باقاعدگی سے ورزش کی جائے تو جوڑے لچک وار رہ سکتے ہیں۔ اس کے مریضوں کے لیے تیراکی بھی ایک اچھی ورزش بھی جانی ہے کیونکہ اس سے جوڑوں میں دباؤ نہیں پڑتا، جس طرح دوڑنے اور چہل قدمی سے پڑتا ہے۔

☆ مستعد اور متحرک ہونا ضروری ہے یعنی غیر متحرک رہنے سے گریز کیا جائے لیکن آپ جب ضرورت محسوس کریں، اس وقت آرام ضرور کریں اور خود کو حد سے زیادہ تھکانے سے گریز کریں۔

☆ اگر وزن زیادہ ہے تو اسے کم کر کے اور صحت مند رکھنے اندر رکھتے ہوئے آپ اسٹیوآرٹھرائٹس کا خطرہ کم کر سکتی ہیں۔

☆ جن غذاؤں میں اینٹی آکسیڈنٹ اجزاء کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، ان کے استعمال سے سوزش کم کرنے میں مدد ملتی ہے جیسے کہ گاجر، ہرے پتوں والی سبزیاں اور پھل۔

☆ آپ کو رفتہ رفتہ یہ اندازہ ہو جائے گا کہ کن چیزوں سے ان کے درد میں کمی آ سکتی ہے۔ آپ ہینگ پیڈ یا آکس پیک سے سینکائی کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کس سے آرام ملتا ہے۔ بعض اوقات ٹھنڈی یا دھار کی مدد سے چلنے میں سہولت ہوتی ہے اور جوڑوں پر دباؤ کم پڑتا ہے۔

کون کتاب

<https://www.urdu tubes.com/>



سوال: ”آپ کیا سمجھتی ہیں کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟“

جواب: ”آف کورس جینے کے لیے ہی کھایا جاتا ہے۔ کھانے کے لیے تو توڑا ہی جیا جاتا ہے۔“

سوال: ”آپ کو کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان کھیزوں سے دور رکھتا ہے؟“

جواب: ”اگر کوئی رشتہ پی بنانی ہو تو بچن میں جاتی ہوں۔ پڑھائی کی وجہ سے بچن میں کم جاتی ہوں۔“

سوال: ”کون سی رائٹر کو پڑھتے وقت کھانا دھواں ہوا، اس سے متعلق کوئی یادگار واقعہ؟“

جواب: ”کھانا تو نہیں البتہ میں ایک دفعہ دودھ ابال رہی تھی، ساتھ میں شوق افتخار کا ناول ”میرے صے کا

کون کتاب

کچن سے متعلق اقراء ممتاز کے دلچسپ جوابات

زمین و آسمان“ ناول کی دوسری اور آخری قسط پڑھ رہی تھی۔ ناول میں اتنی کھوٹی کہ یاد ہی نہیں رہا کہ دودھ ایال رہی ہوں۔ ہوش تو اس وقت آیا جب امی نے سر پر چھڑ لگایا۔ اس واقعہ کے بعد کوئی بھی بچن کا کام ہو تو پوری توجہ سے کرتی ہوں۔“

سوال: ”عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ”ان“ کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کہاں تک اتفاق کرتی ہیں؟ اس سلسلے میں کوئی تجربہ ہو تو مختصر احوال لکھیں؟“

جواب: ”اب تک ”ان“ پیدا ہی نہیں ہوا۔ جب زندگی میں ”ان“ آئے گا تو دیکھا جائے گا۔“

سوال: ”لوگ آپ سے زیادہ تر کس ڈش کی فرمائش کرتے ہیں؟ آپ ہمیں اس ڈش کی ترکیب بتائیں؟“

جواب: ”میری بہنیں اور میرا کزن وقاص مشتاق اکثر مجھ سے کہتے ہیں کہ آبی پلیز انڈول کا مغز بتا دیں۔ اس ریسی کا نام ہم نے خود رکھا ہے۔ آپ اس ریسی کو مہمانوں کو چائے کے ساتھ بھی دے سکتے ہیں۔ ترکیب یہ ہے۔“

انڈے..... دو عدد
شنگ دودھ..... دو پیکٹ (اپوری ڈے)
چھینی..... حسب پسند
الاچی..... چند دانے
کھی..... ایک چمچہ

ترکیب:-
پہلے انڈے خوب اچھی طرح چھینٹ لیں، اس کے بعد کھی میں الاچی کے دانے ڈال کر گرم کریں پھر اسے چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ اب اس میں شنگ

کرن کا دسترخوان

فش کٹنا کٹ | کرکری کلیجی

اجزاء:-

مرغی کی کلیجی
آدھا کلو
چاول کا آٹا
آدھا کپ
کارن فلار
دو کھانے کے چمچے
کئی لال مرچ
دو چائے کے چمچے
زیرہ
ایک کھانے کا چمچ
کٹا ہوا لہسن
ایک کھانے کا چمچ
نمک
ایک چائے کا چمچ
پسی اجوائن
آدھا چائے کا چمچ
تیل (تنے کے لیے)
حسب ضرورت

ترکیب:-

پہلے آدھا کلو مرغی کی کلیجی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کریں۔
اب اس میں کئی لال مرچ، زیرہ، کٹا ہوا لہسن، نمک، اجوائن لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر اس میں کارن فلار اور آدھا کپ چاول کا آٹا چمک کر کس کریں اور گرم تیل میں



اشاء:-
مچھلی (بون لیس)
تین سو گرام
آدھا کپ
ایک چائے کا چمچ
ایک چمچ
آدھا چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
حسب ضرورت
حسب ضرورت

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

ایک گھی
پانچ عدد
ایک عدد
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
گارش کے لیے
گارش کے لیے

کرن کتاب

جانا آپ کے لیے سخت ناپسندیدگی کا باعث ہوتا ہے؟
جواب: ”جب میری نزن صائمہ مشتاق آئی ہے تو وہ مجھے کہتی ہے کہ عربی نامیاں بنا کر دو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس سے باتیں کروں، میری کوشش ہوتی ہے کہ وہ آئے تو میں بچن میں نہ جاؤں۔“

سوال: ”سسرال میں کیا پہلی چیز بنائی؟“
جواب: ”سسرال کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔“

سوال: ”آپ کے خاندان کی کون سی چیزیں ڈال کر ہیں؟“
جواب: ”ہمارے خاندان کی انجیل ڈش مکھڑی

ملوہ ہے۔ جو سب شوق سے کھاتے ہیں، جس کی ترکیب یہ ہے۔“

سوال: ”آپ کے خاندان کی کون سی چیزیں ڈال کر ہیں؟“
جواب: ”ہمارے خاندان کی انجیل ڈش مکھڑی

ملوہ ہے۔ جو سب شوق سے کھاتے ہیں، جس کی ترکیب یہ ہے۔“

سوال: ”آپ کے خاندان کی کون سی چیزیں ڈال کر ہیں؟“
جواب: ”ہمارے خاندان کی انجیل ڈش مکھڑی

ملوہ ہے۔ جو سب شوق سے کھاتے ہیں، جس کی ترکیب یہ ہے۔“

سوال: ”آپ کے خاندان کی کون سی چیزیں ڈال کر ہیں؟“
جواب: ”ہمارے خاندان کی انجیل ڈش مکھڑی

ملوہ ہے۔ جو سب شوق سے کھاتے ہیں، جس کی ترکیب یہ ہے۔“

سوال: ”آپ کے خاندان کی کون سی چیزیں ڈال کر ہیں؟“
جواب: ”ہمارے خاندان کی انجیل ڈش مکھڑی

ملوہ ہے۔ جو سب شوق سے کھاتے ہیں، جس کی ترکیب یہ ہے۔“

سوال: ”آپ کے خاندان کی کون سی چیزیں ڈال کر ہیں؟“
جواب: ”ہمارے خاندان کی انجیل ڈش مکھڑی

ملوہ ہے۔ جو سب شوق سے کھاتے ہیں، جس کی ترکیب یہ ہے۔“

سوال: ”آپ کے خاندان کی کون سی چیزیں ڈال کر ہیں؟“
جواب: ”ہمارے خاندان کی انجیل ڈش مکھڑی

ملوہ ہے۔ جو سب شوق سے کھاتے ہیں، جس کی ترکیب یہ ہے۔“

سوال: ”آپ کے خاندان کی کون سی چیزیں ڈال کر ہیں؟“
جواب: ”ہمارے خاندان کی انجیل ڈش مکھڑی

ملوہ ہے۔ جو سب شوق سے کھاتے ہیں، جس کی ترکیب یہ ہے۔“

کرن کتاب



دودھ، انڈے اور چینی ڈال کر چمچے سے اچھی طرح ہلائیں اور دھیان رہے کہ آجج ہلکی ہونی چاہیے۔ چمچ برابر ہلائی

رہیں۔ آہستہ آہستہ یہ خشک ہونے لگے گا جب اس کا رنگ براؤن ہو جائے اور کچی چھوڑنے لگے تو اتار لیں۔

نوٹ: انڈے اور چینی اکٹھی ہی پھینٹیں۔

سوال: ”پہلی ڈش کون سی بنائی اور گھر والوں کے کیا تبصرے تھے اس ڈش پر؟“

جواب: ”میں نے پہلی دفعہ موگ اور مسور کی دال پکائی تھی جو بہت اچھی بن گئی تھی اور سب نے بہت تعریف کی تھی۔“

سوال: ”کون سی ڈش دیکھ کر آپ کے والد، بھائی یا شوہر کو غصہ آ جاتا ہے اور پھر ان کا کیا رد عمل ہوتا ہے؟“

جواب: ”میرے والد صاحب خود بہت اچھے کک ہیں اور ابو کو کسی کے ہتھ کے بنے ہوئے کھانے بڑی

مشکل سے پسند آتے ہیں اور بھائی کو تو جو چیز مل جائے وہ کھا لیتے ہیں۔ اگر میں کوئی سبزی پکالوں تو ابو مجھے کہتے ہیں کہ یہ چیز ایسے بنائی ہے اور یہ ایسے۔“

سوال: ”گھر والوں کی پسند کی کوئی ایسی ڈش جو آپ کو پکانا ناگوار گزرتی ہے؟“

جواب: ”ہمارے گھر میں سب کو گوشت کے رول بہت پسند ہیں۔ جب مجھے بنانے کو کہتے ہیں تو میری جان

جاتی ہے خاص کر گرمیوں میں۔“

سوال: ”ایسے کون سے آپ کے رشتے دار یا شوہر کے دوست احباب ہیں جن کی تواضع کے لیے بچن میں

کے دوست احباب ہیں جن کی تواضع کے لیے بچن میں

کے دوست احباب ہیں جن کی تواضع کے لیے بچن میں

کے دوست احباب ہیں جن کی تواضع کے لیے بچن میں

کے دوست احباب ہیں جن کی تواضع کے لیے بچن میں

دودھ والے کلجے

گھبنولا

انجیر کا حلوا

فلافل



اجزاء:-

دودھ

انڈے

چینی

کارن فلوور

دنیلا اسپنس

ناریل (پیا ہوا)

کریم

تیل

ترکیب:-

دودھ میں انڈے، چینی، میدہ، کارن فلوور، دنیلا اسپنس

ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر چھوٹے فرانک پن

میں ایک چائے کا چمچ تیل ڈال کر چاروں طرف پھیلا لیں۔

دودھ کا کچر دو بڑے کھانے کے چمچ اچھی طرح ملا کر

فرانک پن میں پھیلا دیں۔ چمچے سے نہیں بلکہ فرانک پن

کو حرکت دینا ہے تاکہ دودھ کا کچر پھیل جائے۔ پھر

آج بکلی رکھیں جب آپ کو لگے کہ نیچے سے گولڈن ہو گیا

ہے تو فرانک پن میں چمچ کی مدد سے رول کر لیں، ہمارے

رول پلیٹ میں نکال کر ٹھنڈا ہونے دیں۔ اوپر کریم

ڈیکوریٹ کریں، فرنیچ میں ٹھنڈا کر کے کھا لیں۔

ترکیب:-

ایک چوتھائی کپ گرم دودھ میں خیر ڈال کر پانچ منٹ کے

لیے رکھیں۔ میدے میں نمک، تیل، بیکنگ پاؤڈر، دہی اور

خیر کا کچر شامل کر کے دودھ سے گوندھ لیں اور تھوڑی دیر

تک کپڑے سے ڈھانپ کر رکھ دیں۔ جب آٹا پھول

جائے تو پیڑے بنا کر کچے تیل لیں۔ اوپر سے تیل لگائیں۔

گرم اوون میں دوسو ڈگری سینٹی گریڈ پر رکھیں۔ تیار ہونے پر

نکال لیں۔

کرن کتاب

14



اجزاء:-

کابلے (پھلے ہوئے)

ہرا دھنیا (چوب کیا ہوا)

لہسن (چوب کیا ہوا)

ثابت سفید زیرہ

کٹی ہوئی لال مرچ

کھانے کا سوڈا

نمک

تیل

ترکیب:-

چنوں کو بلینڈر میں باریک پیس کر ایک پیالے میں نکال

لیں۔ اس میں باقی اجزاء ملا لیں۔ کڑا ہٹی میں تیل گرم

کریں، آمیزے کے چھوٹے پکڑے تیل میں سنہرا لیں

اور جاذب کاغذ پر نکالیں۔ مزے دار فلافل گرما کر گرم

کریں۔

دوسو گرام

تین چائے کے چمچ

آدھا کپ (چھل کر

پیس لیں)

1/3 کپ

چار چمچ

ایک چوتھائی چائے کا چمچ

خشک دودھ

URDU TUBE

www.urdutubes.com

URDU TUBE

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com

www.urdutubes.com



15

کرن کتاب

تلاش گمشدہ

ایک دھوبی کا گدھا کم ہو گیا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔ آخر کار ایک درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ اس درخت کے نیچے ایک لڑکا بلڑکی بیٹھتے تھے۔ لڑکا بلڑکی سے بڑی محبت سے بولا۔

”صنم! تیری آنکھوں میں مجھے سارا جہاں نظر آتا ہے۔“
دھوبی نے فوراً کہا۔ ”دیکھو یار! میرا گدھا کہاں ہے۔“

عمریہ بٹ..... کراچی

ضد

جیل میں ایک مجرم نے دوسرے مجرم سے پوچھا۔ پہلا۔ ”تمہیں کس جرم کی سزا ملی ہے؟“
دوسرا۔ ”میری حکومت سے ضد چل رہی ہے۔“
پہلا۔ ”کیا مطلب، تم ان کے لیڈر ہو؟“
دوسرا۔ ”نہیں، حکومت کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ میں بھی ان کی طرح کرنی نوٹ چھاپوں۔“
ماہا شیر حسین..... ڈنگہ

انکساری

ڈاکٹر۔ ”اس وقت یہ اندازہ لگانا کہ تمہیں کون سی بیماری ہے، ذرا مشکل ہے۔ میرے خیال سے یہ نشے کی وجہ سے ہے۔“

مریض۔ ”بہت اچھا جناب، اب میں اس وقت آؤں گا جب آپ نشے میں نہیں ہوں گے۔“
تبسم بشیر حسین..... ڈنگہ

دل کا دورہ

ایک ڈبی لال بیک سے دوسرے لال بیک نے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے، ہٹ لگی یا چپل پڑی ہے؟“
پہلا۔ ”نہیں یار! یہ لڑکیاں ہمیں دیکھ کر اتنا چلاتی ہیں کہ دل کا دورہ پڑ گیا۔“

ایشال فاطمہ..... کراچی

کڑی سزا

جج نے مجرم کو سزا سناتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں آزاد کیا جاتا ہے تاکہ تم نوکری کی تلاش میں سارا دن دھکے کھاؤ۔ بے روزگاری تمہارا کچھ مر نکالے، کھانے پینے کی اشیاء تمہیں ملاؤں۔ شہر اور مہنگی ملیں۔ جھوٹے پاسی لیڈران تم سے جھوٹے وعدے کریں۔ پولیس بار بار آوارہ گردی کے الزام میں تمہیں پکڑے اور پھر نہیں رات کو سکون کی نیند نہ سونے دیں۔“

گلشن چوہدری..... گجرات

گٹھلی کے دام

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ ”اچھا، تم نے گویا محبت کی اور دھوکا کھایا اور اس کے ساتھ مالی نقصان بھی اٹھایا۔“
نہیں۔ میں نے محبت تو کی لیکن نہ ہی دھوکا کھایا اور نہ ہی مالی نقصان اٹھایا۔ دوست نے جواب دیا۔ ”وہ کیسے؟“ اس شخص نے استفسار کیا۔ ”طوبی نے میری مٹکئی کی انگوٹھی اور میرے دے ہوئے تحائف واپس کیے تو اس میں غلطی سے دوسروں کے دیے ہوئے کچھ تحفے بھی شامل تھے۔“ دوست نے مسکرا کر جواب دیا۔

صابر تبسم..... کراچی

بھروسہ

”مجھے عورت ذات پر بالکل بھروسہ نہیں رہا۔“
شاداب نے اپنے دوست سے کہا۔
”آخر کیوں؟ ایسی کیا بات ہوگی؟“ دوست نے پوچھا۔

”میں نے فرضی نام سے اخبار میں شادی کے لیے اشتہار دیا اور آمدنی تین گنا زیادہ بتائی۔ پھر مجھے سب سے پہلے جو خط ملا وہ میری محبوبہ کا تھا۔“

فازہ بیٹی..... پتوکی

☆☆

ثناء ذوالفقار

نورے ولی (ترجمہ) سچ کو تمیز ہی نہیں ہے بات کرنے کی جھوٹ دیکھو کیسا میٹھا بولتا ہے۔

سحر نور۔ کراچی

تو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خوش تو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خوش تو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خوش تو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خوش

سیدہ لولیا سجاد۔ کراچی

کھنکھناتی

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ ”اچھا، تم نے گویا محبت کی اور دھوکا کھایا اور اس کے ساتھ مالی نقصان بھی اٹھایا۔“

نہیں۔ میں نے محبت تو کی لیکن نہ ہی دھوکا کھایا اور نہ ہی مالی نقصان اٹھایا۔ دوست نے جواب دیا۔ ”وہ کیسے؟“ اس شخص نے استفسار کیا۔ ”طوبی نے میری مٹکئی کی انگوٹھی اور میرے دے ہوئے تحائف واپس کیے تو اس میں غلطی سے دوسروں کے دیے ہوئے کچھ تحفے بھی شامل تھے۔“ دوست نے مسکرا کر جواب دیا۔

صابر تبسم..... کراچی

بھروسہ

”مجھے عورت ذات پر بالکل بھروسہ نہیں رہا۔“
شاداب نے اپنے دوست سے کہا۔
”آخر کیوں؟ ایسی کیا بات ہوگی؟“ دوست نے پوچھا۔

”میں نے فرضی نام سے اخبار میں شادی کے لیے اشتہار دیا اور آمدنی تین گنا زیادہ بتائی۔ پھر مجھے سب سے پہلے جو خط ملا وہ میری محبوبہ کا تھا۔“

فازہ بیٹی..... پتوکی

☆☆

کرن کتاب

نورے ولی (ترجمہ)

سچ کو تمیز ہی نہیں ہے بات کرنے کی جھوٹ دیکھو کیسا میٹھا بولتا ہے۔

سحر نور۔ کراچی

تو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خوش تو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خوش تو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خوش تو نے دیا فریب تو میں بھی رہا خوش

سیدہ لولیا سجاد۔ کراچی

کھنکھناتی

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ ”اچھا، تم نے گویا محبت کی اور دھوکا کھایا اور اس کے ساتھ مالی نقصان بھی اٹھایا۔“

نہیں۔ میں نے محبت تو کی لیکن نہ ہی دھوکا کھایا اور نہ ہی مالی نقصان اٹھایا۔ دوست نے جواب دیا۔ ”وہ کیسے؟“ اس شخص نے استفسار کیا۔ ”طوبی نے میری مٹکئی کی انگوٹھی اور میرے دے ہوئے تحائف واپس کیے تو اس میں غلطی سے دوسروں کے دیے ہوئے کچھ تحفے بھی شامل تھے۔“ دوست نے مسکرا کر جواب دیا۔

صابر تبسم..... کراچی

بھروسہ

”مجھے عورت ذات پر بالکل بھروسہ نہیں رہا۔“
شاداب نے اپنے دوست سے کہا۔
”آخر کیوں؟ ایسی کیا بات ہوگی؟“ دوست نے پوچھا۔

”میں نے فرضی نام سے اخبار میں شادی کے لیے اشتہار دیا اور آمدنی تین گنا زیادہ بتائی۔ پھر مجھے سب سے پہلے جو خط ملا وہ میری محبوبہ کا تھا۔“

فازہ بیٹی..... پتوکی

☆☆

کرن کتاب

کرن کتاب

کرن کتاب

کرن کتاب

کرن کتاب

کرن کتاب

کرن کتاب

کرن کتاب

کرن کتاب

کرن کتاب

کرن کتاب

HEMANI

Live Natural

Meri Choice

Meri Recommendation

HERBAL BEAUTY CREAM

&

WHITENING BEAUTY
DAY CREAM



Glowing | Anti Wrinkle | Anti Acne

Free from Mercury &
Other Harmful Ingredients



Emirates Quality Mark



www.hemaniherbal.pk

#HarPalHerbal

hemaniherbals

کچھ موتی چنے ہیں

حفظ ماتقدم

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انصاف مشہور ہے، ولے تو ہندوستان کے سب ہی راجاؤں کا انصاف مشہور ہے لیکن یہ واقعی سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ بڑا دینے میں مجرم اور غیر مجرم کی تخصیص نہ کرتے تھے۔ جو شخص کوئی جرم نہ کرے وہ بھی پکڑا جاتا تھا۔

فرماتے تھے۔ ”علاج پر ہیز سے بہتر ہے۔ اس وقت اس شخص کو سزا نہ ملتی تو آگے چل کر ضرور کوئی جرم کرتا۔“

بعد کے حکمرانوں نے ان ہی کی تقلید میں جرم نہ کرنے والے کو حفظ ماتقدم کے طور پر سزا دینے اور جیل بھجوانے کا اصول اختیار کیا۔

کبھی مجرم کو بھی سزا دیتے ہیں اگر وہ ہاتھ آجائے اور اس کا وکیل اچھا نہ ہو۔

(ابن انشاء..... اردو کی آخری کتاب)

صائمہ سحر..... فیصل آباد

بھتات

چیزیں ہو یا روپیہ پیسہ..... ان کا گنتی میں رہنا ہی انسان کو انسانیت کے دائرے میں رکھتا ہے۔ جب بات لا تعداد بے شمار اور بے حساب پر آجائے تو انسان خدا بن جیتا ہے۔

(فرزانہ کھل..... پھول منڈی)

فوزیہ شربٹ..... گجرات

امتحان

زندگی کا ہر امتحان انسان ذہانت اور محنت سے پاس نہیں کر سکتا، بعض امتحانوں کے لیے قسمت کے علاوہ اور کوئی چیز درکار نہیں ہوتی۔

(عکس..... عمیرہ احمد)

تبسم بیٹر حسین..... ڈنگہ

عاشق

اس دنیا کا پہلا جرم ایک عاشق نے اپنے بھائی کو

(میر احمد..... ام الیقین)

مراسلہ: تمینہ اکرم..... لیاری

کرت کتاب

TAPAL

Family Mixture

<https://www.urdutubes.com/>

مکمل خانہ مکمل گھر

URDU TUBE

A HOME OF ENTERTAINMENT

www.urdutubes.com

TAPAL
Family
Mixture

